کورٹ مارشل

طارق اسمٰعیل ساگر

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد دیہ روڈ محلہ عید گاہ روڈ توبہ

مکتبہ القریش چوک اردو بازار لاہور

[illegible]

"کورٹ مارشل" ایک فوجی اصطلاح ہے لیکن اس کا مطلب عام سویلین کو بھی آسانی سے سمجھ آجاتا ہے۔

بات ہی ایسی ہے ـــ !

ایک مسلمان پاکستانی کے ناطے میرا ایمان ہے اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے اعمال کا، اپنے افکار اور سب سے بڑھ کر اپنے کردار کا کورٹ مارشل کریں۔

وقت آگیا ہے کہ آج ہر پاکستانی اپنے ضمیر کی عدالت سجائے اور اپنا احتساب کرے۔

لیکن ـــ !

سویلین والا احتساب نہیں۔ فوجیوں والا کورٹ مارشل، کہ جہاں عہدے کو انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا جاتا۔

کہ جہاں تھانیدار اور جج بھی اتنا ہی پابند ڈسپلن ہوتا ہے جتنا ملزم ـــ !

آج ہر پاکستانی حالات کا شاکی ہے ـــ !

ممکن ہے کچھ خدا کے ایسے درویش صفت بندے بھی موجود رہے ہوں جو بے نیازی کی حد تک قناعت پسند ہو چکے ہوں اور وہ ع جس حال میں رکھے تو اس حال پہ راضی ہیں کے مصداق شکایت لب پر نہ لاتے ہوں لیکن زیادہ تعداد اُن بدقسمت پاکستانیوں کی ہے جنہیں گردش حالات نے اس بُری طرح رگیدا ہے کہ وہ بلبلا اُٹھے ہیں۔

اور ـــ

اب تو عالم یہ ہوگیا ہے کہ کوئی دم جاتا ہے جب مظلوموں کی آہوں سے آسمان کا کلیجہ شق ہو جائے اور خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کہ ہم پھر مکافاتِ عمل کے شکار ہو کر رہ جائیں ۔

یاد رکھیئے !

ہم دنیا کی پہلی یا آخری قوم نہیں ہیں۔ اس عالمِ فانی نے وہ کچھ دیکھا ہے کہ بیان کرنے کی ہمت نہیں۔ ایسے ایسے صاحبِ اقتدار کہ قدرت جن کے قدم چومنا سعادت جانتی تھی ۔

وہ جن کی مملکتوں میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا — !

وہ کہ جن کے استبداد کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی — !

وہ کہ جن کی جاہ و حشمت کے سامنے سورج کی روشنیاں مدھم پڑ جاتی تھیں ۔

وہ آج نہیں رہے — !

اُن کے نام و نشان مٹ گئے کہ اس دارِ فانی کو قرار نہیں۔ دوام نہیں: یہاں جو آیا ہے وہ جائے گا اور رہ جانے والا تو بس ایک خدا واحدہٗ لاشریک کا نام اور اقتدار ہے ۔

بحیثیت پاکستانی ہماری قومی عمر گو کہ ۴۲ سال بنتی ہے اور قوموں کی زندگی میں گو کہ یہ کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں ہے — لیکن یہ بہت کم مدت بھی نہیں ہے ۔

بگاڑ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اصلاح کو کوئی تیار نہیں۔ ہر شخص دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے پر تُلا ہے تو پھر کاروبارِ زندگی سنبھلے گا کیسے ؟ چلے گا کیسے ؟

ایک ہم ہیں کہ خدا کے غضب کو للکار رہے ہیں !

ایک وہ ہے کہ اپنی بے پایاں رحمت کے ساتھ ہمارے ملی گناہوں سے صرفِ نظر کر رہا ہے ۔

لیکن کب تک ؟

جان لیجیئے کہ مکافاتِ عمل اٹل ہے ۔ دنیا کی تاریخ کا جائزہ لیجیئے ۔ کون ہے جو اس سے بچ پایا ہو۔

آج ہمیں جائزہ لینا ہے کہ آخر ہم اس صورتِ حال کو پہنچے کیسے ؟ کہ اب مڑ کر دیکھیں تو سارے دروازے بند نظر آتے ہیں ۔

میں نے اس مختصر سی کتاب میں وقتاً فوقتاً لکھے اپنے کچھ مضامین کا انتخاب پیش کیا ہے اس میں تمام سوالوں کا جواب تو نہیں ہے لیکن انشاء اللہ ان مضامین کا مطالعہ آپ کو یہ ضرور بتا دے گا کہ ہمارا دشمن کون ہے ؟

کتنا زہریلا ہے ؟

کتنا مکار ہے ؟

اور ہر دم ہم پر ٹوٹ پڑنے کو کتنا تیار ہے ! میں ایک کمزور اور ناتواں خدا کا بندہ صرف دعا ہی کر سکتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنوں اور غیروں کے شر سے محفوظ رکھے ۔

طارق اسمٰعیل ساگر

لاہور

○

تیسری دنیا کی سیاست ہو یا معیشت، معاشرت ہو یا تجارت غرض کسی بھی شعبۂ زندگی میں سوپر پاورز کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً امریکہ کے جاسوسی ادارے سی آئی اے سے متعلق ایک عرصے سے بہت سی کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ آج تیسری دنیا میں کے جی بی اور سی آئی اے 'دہشت اور خوف کی علامت بن چکے ہیں'۔

سی آئی اے پر یوں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن جب کبھی سی آئی اے کے کسی سربراہ کی طرف سے کوئی کتاب دنیا میں اس جاسوسی ادارے کی کارکردگی سے متعلق چھپ کر آتی ہے تو ساری دنیا میں وہ بہت دلچسپی اور ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے اور ایک عرصے تک صحافتی دنیا میں اس کے مندرجات کی گونج باقی رہتی ہے۔

ایڈمرل سٹینفیلڈ ٹرنر کو امریکی صدر جمی کارٹر کے دورِ اقتدار میں سی آئی اے کا سربراہ رہنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ خیال رہے کہ وہ امریکہ ہی نہیں دنیا بھر کی سیاست میں اہم ترین دور شمار ہوتا ہے کیونکہ ایران کا انقلاب وقوع پذیر ہوا جس نے ایک مرتبہ تو یورپ کے سیاسی ایوانوں میں ہلچل مچا دی تھی اور ساری دنیا کی نظریں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

امریکی حکومت کے لیے بھی یہ مشکل دور تھا جس سے صدر جمی کارٹر اپنی شدید خواہش اور کوشش کے باوجود کامیابی سے عہدہ برآ نہیں ہو پائے۔ اس دور میں جو شخص سی آئی اے کا سربراہ رہا ہو۔ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کیسی اعصاب شکن جنگ لڑی ہو گی۔

جب ایڈمرل ٹرنر کی کتاب Secrecy and Democracy شائع ہوئی تو اس نے دنیائے صحافت میں تہلکہ ہی نہیں مچایا بلکہ اسے چونکا کر بھی رکھ دیا تھا کیونکہ اس میں کئی متنازعہ باتیں تھیں کئی تازہ انکشافات تھے اور سی آئی اے کی تشریح

سے بحث کی گئی تھی۔

"جاسوسی اور جمہوریت" نامی اس کتاب سے کچھ اقتباسات کا مطالعہ ہر باشعور پاکستانی کے لیے ضروری ہے تاکہ ہم بین الاقوامی تناظر میں حالات کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد سے بہرہ ور ہو سکیں۔ امریکہ سے ہمارے تعلقات آج سے نہیں ۵۰ سال سے ہیں اور آئندہ بھی ہمیں امریکہ سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ امریکی دنیا کی سیاست اور جمہوریت کو کسی عینک سے دیکھتے ہیں۔

اس حقیقت کو جاننے میں ایڈمرل ٹرنر کی یہ کتاب بہت معاون ثابت ہوتی ہے اس کتاب کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

گذشتہ ۱۸ ماہ سے میں "ناٹو" کی جنوبی کمان کا نیول کمانڈر تھا اور ان دنوں "نیپلز" اٹلی میں موجود تھا جب ۲ فروری ۱۹۷۷ء کو مجھے ایک فون کال موصول ہوئی ہم عموماً یورپ کے گرد پھیلے ہوئے سمندروں میں نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے میں نے دوران جنگ ائر فورس اور پیدل فوج کی کمانڈ بھی کی ہے اور یونان، ترکی اور اٹلی میں بطور کمانڈر خاصا وقت گزارا ہے اس کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ کے بحری بیڑوں کی کمان بھی مجھے بحر اوقیانوس میں میسر آ چکی ہے۔ اب بھی میں ایسی جاب کر رہا تھا لیکن مسلسل فوجی ملازمت کی وجہ سے خاصی بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

اپنی نئی ذمہ داریوں کے سبب میں ایک عرصے سے نہ صرف امریکن نیوی سے باہر تھا بلکہ میرا تعلق اب امریکی فوج سے بھی نہیں رہا تھا اس کے علاوہ میں مشترکہ افواج کے سپریم کمانڈر جنرل الیگزینڈر ہیگ کو بتا چکا تھا کہ اب میں صرف "ناٹو" کے لیے خدمات انجام دے سکتا ہوں۔ "ناٹو" ایک کثیر المقاصد سمجھوتہ ہے نیشنل فورسز کے لیے اپنے کمانڈر حملے کی منصوبہ بندی طے کرتے ہیں اور مشترکہ مشقیں انجام پاتی ہیں یہ چونکہ زمانہ امن تھا اس لیے ایک طرح سے مجھے اس سلسلے میں مکمل فراغت تھی۔

نیوی کی طرف سے مجھے ۱۹۷۵ء میں "نیپلز" بھیج دیا گیا تھا اس طرح میں عملاً نہ صرف امریکن نیوی سے بلکہ واشنگٹن سے بھی گذشتہ دو سال سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ اپنے دیگر رفقائے کار کی طرح میں نوکری کی طرف سے کبھی عدم تحفظ کا شکار نہیں رہا اس سلسلے میں مجھے ایڈمرل ایلمو زوموالٹ کی مکمل پشت پناہی حاصل رہی ہے جو بڑے حیران کن طریقے سے ۱۹۷۰ء میں امریکن نیوی کا چیف بن گیا تھا۔ زوموالٹ امریکن نیوی کی تاریخ کا سب سے کم عمر چیف تھا جو اپنی ذہانت اور دلیری میں ہمیشہ سے خاص شہرت کا حامل رہا ہے اس نے آتے ہی نیوی میں تبدیلیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔

زوموالٹ نے عہدہ سنبھالتے ہی امریکن نیوی میں انقلابی تبدیلیوں کا آغاز کر دیا۔ وہ ائر کرافٹ کیریئرز کی تعداد بڑھانے اور ان پر انحصار کا قائل تھا۔ اس نے ایسے اقدامات شروع کر دیئے کہ امریکن نیوی امریکن عوام کی مقبول ترین فوج بن گئی اور امریکی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس طرف راغب ہونے لگے۔ زوموالٹ ہی وہ نیوی کمانڈر تھا جس نے نیوی کے جوانوں کو روایات کے برعکس داڑھیاں رکھنے، لمبے بال رکھنے اور جدید طرز کی یونیفارم اپنانے کی کھلی اجازت دے دی تھی۔ ان اقدامات نے امریکن نیوی اور امریکی عوام کے درمیان فاصلہ تقریباً ختم کر دیا تھا۔ زوموالٹ کے یہ اقدام عموماً نیوی میں زیر بحث رہتے۔ جہاں کچھ پرانے نیوی افسران اقدامات سے نالاں تھے وہاں زیادہ تعداد میں نوجوان خوش تھے۔ زوموالٹ کے ان اقدامات کا شاید سب سے بڑا حمایتی میں ہی تھا یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

زوموالٹ نے چارج سنبھالتے ہی مجھے ریئر ایڈمرل بنا دیا اس عہدے کے لیے کسی بحری مہم کے تجربات عموماً ضروری ہوتے تھے اس کا بندوبست بھی اس نے کیا اور بحر اوقیانوس میں ائر کرافٹ کیریئرز کے ساتھ ایک بیڑہ میری کمان میں ایک "ٹاسک فورس" بنا کر روانہ کر دیا کچھ عرصہ بعد اس نے مجھے واپس "پینٹاگان" بلا لیا جہاں میری تعیناتی نیوی آفس آف سسٹم انیلسز میں بطور انچارج کر دی گئی یہ آفس چند سال پہلے ہی قائم ہوا تھا یہاں ایک سال رکھنے کے بعد اس نے مجھے وائس ایڈمرل بنا کر رہوڈ آئس لینڈ میں پریذیڈنٹ آف دی نیول وار کالج نیو پورٹ

مقرر کر دیا۔ اس کالج میں مجھے سینئر نیول افسران کو بطور استاد پڑھانے کا تجربہ حاصل ہوا میں نے یہاں آتے ہی کالج کے سابقہ ایجوکیشن سسٹم کو بالکل تبدیل کر دیا اب یہاں شاگرد دوں کو استاد کے پیش کردہ کسی بھی نظریئے پر اپنی رائے اور تنقید کا مکمل حق تھا اور کلاس روم مُوا مباحثے کا منظر پیش کرنے لگے؛

جب زومولٹس کی چار سالہ مدت ملازمت بطور نیول چیف پوری ہونے کو تھی تو مجھے نیوی کی بہترین نوکری میسر آئی اور مجھے دوسرے بحری بیڑے کے کمانڈر کی حیثیت سے بطور وائس ایڈمرل بحر اٹلانٹک میں جانے کا موقع ملا۔

زومولٹس کی ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی گھڑی کی واپسی کا سفر شروع ہو گیا اور امریکن نیوی کو روایتی بحریہ بنانے کا عمل دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ زومولٹس کے مقربین کو ایک ایک کر کے الگ کیا جانے لگا اور ۱۹۷۵ء میں مجھے ۴ ستاروں کے ساتھ مکمل ایڈمرل بنا کر "نیپلز" میں بھیج دیا گیا۔

۱۹۷۶ء کے موسم گرما کے بعد سے میں نے اپنا پیشہ بدلنے پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں کوئی بزنس کر لوں کیونکہ ۱۹۴۲ء سے میں نیوی میں تھا اور زندگی کا یہ بڑا حصہ ہوتا ہے۔ میری عمر اس وقت ۵۲ سال ہو چکی تھی میں سمجھتا تھا کہ اب مجھے نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیے اور بطور بزنس مین اگلی زندگی گزارنے کی فکر کرنی چاہیئے مین ان دنوں جب میں یہ سوچ رہا تھا میرے ایک قدیم ہم جماعت جمی کارٹر کو ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ تب میں نے جمی کارٹر کے متعلق سوچنا شروع کیا میری اطلاعات کی حد تک وہ صاف ذہن کا آدمی تھا اور "ڈیفنس" میں تازہ تبدیلیوں کا خواہاں۔ مجھے امید تھی کہ اگر وہ صدر بن گیا تو مجھا ایسے جدت پسند فوجی افسران کو پھر سے چیلنجوں اور تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا گو کہ یہ اچھا شگون ہوتا لیکن اتنا انتظار کون کرے اسی دوران الیکشن ہوئے اور کارٹر صدر بن گیا۔

اب جنوری ۱۹۷۷ء کو میرے نائب لفٹننٹ کمانڈر والٹر نے مجھے آفس میں اطلاع دی "ایڈمرل تمہارے لیے واشنگٹن سے ایک خاص کال آئی ہے"!

یہ کال سیکرٹری آف ڈیفنس کی طرف سے ایک سپیشل فون پر موصول ہوئی تھی مجھے حیرانگی تو اس بات کی تھی کہ یہ نیا سیکرٹری مجھے "ناٹو" کے جنوبی کمانڈر کی حیثیت سے مخاطب نہیں کر رہا تھا حالانکہ میرا اب امریکن نیوی سے براہ راست تعلق ختم ہو چکا تھا۔

"ایڈمرل ٹرنر" سیکرٹری آف ڈیفنس نے چھوٹتے ہی کہا صدر تم سے کل واشنگٹن میں ملاقات کا خواہاں ہے تمہارے لیے کل تک پہنچنا ممکن ہے۔ "میں کوشش کرتا ہوں!" میں نے کہا۔

اس مختصر پیغام سے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر مجھے کیوں طلب کیا جا رہا ہے ذاتی طور پر میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"ویج" کو میں نے سفر کے لئے بندوبست کی ہدایت کی اور اپنی بیوی پیٹریشیا سے کہا کہ میرا سفری بیگ تیار کر دے۔ میں نے تب یہی سوچا کہ شاید جمی کارٹر مجھ سے دفاعی معاملات پر بات چیت کا خواہاں ہے اور دو سال قبل میرے اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہے میری اور کارٹر کی یہ ملاقات دو سال قبل اٹلانٹا میں ہوئی تھی جب وہ وہاں کا گورنر تھا یہاں دوران گفتگو کچھ دفاعی مسائل زیر بحث آئے تھے یا پھر شاید وہ مجھے کسی نئی آسامی پر تعینات کرنے کا خواہشمند ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"میرے لیے دعا کرو"...... میں نے اپنی بیوی کے سوالات سے بچنے کے لئے کہا روانگی سے پہلے میں نے اپنے چار نائبین کو جو امریکی اعلیٰ افسران تھے اور ڈیفنس کے معاملات پر خاص دسترس رکھتے تھے مشاورت کے لیے طلب کیا کیونکہ میں صدر کی طرف سے ڈیفنس کے حوالے سے ہونے والے سوالات کے لیے خود کو ذہنی طور پر مکمل تیار رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ان کے سامنے چند سوالات رکھے جو کچھ اس طرح تھے۔

"تمہارے خیال کے مطابق ڈیفنس میں کیا نقائص موجود ہیں جو ہماری گفتگو میں زیر بحث آ سکتے ہیں"؛

"کیا ہمیں بی ون بمبار خریدنے چاہیئں اور کیا مزید ایٹمی بحری طیارہ بردار جہاز حاصل کرنے چاہیئں"؛

کیا موجودہ حکومت ہماری دفاعی استعداد کار سے مطمئن ہے"؟

کیا ہم مزید کسی اضافے کے موجودہ حکومت کے ساتھ چل سکتے ہیں؟

میرے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مجھے تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے میرے سینئر افسران نے بتایا کہ "ٹیڈ سورنسن" جسے صدر نے سی آئی اے کے لئے منتخب کیا تھا نے اس عہدے سے معذرت کر دی ہے اور اپنا نام واپس لے لیا ہے۔ سی آئی اے کے نئے سربراہ کا تقرر ہی اس وقت صدر کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے جس پر وہ قدرے دباؤ کا شکار ہے اب زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ کیا صدر نے میرا انتخاب اسی عہدے کے لئے تو نہیں کیا؟ ہم نے اس سوال پر کچھ دیر بحث کی لیکن اس وقت سب کا جواب یہی تھا کہ ایسا شاید ممکن نہیں۔

"شین بعد ر تمہارا اہم جماعت نہے یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے تمہارے لیے ایسا سوچا ہو" ایک دوست نے کہا۔

میں نے اس امکان کو رد کر دیا اور ہم دوبارہ آرمی مسائل پر بات کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد میرا نائب پیج اندر داخل ہوا اور کہا کہ ہمارے پاس پیرس سے "کنکارڈ" میں سوار ہونے کا چانس موجود ہے کنکارڈ امریکہ کے لیے پیرس سے ۸ بجے رات اڑتا تھا۔ ۶ بجے میں اور پیج نیوی کے ایک جیٹ میں سوار پیرس کی طرف محو پرواز تھے جب ہم "کنکارڈ" کے کاؤنٹر پر پہنچے تو وہاں موجود لڑکی نے کہا "آپ یقیناً ایڈمرل ٹرنر ہیں!"

ہم دونوں کنکارڈ میں داخل ہونے والے آخری مسافر تھے۔

۳ گھنٹے اور ۳۵ منٹ کی پرواز کے بعد کنکارڈ نے واشنگٹن کے "ڈلاس انٹرنیشنل ائرپورٹ" پر لینڈ کیا۔ میں ہیرالڈ براؤن کے فون کرنے کے ٹھیک ۹ گھنٹے بعد امریکہ پہنچ گیا تھا پیج نے واقعی معجزہ کر دکھایا تھا۔

اگلے روز ۱۱ بجے کے بعد میں سیکرٹری ڈیفنس براؤن کے کمرے میں موجود تھا ہمارا باہمی تعارف مشترکہ دوستوں نے کروایا۔ درحقیقت شیڈول کے مطابق مجھے صدر سے ملاقات سے پہلے ۱۰ منٹ تک سیکرٹری ڈیفنس سے ملاقات کرنی تھی مجھے امید تھی کہ

صدر سے ممکنہ گفتگو کے متعلق یہاں علم ہو جائے گا سیکرٹری ڈیفنس نے بمشکل تین منٹ میں یہ ملاقات ختم کر دی اور بتایا کہ مجھے کوئی نئی فوجی مہم نہیں سونپی جا رہی کیونکہ اس کے خیال میں ایک ایڈمرل کو اس سے زیادہ اہم مہم اور کوئی نہیں دی جا سکتی تھی جو میرے ذمے پہلے سے موجود تھی۔

"صدر تمہیں خصوصی ذمہ داریاں سونپنا چاہتے ہیں اور اس کے متعلق وہ خود ہی تمہیں اس ملاقات میں آگاہ بھی کر دیں گے"...... اس نے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اگلے ہی لمحے ہم دونوں وائٹ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے اب میں سوچنے پر مجبور تھا کہ مجھے اہم ترین سویلین پوسٹ سونپی جا رہی ہے۔ مجھے سی آئی اے سے متعلق کوئی ذمہ داری سونپی جائے گی میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جب صدر اس مسئلے پر بات کرے گا تو میرا ردعمل کیا ہونا چاہیئے فی الوقت تو مجھے یہ بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ ہم اب پنسلوینیا ایونیو کی طرف مڑ رہے تھے پھر ویسٹ گیٹ سے وائٹ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ ایک حفاظتی گارڈ نے پہلے سے موجود لسٹ سے میرا نام پڑھا اور مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

ہم ویسٹ لابی کی انتظار گاہ میں پہنچے تھے گیارہ بج کر ۲۵ منٹ ہو رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے استقبالیہ والوں نے صدر کو میری آمد سے مطلع ہی نہیں کیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا جب ایک مستعد باوردی ملازم نے میری رہنمائی اوول آفس تک کی۔ میں نے یورپ میں بادشاہوں، ملکہ اور بڑے بڑے حکمرانوں کے دفاتر دیکھے تھے اور میں یہی امید کر رہا تھا کہ یہاں بھی ایک عظیم الشان قسم کے دفتر سے واسطہ پڑے گا لیکن توقعات سے بالکل برعکس صدر کے آفس کا باہری حصہ چونکا دینے کی حد تک سادگی کا حامل تھا یہاں ایک کمرے میں آتش دان کے سامنے دو آرام دہ کرسیاں دھری تھیں جن میں سے ایک پر مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی گئی تھی ایک کونے میں دو کاؤچ دھرے تھے اور دوسرے میں ایک بینچ۔

میں آتش دان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور آنے والے وقت کے متعلق سوچنے

لگا یہی وہ وقت تھا جس کے متعلق میں نے اپنی بیوی پیٹریشیا کو دعا مانگنے کی ہدایت کی تھی۔ اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کا احساس مجھے نہ ہو سکا صدر کارٹر بشکل تین چار منٹ بعد ہی اپنی روایتی مسکراہٹ اور جاذب نظر شخصیت سمیت میرے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کر رہا تھا اس کے ساتھ ایک فوٹوگرافر اندر داخل ہوا اور اس نے میری اور صدر کی تصویر اتار لی۔

"پرائیویٹ آفس میں چلتے ہیں۔ میں تمہاری ملاقات نائب صدر سے کروانا چاہتا ہوں"۔۔۔۔۔ صدر نے کمرے سے کھڑے کہا۔

پریذیڈنٹ کی معیت میں ایک تنگ سی راہداری سے گزر کر میں اس کے چھوٹے پرائیویٹ آفس میں پہنچ گیا۔ ایک دروازے اور کھڑکی والے اس دفتر میں آتش دان کے سامنے دھرے کاؤنچ پر نائب صدر "والٹر مونڈیل" میرا منتظر تھا۔ اس نے میرے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ہم دونوں اس کاؤنچ پر بیٹھ گئے۔

۱۹۷۱ء میں ایک مرتبہ ہماری "کلاس دی یونین" کے موقع پر جس طرح کارٹر نے مجھے سراہا تھا اسی طرح آج بھی صدق دل سے اس نے میری قومی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "مٹن! میں تمہیں سی آئی اے کا ڈائریکٹر بنانا چاہتا ہوں:

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔۔۔۔ "میرے ذہن میں اس سلسلے میں دو نام تھے جن میں سے ایک تمہارا ہے (دوسرا نام آرمی چیف آف سٹاف جنرل برنارڈ ڈبلیو روجرز تھا) مجھے دراصل ایسا آدمی چاہئے جو صرف سی آئی اے کے معاملات ہی کو نہ چلائے بلکہ وہ ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور حکومت کے درمیان ایک مربوط رابطہ بھی پیدا کرے"

میں نے صدر کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور گردن جھکا لی:

کیا سوچ رہے ہو مٹن!

میں اگر اسی لمحے فوراً ہاں کر دیتا تو صدر امریکہ کو تب بھی اعتراض نہ ہوتا لیکن سوچ سمجھ کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا میں نے کہا۔

"صدر محترم آپ جانتے ہیں کہ ڈیڑھ سال میں مجھے نیوی کا سیکنڈ ایڈمرل بنا دیا جائے گا اور میری بھی یہی خواہش ہے کہ ڈیڑھ سال بعد اپنی مدت ملازمت کے خاتمے پر بزنس کروں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے آپ فوج میں جن اصلاحات کے متمنی ہیں وہ میں بطور نیول چیف زیادہ اچھی طرح کر پاؤں گا"۔

"مٹن! قانونی طور پر تمہاری ڈیڑھ سالہ فوجی ملازمت محفوظ رہے گی اور یہ چانس تمہیں بعد میں بھی مل سکتا ہے"۔

اس کے بعد نائب صدر نے مجھے سمجھانا شروع کیا بالآخر مجھے صدر محترم کی بات پر صاد کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی صدر نے میرا تعارف ہملٹن جارڈن سے کروایا جو وائٹ ہاؤس کا منتظم اعلیٰ تھا۔۔ ایف بی آئی کو حکم دیا گیا کہ دو دن کے اندر اندر میرے متعلق تحقیقات مکمل کرے۔ میں نے اپنی بیوی کو ٹیلیفون میں فون کیا تو براہ راست بات کرنے کی بجائے اسے کہا۔

"پیٹریشیا ہم بش والی فیلڈ میں داخل ہو رہے ہیں"۔

بش، کے کوڈ سے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ کیونکہ مجھ سے پہلے سی آئی اے ڈائریکٹر جارج بش تھے اب اپنے بیٹے جیوفری کو مطلع کرنا تھا طرفہ تماشہ کہ وہ نیوی میں لیفٹیننٹ تھا اس کی تعیناتی میرے بیڑے پر کر دی گئی وہاں وہ اکثر مجھ سے انٹیلی جنس میں جانے کی خواہش ظاہر کیا کرتا تھا پھر میں نے اسے اجازت دے دی اب میں پھر اس کا باس بننے والا تھا۔

میں نے تو حسب ہدایت یہ خبر ابھی دبا رکھی لیکن "ٹائم" نے میری تصویر متوقع سی آئی اے کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں شائع کر دی اور مجھے علم ہوا کہ یہ خبر بھی وائٹ ہاؤس نے ہی باہر نکالی تھی۔ اس خبر کو سارے میڈیا نے پکڑا اور بعد میں میرے ہوٹل کی لابی صحافیوں اور ٹی وی والوں سے بھر گئی۔ زندگی نے یکدم نئی کروٹ لے لی تھی۔

اتوار کی دوپہر مجھے نائب صدر کا فون آیا اس کا خیال تھا کہ یہ معاملہ چونکہ پریس کے علم میں آ چکا ہے تو مجھے کیپٹل ہل (سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر) کا دورہ کر لینا چاہئے اور ان خاص سینیٹرز سے معاملات بھی ضروری ہے جن کی ضرورت مجھے اپنے عہدے کی توثیق

کے لئے بعد میں پیش آئی تھی پھر اس نے ہنری نوچی کو فون کیا۔ نوچی جارج بش کے بعد سی آئی اے کا گذشتہ ڈھائی ہفتے سے قائم مقام ڈائریکٹر تھا۔ نائب صدر مونڈیل نے اسے ہدایت کی کہ مجھے سی آئی اے سے متعلق اسرار و رموز سے آگاہ کرے اور ان سینیٹرز تک پہنچنے کا طریقہ بھی بتا دے جن کی مدد مجھے درکار تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں ورجینیا میں دریائے پوٹامک پر سے گزرتا کار ڈرائیو کرتا ہوا سی آئی اے کے محافظوں سے گھرے ہیڈکوارٹر کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ ایک گارڈ نے زیر زمین کار پارکنگ تک میری رہنمائی کی اور دوسرے کی مدد سے میں اوپری منزل پر ڈائریکٹر آفس تک پہنچ گیا جہاں نوچی اور میرا نیوی کا قدیم دوست ڈینیل جسے مرفی میرے منتظر تھے۔ ڈینیل اور میرے درمیان معاصرانہ چشمک لگی رہتی تھی ہم دونوں اکٹھے ریئر ایڈمرل بنے لیکن میں زموالٹس کے نزدیکی حلقے میں شامل تھا اس لیے اس سے ایک سال پہلے ہی وائس ایڈمرل بن گیا۔ آجکل ڈینیل سیکرٹری آف سٹیٹ کا اسسٹنٹ تھا اور سیکرٹری کی پشت پناہی سے اب ڈینیل بھی فورسٹار آفیسر بن کر میرے برابر کا رینک حاصل کر چکا تھا اب اگر میں سی آئی اے کا ڈائریکٹر بن جاتا تو وہ میرا ڈپٹی ڈائریکٹر ہو کر بھی میرا ماتحت ہوتا۔ عجیب صورت بن آئی تھی گو کہ یہ ڈینیل کے لیے معیوب سی بات تھی کہ میرے برابر کا عہدہ رکھنے کے باوجود وہ میرے ماتحت کام کرے لیکن اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے فون کر کے کہا کہ وہ میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے گا۔ میں اس کی فراخ دلی کی قدر کرتا تھا اس کی قابلیت بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی لیکن ایک خیال بار بار میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ آخر ایک ہی جیسا عہدہ رکھنے پر ڈینیل میرا ماتحت بن کر کیا اپنے کام سے انصاف کر پائے گا اور دوسری بات کہ امریکہ کی سب سے بڑی انٹیلی جنس کے دو اعلیٰ ترین آفیسرز کا تعلق نیوی ہی سے ہو، کہیں سرکاری حلقوں میں نئی بحث کا موضوع نہ بن جائے۔

ہینک نوچی سے میرا تعارف پہلے نہیں تھا اسے جارج بش نے ۱۹۷۶ء کے موسم گرما میں سی آئی اے کا ڈی ڈی سی آئی مقرر کیا تھا۔ نوچی مجھے ملحقہ دفتر میں لے گیا یہاں میں ایک مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا جب اس وقت کے ڈائریکٹر ولیم کولبی نے ایک کام کے

سلسلے میں مجھے طلب کیا تھا۔ اس وقت تو میں نے خیال نہیں کیا تھا لیکن اب غور سے کمرے کا جائزہ لیا تین دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں چوتھی دیوار جو اینٹوں سے بنائی گئی تھی اس میں ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ ہینک نوچی سے گفتگو خاصی کارآمد اور دلچسپ تھی ایک نئے جہاز کی کمان میرے ماتحت میں آنے والی تھی اور اس ضمن میں پیش آمدہ حالات کے متعلق وہ مجھے بریفنگ کر رہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ نائب صدر کی خواہش ہے کہ وہ میرے ساتھ ان سینیٹرز سے میٹنگ کرے جو اس سلسلے میں ہمارے مددگار ہوں گے تو وہ خاموش ہو گیا تھوڑی دیر بعد بولا: "میں نائب صدر کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں لیکن یہ اس کا حتمی فیصلہ ہے......" میں نے اصرار کیا۔

وہ خاموش ہو گیا...... میں یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہاں کوئی شخص امریکہ کے نائب صدر کی بات سے اختلاف بھی کر سکتا ہے تب میں نے سوچا کہ مستقبل میں بھی نوچی کی بطور ماتحت میرے ساتھ وفاداریاں مشکوک ہو سکتی ہیں لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ میری باقاعدہ تقرری کے بعد اس کے خیالات تبدیل ہو جائیں۔

اگلے چند روز میں نے سی آئی اے سے متعلق کتابوں اور مختلف پیپرز کے مطالعے میں بسر کیے ان کے ذریعے مجھ پر سی آئی اے کی قانونی حیثیت متنازعہ معاملات کی صورت میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت پیدا ہو گئی اب مجھے ان حاصل کردہ معلومات کی بنا پر سینیٹرز کی طرف سے جرح کا سامنا کرنا تھا اس کے علاوہ نوچی نے سی آئی اے کے اعلیٰ افسران کے ساتھ میرے "ڈنرز" کی باقاعدہ سیریل کا آغاز بھی کر دیا یہ سب لوگ میرے لیے کارآمد ثابت ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں سمجھنے میں مجھے مشکلات پیش آ رہی تھیں میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بہت گہرے لوگ تھے بظاہر تو میرے ساتھ تعاون کر رہے تھے لیکن اس وقت تک کوئی شخص میرے ساتھ کھلنے کے لیے تیار نہیں جب تک میری مستقل تقرری نہ ہو جاتی۔ میں اب اس بھاگ دوڑ سے تنگ آ گیا تھا روزانہ بھاگم بھاگ کیپٹل ہل جاؤں وہاں سے ہوٹل پھر ڈنر اور بے مقصد گفتگو کا لمبا سلسلہ میں نے باقی تمام دعوتیں منسوخ کر دیں۔

۱۹۷۴ء میں ڈیفنس سیکرٹری بننے سے پہلے جم کولبی پانچ ماہ کیلئے سی آئی اے کا ڈائریکٹر رہ چکا تھا اس کے ساتھ چند مختصر میٹنگز بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں اسی طرح نیویارک سے جیکب جو ممتاز مقام کا حامل تھا میرا مددگار ثابت ہوا۔

۲۲ فروری کو دن کے ۱۰ بجکر ۴ منٹ پر رسل سینیٹرز آفس بلڈنگ میں متعلقہ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی یہاں میری بطور ڈائریکٹر سی آئی اے تعیناتی سے متعلق سماعت جاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری نامزدگی پر کسی طرف سے مخالفت نہیں ہوئی۔ اس قدرے غیر دوستانہ ماحول میں میرے لیے رہوڈ آئس لینڈ کے سینیٹر جان ایچ چیفس کی موجودگی باعث اطمینان تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں نیوی میں کیپٹن تھا تو میری جان سے ملاقات ہوئی جو بعد میں گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ جان بڑا یار باش آدمی تھا بعد میں سینیٹر بن گیا اور اب اس کمیٹی میں جان کا نام بھی شامل تھا جس نے میری ماضی کی کارکردگی کا جائزہ لے کر میرے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا۔

مجھے سب سے پہلے اپنے پروگرام کی تفصیلات سے آگاہ کرنا اور اپنے اقدامات کی وضاحت پیش کرنا تھی۔ میرے ذہن میں جو خاکہ موجود تھا وہ میں نے بیان کر دیا جس کے بعد سینیٹرز نے مجھ پر سوالات کرنے تھے۔ اس سلسلے میں چیئرمین کمیٹی کی طرف سے ہر سینیٹرز کو دس منٹ دیئے گئے تھے عمال حکومت کے سامنے قانون کے دائرے میں خود کو محدود رکھ کر میرے لیے اس انداز کی بات چیت کا یہ پہلا موقع تھا اس وقت آکسفورڈ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجوایشن کی تعلیم میرے بہت کام آئی۔ تین بجے سہ پہر تک یہ سلسلہ جاری رہا زیادہ تر سوالات سی آئی اے اور مقننہ کے تعلقات کے حوالے سے کئے جا رہے تھے میں نے تمام سوالات کے جوابات اپنی صوابدید کے مطابق دیئے۔ تین بجے ان لوگوں نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا۔

۲۶ فروری کو جب میں "نالو" کی الوداعی دعوت وصول کر رہا تھا سینیٹ کمیٹی نے اس روز میری تعیناتی کی تصدیق کر دی۔ یہ سب کچھ صرف پانچ روز میں انجام پا گیا۔ میں نالو کی کمانڈ سے الگ ہو کر ایک بالکل علیحدہ کیریئر کا آغاز کر رہا تھا اب میری منزل نیپلز کے بجائے واشنگٹن تھی۔

سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر سفید رنگ کی ایک سات منزلہ جدید طرز تعمیر کی حامل عمارت میں قائم ہے جس کے چاروں اطراف بڑے بڑے لان اور اندر کمروں میں لکڑی سے بنے کیبن ہیں۔ اس عمارت میں کسی بے ضابطگی یا بے احتیاطی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جیسے ہی آپ مین گیٹ سے اندر داخل ہوں دائیں ہاتھ پر ایک گنبد نما آڈیٹوریم نظر آئے گا جسے ہم "بلی" کہتے ہیں یہ بلڈنگ بالکل الگ تھلگ کھڑی ہے گو کہ اس کا تعلق ہیڈ کوارٹر سے ہے۔ لیکن دونوں کو ایک زیر زمین سڑک آپس میں ملاتی ہے۔ "بلی" عموماً مہمانوں یا تقریب کے لیے استعمال ہوتی ہے یا پھر یہ بلڈنگ ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی شناخت سی آئی اے کے ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں کروانا پسند کرتے۔ اسی بلڈنگ میں ۹۔ مارچ ۱۹۷۷ء کو ایسوسی ایٹ جسٹس آف سپریم کورٹ بائرن وائٹ نے مجھ سے حلف وفاداری لیا میں نے تین حیثیتوں سے حلف اٹھایا تھا (۱) انٹیلی جنس ایڈوائزر ٹو پریذیڈنٹ۔ (۲) امریکہ کی تمام انٹیلی جنس ایجنسیز میں "رابطہ" کی حیثیت سے (۳) اور سی آئی اے کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے۔

صدر کارٹر میری درخواست پر اسی تقریب میں خاص طور سے تشریف لائے بعد میں انہوں نے میرے آفس میں تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہان سے خطاب کیا اور ہمیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا جب اس میٹنگ میں آرمی انٹیلی جنس کے چیف نے مجھے "ہمارا مسٹر ہیڈ آف انٹیلی جنس کمیونٹی" کہا تو صدر کارٹر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہمارا مسٹر ہیڈ نہیں "ہیڈ" کہو۔ تھوڑی دیر بعد جب باقی تمام لوگ یہاں سے "بلی" میں واپس جا چکے تھے صدر اور میں اپنے کمرے میں موجود تھے تو صدر کارٹر نے مجھے کہا۔

"مسٹر ٹرنر انٹیلی جنس کمیونٹی میں انقلابی اصلاحات کا آغاز کب کرو گے کسی بات سے گھبرانا نہیں۔"

بطور ڈی سی آئی گو کہ میں صدارتی کیبنٹ میں شامل نہیں تھا لیکن بطور ایڈوائزر میری حیثیت بہت اہم تھی خصوصاً انٹیلی جنس سے متعلق معاملات پر میں اسے ہر طرح کی ایڈوائز دینے کا پابند تھا گو کہ صدر کارٹر سے میرے زیادہ روابط کبھی نہیں رہے تھے لیکن مجھے صدر کا مکمل اعتماد حاصل ہو چکا تھا اس تقریب میں امریکہ کی تقریباً سب ہی معتبر ہستیاں موجود

تھیں جن میں زیادہ تر لوگ سیکورٹی سے متعلق تھے۔ سی آئی اے میں ڈی سی آئی کی تہری ذمہ داریاں سنبھالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں یہ ایک جان لیوا اور تھکا دینے والا کام ہے آپ کو نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے صدر کو رخصت کرنے کے لیے میں خود ان کی لیموزین کار تک ان کے ساتھ گیا پھر میں نے اپنے اہل خانہ کو بھی الوداع کہا اب میں ساتویں منزل پر واقع اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

میری ترجیحات میں سے اولین سی آئی اے پر ہونے والی بے تحاشہ تنقید سے نمٹنا تھا۔ میں سی آئی اے پر اپنے لیے مسائل پیدا کرنے کے بجائے مسائل کو ختم کرنا چاہتا تھا اس کے لیے کچھ انقلابی اصلاحات ضروری تھیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ۱۹۷۴ء کے آغاز ہی سے امریکن پریس اور غیر ملکی پریس میں سی آئی اے کے متعلق عجیب عجیب اور پریشان کن انکشافات ہونے شروع ہو گئے تھے مزے کی بات تو یہ ہے کہ باقی تمام ایجنسیوں کے کارنامے بھی سی آئی اے کے کھاتے میں ڈال دیئے جاتے تھے اور اکیلی سی آئی اے ہی تنقید کا نشانہ بنی رہتی تھی۔

صورتحال یہ تھی کہ ۱۲۔ لاکھ مشتبہ امریکن شہریوں کی تفصیلات سی آئی اے کے کمپیوٹر میں محفوظ تھیں جو کسی بھی وقت ملکی تحفظ کے لیے خطرات کا باعث بن سکتے تھے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان لاکھوں کی تعداد میں ہونے والی خط و کتابت کا ریکارڈ اس سے سوا تھا۔ مشتبہ شہریوں کے ٹیلی فون ٹیپ کیے جاتے تھے ان کی خواب گاہوں میں خفیہ مائیکرو فون نصب کیے جاتے تھے اس کے علاوہ جدید سائنٹفک آلات کی مدد سے ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیان ایسی ایک لاکھ سے زائد فائلیں جمع ہو چکی تھیں علاوہ ازیں بے شمار کہانیاں اندر فائلوں ہی میں دفن ہو کر رہ جاتی تھیں خصوصاً ان لیڈروں سے متعلق جو امریکہ کے دورے پر آتے تھے۔

جیمز شلنگر کئی سال تک سی آئی اے سے وابستہ رہا جب وہ ۱۹۷۳ء میں

ڈی سی آئی بنا تو اس نے سی آئی اے کے تمام ملازمین سے کہا کہ اگر ان کے علم میں اندرونِ خانہ ہونے والی کسی بھی ہیرا پھیری کی اطلاع ہو تو وہ اسے ضرور بتائیں۔ ملازمین کی فراہم کردہ اطلاعات پر اس نے ۹۸۲ صفحات پر مشتمل فائل تیار کی جس کا نام "دی فیملی جیولز" رکھا گیا اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب بل کولبی سی آئی اے کا ڈائریکٹر بنا تو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ "فیملی جیولز" کے ساتھ کیا سلوک کرے۔

کولبی نے اس سلسلے میں کچھ پیش رفت کی ہی تھی تب ہنگامہ مچا جب نیویارک ٹائمز کے سائی مور ہرش نے سی آئی اے کے متعلق زبردست کہانی شائع کی اور امریکی عوام کو سی آئی اے کے اندر کی کہانی کے ذریعے پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ ایجنسی بیرونی معاملات کے علاوہ اندرونی معاملات میں بھی مکمل مداخلت کرتی ہے اور سی آئی اے کے ذریعے کئی امریکیوں کی ذاتی سرگرمیوں پر نظر رکھی جا رہی ہے اسی کہانی کا چھپنا تھا کہ قیامت آ گئی پہلے تو سرکاری ایوانوں میں اس کی گونج زور شور سے سنائی دینے لگی پھر عوام کی طرف سے اعلیٰ سطح پر معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔

۱۹۷۵ء میں صدر فورڈ نے نائب صدر نیلسن راک فیلڈ کی سربراہی میں قائم کردہ ایک کمیٹی کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیقات کرے کہ کیا سی آئی اے امریکی شہریوں کی جاسوسی بھی کرواتی ہے؟؟ اس کے ساتھ ہی سینیٹر فرینک چرچ کی سربراہی میں سینٹ سے ایک کمیٹی منتخب ہوئی اور ایک کمیٹی ہاؤس سے لی گئی۔ تینوں نے ۱۵ ماہ کی تگ و دو، مختلف گواہیوں اور فائلوں کے معائنے کے بعد رپورٹ دی کہ سی آئی اے، این ایس اے، ایف بی آئی اور آرمی انٹیلی جنس اپنے شہریوں کی جاسوسی کرواتی ہیں اصولی طور پر کوئی غلط بات نہیں تھی لیکن چونکہ اسے چھپایا گیا تھا اس لیے خاصی لے دے ہوئی اور عوام الناس میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کے وقار کو زبردست دھچکا لگا جلتی پر تیل کا کام ویتنام کی جنگ کے آخری دنوں میں سامنے آنے والے واقعات نے کیا۔ "مائی لائی" کا قتل عام، کمبوڈیا پر خفیہ بمباری اور فونکس پراجیکٹ جیسے سکینڈل سامنے آئے تو عوام نے برملا نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا اس صورتحال نے افسران کو خاصا بددل کر دیا خصوصاً فوج سے آنے والے

لوگوں نے وردیاں تبدیل کر کے اپنے پرانے محکموں میں جانا شروع کر دیا۔ ان واقعات کے صرف پانچ ماہ بعد میں نے سی آئی اے کی کمان سنبھالی تھی

۵۰ء کے عشرے میں سی آئی اے نے اطلاعات کے حصول کے لیے نشہ آور ادویات کے تجربات شروع کیے تھے۔ اس سلسلے میں سان فرانسسکو اور واشنگٹن میں سی آئی اے نے کچھ پرائیویٹ بنگلے بھی کرائے پر حاصل کر رکھے تھے۔ یہ معاملہ جاری تھا جب امریکی عوام میں "ایل ایس ڈی" جیسی خطرناک نشہ آور گولیوں نے شہرت حاصل کی اور اس کے سلسلے بھی سی آئی اے سے ملا دیئے گئے اس پر باقاعدہ چرچ نے ایک کمیٹی قائم کی اور ۱۹۷۵ء میں یہ مطالبہ سامنے آیا کہ سی آئی اے نے نشہ آور ادویات سے جو تجربات کیے تھے ان سے قوم کو آگاہ کیا جائے اور متعلقہ فائلوں کے معائنے کی اجازت بھی دی جائے۔ اس سلسلے میں سی آئی اے کے ایک وفادار ایجنٹ نے اہم کارنامہ انجام دیا اور ایک خصوصی فائل کو غائب کر دیا تاکہ یہ کمیٹی کے سامنے نہ آ سکے۔ ۷۷ء میں اس بات کا علم کمیٹی کے اراکین کو ہوا تو اس پر بڑی لے دے ہوئی اور برملا کہا گیا کہ امریکی عوام کے "فریڈم آف انفارمیشن ایکٹ" کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

ابھی سی آئی اے ان حالات سے نمٹ ہی رہی تھی کہ ٹھیک ایک سال بعد ایک اور مصیبت آن پڑی اور پھر گڑے مردے اکھاڑے جانے لگے۔ اس مرتبہ معاملہ کے جی بی کے ایک منحرف افسر یوری نوسنکو کا تھا جو ۱۹۶۴ء میں صدر جان ایف کینیڈی کے قتل کے چھ ماہ بعد امریکہ میں پناہ گزین ہوا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں یوری نوسنکو ایک مرتبہ پھر اخبارات کا موضوع بن گیا جب امریکن "ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو" نے کینیڈی کے قتل کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ایک خصوصی کمیٹی دوبارہ قائم کی۔ یوری نوسنکو کینیڈی کے قتل کے دنوں میں کے جی بی میں آفیسر تھا۔ لی ہاروے اوسوالڈ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک روس میں قیام پذیر رہ چکا تھا جب نوسنکو کے جی بی سے بھاگ کر امریکہ آیا تو تقریباً سب ہی امریکن انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اس کی تفتیش کی تھی۔ خاص طور سے اس امر کا جائزہ لیا گیا تھا کہ اوسوالڈ کا کے جی بی سے تو کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس نے بتایا کہ کے جی بی نے اوسوالڈ کو کبھی درخور

اتنا ہی نہیں جانا تھا۔ اب ۱۹۷۸ء میں قائم ہونے والی اس کمیٹی نے مطالبہ داغ دیا کہ وہ یوری نوسنکو کی تفتیشی رپورٹوں کا از سر نو جائزہ لینا چاہتی ہے۔ اس صورت نے ایک مرتبہ پھر سی آئی اے کے لیے نیا امتحان کھڑا کر دیا تھا۔ اسے جائزہ لینا تھا کہ یوری نوسنکو کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا؟

کاؤنٹر انٹیلی جنس کے معاملات سے نمٹنے کے فرائض جیمز اینگلٹن انجام دیتا تھا اور اس کی یہ رپورٹ تھی کہ جس نے ارسوالڈ کی ڈیوٹی "یوٹو سپائی منصوبے" پر لگائی تھی وہ کے جی بی کی نظروں میں رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ کے جی بی نے نوسنکو کو اس لیے امریکہ بھیجا ہو کہ وہ امریکن انٹیلی جنس کی تفتیش کو غلط راستے پر لگا دے۔ اس طرح اس کا کردار مشکوک ٹھہرتا تھا۔ دوسری طرف ان دنوں روس سے بھاگ کر آنے والے ایک اور کے جی بی کے ایجنٹ اناطولی گولٹسن نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ یوری نوسنکو ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا ہے اور اسے ایک کہانی کے ساتھ کے جی بی نے خود امریکہ میں پلانٹ کیا ہے۔ یوری نوسنکو کے حق میں صرف یہ بات جاتی تھی کہ اگر وہ واقعی کے جی بی کا مفرور ہے تو اس نے جو اطلاعات ہمیں کے جی بی کے مختلف آپریشنز کے متعلق بہم پہنچائی تھیں وہ اناطولی سے زیادہ معتبر اور اہم تھیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس کی اہمیت اناطولی سے زیادہ تھی۔ یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن اب نوسنکو مشکوک ہو چکا تھا۔ نوسنکو نے ہمیں بہت اہم اطلاعات بہم پہنچائی تھیں۔ اس نے ماسکو کے امریکی سفارت خانے میں کے جی بی کی طرف سے نصب شدہ نگرانی اور ریکارڈنگ کے مکمل نظام سے ہمیں آگاہ کیا تھا اور مغربی یورپ کے ایک ملک میں کے جی بی کے ایک طاقتور اور مضبوط اڈے کا بھی انکشاف کیا تھا۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ اب وہ ڈبل ایجنٹ تھا اور اینگلٹن کی یہ ڈیوٹی تھی کہ اس سے بزور اس کا اعتراف کروائے۔

یوری نوسنکو بہت مضبوط اعصاب کا ایجنٹ تھا۔ سی آئی اے نے اسے ساڑھے تین سال قید تنہائی میں رکھا اس دوران اس پر ہر ممکن حربہ آزمایا گیا۔ اسے ذہنی اور جسمانی تشدد کے ساتھ ساتھ ادویات کے سہارے بھی سچ اگلنے پر مجبور کیا گیا۔ اس دوران ۲۹۲ دن تو ایسے تھے جب ۲۴ گھنٹے روزانہ اس کی تفتیش ہوتی تھی۔ ہر ممکن غیر انسانی حربے استعمال

کرنے کے باوجود سی آئی اے نوسنکو کو اپنا بیان بدلنے پر مجبور نہ کر سکی اور اسے بے گناہ قرار دینا پڑا۔

نوسنکو کے کیس میں سی آئی اے نے جو طریق کار تفتیش کے لیے اختیار کیا تھا اس پر عوام میں بڑی لے دے ہو رہی تھی اور سی آئی اے کا امیج خاصا بگڑ رہا تھا۔ سی آئی اے کے سیکرٹس دوسرے شعبہ جات سے عموماً زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ خصوصاً وہ اطلاعات جو ہمارے جانثار ایجنٹوں سے متعلق ہمارے پاس محفوظ رہتی ہیں ان کا ریکارڈ بہت خفیہ رکھا جاتا ہے۔ ان آلات کی تفصیلات بھی ہوتی ہیں جو سی آئی اے کے زیر استعمال رہتے ہیں۔ ہمارے ایجنٹوں کی زندگیوں کا دار و مدار دراصل انہی خفیہ معلومات کا مرہون منت ہے۔ ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہم متعلقہ امریکی اداروں کو درکار اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں جو تصدیق شدہ ہوتی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ اطلاعات حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم یہ بھی رپورٹ دیتے ہیں کہ ان حاصل کردہ اطلاعات پر متعلقہ ملکی ادارہ مستقبل میں کب تک انحصار کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے کہ معلومات اور ایجنٹ کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ ایک آپریشن کے کئی حصے بنائے جاتے ہیں اور کوئی ایک شخصیت ایسی نہیں ہوتی جسے تمام حصوں کا علم ہو۔ سوائے چند ایک خاص لوگوں کے ہر کسی کو اس کے متعلقہ کام سے باخبر رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کسی بھی وقت کسی ایجنٹ کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے اور ہماری رازداری بھی اسی طرح برقرار رہتی ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ نوسنکو کے کیس کی طرح ہمارے اندرونی آپریشنز میں بسا اوقات "چیک سسٹم" نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ میں محکمانہ تقسیم کو تو تسلیم کرتا تھا لیکن میں نے نوسنکو جیسے کسی اور المیے سے بچنے کے لیے ضروری سمجھا کہ ہر ڈیپارٹمنٹ کو متعلقہ اطلاعات سے ہی باخبر رکھا جائے اور سب پر ایک مشترکہ نگرانی ضرور ہونی چاہیے۔

جاسوسی کی دنیا میں دو طرح کے جاسوس ہوتے ہیں۔ جن کی باتوں کو ایک ہی طرح

کے خدشات لاحق رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کیس آفیسر اور دوسرا ایجنٹ کہلاتا ہے۔ کیس آفیسر عموماً امریکن شہری ہوتا ہے۔ خواہ وہ امریکہ میں ہو یا دنیا کے کسی بھی حصے میں موجود ہو اس کا رابطہ براہ راست سی آئی اے سے ہوتا ہے۔ یہی کیس آفیسر سی آئی اے اور ایجنٹ کے درمیان "رابطے" کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایجنٹ عموماً غیر ملکی ہوتے ہیں جو امریکہ کے لیے خدمات انجام دینے کے متمنی رہتے ہیں کچھ ایجنٹ نظریاتی بنیادوں پر کچھ پیسے کے لیے، کچھ اپنی حکومتوں سے نفرت کے سبب اور کچھ ذاتی دوستی کے حوالے سے جو ان کی کیس آفیسر سے ساتھ ہوتی ہے۔ یہی کیس افسر انہیں بھرتی کرتا ہے۔ ایجنٹوں کی بھرتی کے وقت سی آئی اے کے ماہرین نفسیات ان سے انٹرویو کرتے ہیں۔ یہ انٹرویو دنیا کے کسی بھی ملک میں ہو سکتا ہے۔ ماہرین اپنے علم کے سہارے اور دیگر معلومات کے بل بوتے پر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ ایجنٹ کس حد تک قابل اعتبار ہے۔ متعلقہ ملک کے شہری ہمارے لیے اپنے ممالک میں بہترین ایجنٹ ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ایسے میں وہ زیادہ آسانی سے کام کر سکتے ہیں۔ غیر ملک کے ایجنٹ کے لیے یہ بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مثلاً اگر ہمیں کسی ملک کی کابینہ کے فیصلے کے متعلق اطلاعات درکار ہیں تو اس کا بہترین ذریعہ کابینہ کے اندر کے لوگ ہیں خصوصاً وہ آدمی جس نے فیصلے ٹائپ کرنے ہیں یا پھر اندر کا ایسا آدمی جو با آسانی ہر کمرے میں آ جا سکتا ہے یہی شخص کسی بھی کمرے میں مائیکروفون نصب کر سکتا ہے۔ کسی امریکی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اتنی آزادی سے کام کر سکے زبان ہی بسا اوقات بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔ ایجنٹ کی بھرتی میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رہتی ہے۔ اکثر ممالک میں کسی غیر ملکی کے ساتھ اپنے شہری کی ملاقات پر ہی اس کی نگرانی شروع ہو جاتی ہے۔ حفظ ماتقدم کے لیے ایسے ممالک میں کام کرنے کے لیے اس ملک کے شہریوں کی بھرتی کسی تیسرے ملک میں کی جاتی ہے۔

کسی بھی ایجنٹ کی بھرتی کے بعد اس سے مسلسل رابطہ ایک خطرناک اور حساس نوعیت کا کام ہے۔ کیس افسر کو کم از کم ایک دو مرتبہ اس سے براہ راست "اطلاعات" حاصل کرنا ہوتی ہیں اور اس ملاقات میں بہت سے خطرات شامل رہتے ہیں بسا اوقات تکنیکی نوعیت

کی ایسی معلومات درکار ہوتی ہیں جن کا علم نہ تو کیس افسر کو ہوتا ہے نہ ہی ایجنٹ کو۔ ایسی صورت میں ایجنٹ سے ماہرین کی ملاقات ضروری ہوتی ہے تاکہ اسے سمجھایا جا سکے۔ سی آئی اے اپنی معلومات کو خفیہ رکھنے کے لیے ایجادات کرتی رہتی ہے لیکن اس دوڑ کا خاتمہ کبھی نہیں ہو پائے گا۔ ہم عموماً جو خفیہ ہتھیار یا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں وہ بالآخر دوسری متحارب جاسوسی تنظیموں کی نظر میں آ جاتا ہے اور ایجادات کی یہ دوڑ جاری رہتی ہے۔ سی آئی اے اور کے جی بی میں مقابلے کی دوڑ ہر سطح پر لگی رہتی ہے گو کہ ہم نے ایسی "جاسوسی جنگ" سے ہمیشہ احتراز برتا ہے لیکن اس کا جواب دینے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

جولائی ۷۷ء میں روس نے امریکی سفارتی عملے کی ایک رکن مارتھا پیٹرلیشیا کو روس سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مارتھا پر بڑے سنگین الزامات لگائے گئے اور کہا گیا کہ وہ یہاں منشیات اور زہریلے کیپسول بھی تقسیم کر رہی تھی اس کے علاوہ اس نے روس میں باقاعدہ ایک جاسوسی گروہ قائم کر رکھا تھا۔ روس کے سرکاری اخبار "ازویستیا" نے اس خبر کو بہت اچھالا اور خوب مرچ مسالحہ لگا کر ایک لمبے عرصے تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ جبکہ اس میں اصلیت بالکل نہیں تھی اور ہمارے ہاتھ مس پیٹرسن کے معاملے میں بالکل صاف تھے سب کچھ کے جی بی نے ایک منصوبے کے تحت کیا تھا۔

متعدد مرتبہ روس نے امریکی سفارت کاروں کو غلط الزامات لگا کر ملک سے نکالا۔ ایک مرتبہ ایک روسی باشندے کو پکڑ کر اس پر مقدمہ چلا دیا اور اس کی کارروائی ساری دنیا میں نشر ہوتی رہی بعد میں اسے پھانسی لگا دیا گیا۔ دراصل روس یہ حرکتیں اپنے شہریوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کرتا رہتا ہے تاکہ وہ سی آئی اے کے چکر میں نہ پھنسیں اور اگر کوئی ایسا ارادہ رکھتا بھی ہے تو وہ سزا کے خوف سے محتاط ہو جائے۔

بعض معاملات پر ہمیں مسکت جواب دینا ہی پڑتا ہے مارتھا پیٹرلیشیا کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا جس کا جواب ایف بی آئی کی طرف سے ۸ ماہ بعد مئی ۷۸ء میں دیا گیا۔ جب ایک امریکی اور دو روسی شہریوں کو امریکہ میں جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ چکر امریکن

نیوی کے ایک آفیسر کے ذریعے چلایا گیا جو جاسوسی تو روس کے لیے کر رہا تھا لیکن یہ منصوبہ ایف بی آئی کا بنایا ہوا تھا۔ روڈلف اور ولاڈی ایگر نامی دو روسی جن کے ذریعے وہ جاسوسی کر رہا تھا یو این او کے دفاتر میں کام کرتے تھے اور انہیں مس مار تھا کی طرح ڈپلومیٹک سٹیٹس بھی حاصل نہیں تھا۔ ہم انہیں کورٹ میں لے گئے۔ روسیوں نے تو مار تھا کو صرف اپنے ملک سے نکالا تھا ہم نے ان کے آدمیوں کو جیل کی ہوا بھی کھلا دی۔

ان دنوں جمی کارٹر اور صدر بریزنیف کی ملاقات ہونے والی تھی اور انہوں نے سالٹ II معاہدے پہ بات کرنی تھی۔ ہم پہ بڑا دباؤ تھا کہ اس صورت حال میں جاسوس ایجنٹوں کو ایسا کھیل نہیں رچانا چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے اس بات کی مخالفت کی۔ جیسے ہی ہم نے روسیوں کو جیل بھیجا۔ روس نے اس کا جواب دیا اور ایک امریکی شہری کو روس میں بلیک مارکیٹنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اسے چند ہفتے جیل میں رکھ کر رہا کر دیا۔ اس کے فوراً بعد پہلی مرتبہ روس نے عالمی سطح پہ مس مار تھا کی سرگرمیوں کی تفصیلات سنائیں حالانکہ یہ ایک سال پرانی بات تھی۔

کسی بھی انٹیلی جنس کے لیے ایک ضروری اور اخلاقی ذمہ داری اپنے ایجنٹوں کا تحفظ ہوتا ہے اور سی آئی اے نے اس معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں دکھائی۔ میری چار سالہ مدت ملازمت کے دوران ہم نے بعض ناقابل یقین حد تک مشکل آپریشنز اس سلسلے میں کئے اور کئی مقامات سے اپنے ان ایجنٹوں کو نکالا جو مشکوک ہو جاتے تھے اور جن کی گرفتاری کا خطرہ درپیش رہتا تھا۔ اپنے ایجنٹ کے لیے سی آئی اے ہر ممکن تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ہیڈکوارٹر میں اس کا علم کسی کو نہیں ہوتا سوائے ایجنٹ کے کیس آفیسر کے۔ ہم نے ہزاروں ایجنٹس بیرون ممالک بھرتی کئے ہوتے ہیں۔ ہماری کئی خفیہ کانفرنسیں ان ایجنٹوں کے ساتھ سی آئی اے کے مختلف اڈوں پہ ہوتی رہتی ہیں۔ ان مقامات پہ حفاظت کے خصوصی اقدامات کئے جاتے ہیں اور ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ یہاں کوئی بیرونی مداخلت نہ ہو سکے خصوصاً یہاں کوئی مائیکروفون نما آلہ نصب نہ کیا جا سکے لیکن اس کے باوجود ہمارے ذہن میں یہ بات موجود رہتی ہے کہ کیا ہم محفوظ ہو گئے ہیں؟ کیا ایسا تو

سی آئی اے کا جاسوسی سیارہ

۔ فیڈرل کا سرد

صدر ریگن

نہیں کہ کوئی روسی ایجنٹ ہمارے درمیان موجود ہے؟

اس کے علاوہ ایک اور پریشانی ہمیشہ لاحق رہتی ہے وہ امریکی عوام اور پریس کا سی آئی اے سے رویہ ہے۔

۱۹۷۷ء میں جب میں نے ڈی سی آئی کا چارج سنبھالا تو نئے بھرتی شدہ ملازمین نے مجھ سے یہی مطالبہ کیا کہ انہیں معاشرتی تحفظ مہیا کیا جائے۔ آخر وہ ایک باعزت پیشہ اختیار کر رہے تھے کوئی غلط کام نہیں کرنے جا رہے تھے۔ سی آئی اے پر امریکی پریس کی طرف سے ہونے والی بے جا تنقید اکثر لوگوں کو دل برداشتہ کر دیتی ہے۔

۱۱ اپریل ۷۷ء کو میری تعیناتی کے بمشکل ۵ ہفتے بعد ہی واٹر گیٹ سکینڈل کے شہرت یافتہ صحافی باب ووڈ نے "واشنگٹن پوسٹ" میں ایک رپورٹ شائع کی جس نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ستمبر ۷۶ء میں واشنگٹن میں چلی کے سفیر کو جس پینسل بم سے قتل کیا گیا تھا وہ سی آئی اے کے ایک سابقہ آفیسر ایڈونڈل ولسن کا کارنامہ تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ولسن نے صدر قذافی کے کہنے پر یہ کارنامہ انجام دیا اور اب بھی سی آئی اے میں موجود کئی افسران سے "پینسل بم" کے ضمن میں اس کا رابطہ قائم ہے۔

میرے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ کیا سی آئی اے میں آستین کے سانپ موجود ہیں؟ اور ووڈ مزید تفصیلات کے ساتھ کب نئی کہانی شائع کرے گا؟ میری ووڈ کے ساتھ ملاقات ۶۲ء میں ہوئی تھی جب وہ نیوی میں ایک جونیئر آفیسر تھا۔ دوسری ملاقات کچھ عرصہ بعد ٹی وی کی طرف سے منعقدہ ایک مذاکرے میں ہوئی۔ ان ملاقاتوں میں مجھے وہ ایک سمجھدار انسان دکھائی پڑا تھا۔ میں نے اپنے پبلک افیئرز انچارج ہربرٹ کے ذریعے اسے یہ پیشکش کی کہ وہ اگر کچھ دن تک اپنی اگلی کہانی شائع نہ کرے اور مجھے یہ موقعہ فراہم کر دے کہ میں اس کے الزامات کی تحقیقات کر سکوں تاکہ وہ کالی بھیڑیں میری نظر میں آجائیں تو میں اس کا نہ صرف شکر گزار ہوں گا بلکہ اسے ایک شاندار نیوز سٹوری بھی فراہم

کروں گا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ووڈ کے پاس مزید اطلاعات نہیں تھیں یا وہ اس لالچ میں آ گیا کہ اس نے میری بات سے اتفاق کر لیا۔

میں نے چھان بین شروع کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی دال میں کالا تھا اور جس واقعہ کی طرف ووڈ نے اشارہ کیا اس کا علم ایجنسی کے کچھ لوگوں کو ہے اس معاملے میں اوول اور سلیرڈ قصوروار نظر آتے تھے میں انہیں سخت سزا دینے کے حق میں تھا جبکہ کونسلرز اس کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں معمولی سرزنش کی جائے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ کچھ پرانے گھاگ لوگ میری اتھارٹی کو چیلنج کر رہے ہیں اور میرے لیے آئندہ بھی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں کیونکہ مجھے سی آئی اے میں آئے چھ ہفتے ہوئے تھے اور فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اس گروپ کی ہاں میں ہاں ملاتا جاؤں یا پھر ان کے خلاف ڈٹ جاؤں؛ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد اوول اور سلیرڈ کو برخاست کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنا کنٹرول ایجنسی پر کمزور ہونے دوں۔ ۲۷ اپریل کو میں باب ووڈ سے ملا اور اسے اصلیت سے آگاہ کیا۔ باب نے اگلے مضمون میں یہ کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا کہ میں نے ولسن کیس میں ذمہ دار دو ملازمین کو برطرف کر دیا ہے اور میری یہ پالیسی مستقبل میں سی آئی اے میں غیر ذمہ دار لوگوں کے لیے خطرے کا سگنل ہے۔ اس کہانی کے بعد سے مجھے امریکی پریس نے کبھی نظرانداز نہیں کیا اور کچھ سال بعد جب ولسن جیل پہنچ گیا تو بھی میں اخبارات میں زیر بحث رہا۔

ایک طرف اگر ہم غیر ملکیوں کو سی آئی اے کے لیے کام کرنے کو تیار کرتے ہیں تو کئی غیر ملکی ایجنسیاں امریکیوں کو اپنے کام کے لیے بھی تیار کرتی ہیں۔ ایسے غداروں پر نظر رکھنا کار دارد ہے۔ بسا اوقات تو امریکیوں کا غیر محتاط رویہ اور گفتگو دیگر جاسوسی اداروں کو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن زیادہ خطرناک وہ ہوتے ہیں جو ہماری متحارب تنظیموں کے ایجنٹ بن جاتے ہیں۔

ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرے والی بات یہ ہے کہ جب ہمارا اپنا کوئی ملازم دوسری ایجنسی کے قابو آجائے۔ ایک تو وہ ملکی راز فاش کرتا ہے اور دوسری طرف اس ملک میں موجود ہمارے ایجنٹوں کے لئے بھی خطرہ بن جاتا ہے اس طرح متحارب جاسوسی تنظیم کو ان کے تدارک کا موقعہ مل جاتا ہے اور ہماری تمام مساعی خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔

بسا اوقات دوسری جاسوسی تنظیموں کے ڈبل ایجنٹ ہم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اتنی اہم اطلاعات لاتے ہیں کہ ان کی خدمات مشکوک نہیں رہتیں لیکن اس کے عوض وہ ہمارے ہاں سے زیادہ اہم اطلاعات حاصل کر کے اپنے ملک پہنچا دیتے ہیں۔ اس سے ان ملکوں کو زیادہ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ اطلاعات کا چارہ ڈال کر وہ سی آئی اے کے طریق کار سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس کھیل میں روسیوں کو کمال کا ملکہ حاصل ہے روسی ٹھنڈے دماغ کے اور صبر والے لوگ ہیں۔ وہ اس مقصد کے لیے کئی سال تک انتظار کرتے ہیں اور ایک ایجنٹ کئی سال پہلے ہم میں داخل کر کے سالوں بعد اس کی محنت کا پھل کھاتے ہیں۔

ایجنسی میں موجود غیر ملکی ایجنٹوں کا متحارب ایجنسیاں خوب خوب استعمال کرتی ہیں۔ سی آئی اے میں ایسی دو مثالیں مشہور ہیں ایک ٹونلیپ جس نے ۱۹۶۸ء میں سی آئی اے سے بوجوہ استعفیٰ دے دیا اور پھر کیوبا جا کر کتاب لکھی جس میں سی آئی اے کو خاصا بدنام کیا گیا۔

دوسرا کیس ڈیوڈ ایچ برنٹ کا ہے جس نے ۱۹۷۰ء میں سی آئی اے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ گرفتار ہوا تو اس نے اقرار کیا کہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ روسیوں کے لیے جاسوسی کرتا رہا ہے۔ اس نے کے جی بی کو یہ راز فراہم کیا تھا کہ سی آئی اے نے کس طرح روس کی طرف سے انڈونیشیا کو دیئے جانے والی خفیہ جنگی امداد کا کھوج لگایا تھا ایسے اہم رازوں کا انکشاف قابل گرفت اور جرم ہے برنٹ کو ۱۰ سال قید کی سزا دی گئی خوش قسمتی سے ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ دوران ملازمت وہ کے جی بی کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ بصورت دیگر وہ زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن لوگوں نے سی آئی اے کے ملازمین ہوتے ہوئے کے جی بی کے لیے جاسوسی کی اور بہت سی اہم اور ضرر رساں اطلاعات دشمن کو فراہم کیں۔ لیکن وہ اصل میں دوران ملازمت ڈبل ایجنٹ نہیں تھے۔ علاوہ ازیں ان میں سے بیشتر بہت چھوٹے درجے کے ملازمین تھے۔ میری مدت ملازمت میں ہم نے دو اہم جاسوس گروہ گرفتار کر لیے تھے۔ جن میں سے

ایک تو دو نوجوانوں کرسٹوفر بوائس اور ڈولٹن لی کی کیلیفورنیا سے گرفتاری تھی۔ یہ دونوں نوجوان اچانک دولت مند ہو گئے تھے اور اکثر لاس اینجلس کے گردا گرد پائے جاتے تھے۔ بوائس تو ایک کالج سے اخراج شدہ طالب علم تھا اور ٹی آر ڈبلیو کارپوریشن میں سروس کرتا تھا۔ بوائس اپنے حالات سے خاصا غیر مطمئن تھا خصوصاً ویت نام میں امریکی کردار پر کڑھتا رہتا تھا۔ لی کو شراب اور جوئے کی لت پڑ گئی تھی۔ ۱۹۷۵ء کے آغاز میں انہوں نے منصوبہ بنانا شروع کیا کہ بوائس ٹی آر ڈبلیو سے راز اڑائے اور لی وہ راز میکسیکو لے جا کر روسیوں کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اپریل ۷۵ء میں لی نے پہلا پھیرا لگایا۔ اس دوران وہ میکسیکن کی نظروں میں آ گیا۔ انہوں نے نوٹ کیا کہ لی روسی سفارت خانے کے کچھ زیادہ ہی چکر لگا رہا ہے۔ جنوری ۷۷ء میں لی گرفتار ہو گیا۔ عدالت میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو ایک نئی قیامت آن پڑی۔ ہمیں عدالت میں وہ خفیہ دستاویزات پیش کرنی تھیں جو چوری ہوئی تھیں اور ان پر بحث بھی ہوتی۔ ٹھیک ہے یہ راز روس تک پہنچ گئے تھے لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ دنیا کے باقی ممالک بھی اس سے آگاہ ہوں۔ بہر حال کیس چلا بوائس کو ۴۰ سال اور لی کو عمر قید کی سزا ہوئی۔

دوسری مثال سی آئی اے کے ملازم کیمپلز کی ہے جو مارچ ۷۷ء میں بھرتی ہوا۔ اس کی ڈیوٹی "واچ سنٹر" میں لگائی گئی جہاں ہم دنیا بھر میں موجود اپنے ایجنٹوں اور برقی تنصیبات کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ نومبر ۷۷ء میں اپنی ملازمت کے صرف ۸ ماہ بعد کیمپلز نے اپنے سپروائزر سے معاصرانہ چشمک کی بنا پر "جاسوسی برانچ" میں جانے کی درخواست کی لیکن اس کی کارکردگی کے پیش نظر یہ درخواست رد کر دی گئی۔ جس پر کیمپلز نے استعفیٰ دے دیا۔ جانے سے پہلے وہ سی آئی اے کے ایک فوٹوگرافک سیٹلائٹ سسٹم کے ایچ ۱۱ کا مینول بھی اپنے ساتھ لے گیا جو اس نے بعد میں تین ہزار ڈالر کے عوض روسیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کیمپلز نے اپنی صفائی میں کہا کہ اس کا مقصد مینول لے جانے سے یہ تھا کہ وہ اسے روسیوں کے ہاتھ فروخت کر کے سی آئی اے سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔ اور اس طرح "ڈبل ایجنٹ" بن کر ملکی خدمات انجام دے گا۔ کیونکہ سی آئی اے نے تو

اسے جاسوسی برانچ کے لیے ناکارہ قرار دے دیا تھا اس طرح وہ اپنی اہمیت منوا کر جاسوسی برانچ میں جا سکتا تھا۔ اگر اس کی بات مان بھی لی جاتی تو یہ انتہائی مضحکہ خیز اور خطرناک طریقہ تھا۔ عدالت نے اسے ۴ سال کے لیے جیل بھیج دیا۔

"پولی گراف" یعنی جھوٹ پکڑنے کی مشین ہمارا بہترین ہتھیار ہے لیکن اکثر ہم اسے بھی جل دے دیتے ہیں۔ خصوصاً کے جی بی تو پولی گراف پر قابل اعتماد نہیں رہی۔

"کوورٹ ایکشن" ہماری ایک خفیہ اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی بھی ملک میں ہماری خفیہ تخریبی کارروائی جس میں بظاہر ہم سامنے نہیں آتے۔ اس کھیل میں ہم اپنے ہم خیال لوگوں کی پشت پناہی کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیتے ہیں۔ ستمبر ۴۷ء میں سی آئی اے کے قیام کے وقت کوورٹ ایکشن کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی لیکن ۱۹۴۸ء میں ۴۸ ممالک میں ہم مختلف انداز سے مداخلت کر رہے تھے۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس وقت یو این او کے ممبر ممالک کی تعداد ۵۷ تھی۔ ان خفیہ آپریشنز کا دراصل مقصد یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپی ممالک میں روسی کمیونزم کی تحریک کو کچلا جائے اور وہاں طلبہ، مزدور اور سیاسی گروپوں کی حمایت کی جائے جو ہمارے مقاصد پر پورے اترتے ہوں۔ اس سلسلے میں پراپیگنڈہ کا ہتھیار بھی خوب استعمال کیا جاتا ہے۔

یورپ کے بعد "کوورٹ ایکشن" کا دائرہ دنیا کے دیگر ممالک تک پھیلا دیا گیا اور یوں یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ ۵۰ء اور ۶۰ء کے عشروں میں سی آئی اے کی دنیا کے مختلف ممالک میں مداخلت اتنی بڑھ گئی کہ "چرچ کمیٹی" کی رپورٹ کے مطابق اس سے امریکی معاشرے کا ہر حصہ بری طرح متاثر ہونے لگا۔

۱۹۶۷ء میں اپنے ہم خیال اور دوست گروپس کی مدد کے لیے سی آئی اے نے ۱۰ ملین ڈالر خرچ کیے۔ اس رقم کا بیشتر حصہ امریکہ کی مزدور، طلبہ اور مختلف جماعتوں کو مہیا کیا گیا تا کہ ان کے ذریعے ہم دنیا کے دوسرے حصوں میں اپنے ہم خیالوں کے ہاتھ مضبوط کر سکیں۔ یہ امریکی تنظیمیں ہمارے اور دوسرے ممالک کے درمیان "رابطے" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن غیر ملکی سیاسی مزدور اور طلبہ تنظیموں کو ہم پیسہ دیتے ہیں

وہ پھر ہماری کٹھ پتلیاں بن جاتی ہیں جنہیں ہم اپنی مرضی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔ اس طریق کار سے سی آئی اے بسا اوقات غیر ممالک میں اپنے ہم خیال گروپوں کو با آسانی مدد پہنچا دیتی ہے اور ہمارا نام بھی درمیان میں نہیں آتا۔ امریکی تنظیمیں ہماری پشت پناہی پر طلبہ اور مزدوروں کی مختلف تنظیموں کے غیر ملکی دوروں کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ مثلاً جب روس اپنے پراپیگنڈے کے لیے ورلڈ سٹوڈنٹس مومنٹ چلانے کا پروگرام بنا رہا تھا تو سی آئی اے نے ۲۵۰ امریکی طلبہ کا ایک گروپ ماسکو، وی آنا اور ہیلنسکی میں یوتھ فیسٹول میں شرکت کے لیے بھیج دیا تا کہ سیاسی سطح پر ہم روس کی پیش بندی کر سکیں۔ اس کے بہت مثبت اثرات بر آمد ہوئے اور روس کا یہ منصوبہ بین الاقوامی سطح پر پٹ کر رہ گیا۔ ایسی طلبہ تنظیمیں اپنے ممالک تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔

عموماً یہ کام امریکی پرائیویٹ فرموں کی وساطت سے انجام پاتا ہے گو کہ سی آئی اے اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مختلف ناموں سے اپنی فرمیں قائم کرتی رہتی ہے لیکن فورڈ، راک فیلر اور کارنیگی نامی فرموں کے ذریعے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک سی آئی اے نے آدھی سے زیادہ ادائیگی اپنے غیر ملکی حلیفوں کو کی۔ اس رقم کا ایک تہائی حصہ عوامی صحت کی بہبود اور سوشل سائنس کی بہتری کے کام پر ادا کیا گیا۔ سی آئی اے کی ایسی کارروائیاں کبھی خفیہ نہیں رہ سکیں۔ ایک بڑا انکشاف نیشنل سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے سلسلے میں ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ ہم ہر عہدے دار کو تو اعتماد میں لیتے نہیں تھے۔ پہلے پہلے کچھ لوگوں کو اعتماد میں لیا لیکن ہر سال انتخابات ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جانے والے نے آنے والے کو اس راز سے آگاہ کر دیا۔

۶۷ء میں ایک طالب علم لیڈر نے "ریمپارٹس" نامی ایک رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے ہمارا بھانڈہ پھوڑ دیا جس پر امریکی پریس میں خاصی لے دے ہوئی۔ مزدور، طلبا اور دیگر تنظیموں کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے ساتھ ساتھ سی آئی اے غیر ممالک میں پراپیگنڈہ مشنری کو بھی ہاتھ میں رکھتی ہے جن کے ذریعے رائے عامہ پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے ایران، چلی اور دنیا کے بہت سے ممالک میں سی آئی اے نے پریس کے ذریعے مطلوبہ

مقاصد حاصل کیے۔

ستمبر ۷۴ء میں مجھے پہلی مرتبہ انٹیلی جنس کے تکنیکی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات سے واسطہ پڑا۔ میں ان دنوں امریکہ کے دوسرے بحری بیڑے کا کمانڈر تھا اور نیوی کے ایک بڑے حصے کی کمانڈ کرتا ہوا اٹلانٹک عبور کر رہا تھا۔ جب ہمارا بیڑہ نارویجن سمندر میں داخل ہو کر اٹلانٹک کے فلیٹ ہیڈ کوارٹر نارفوک ورجینیا پہنچا تو مجھے ایک پیغام کے ذریعے خبردار کیا گیا کہ دو روسی بحری جہاز ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے ہمارے نزدیک پہنچ رہے ہیں ان سے ہوشیار رہا جائے۔ پیغام سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سی آئی اے نے یہ اطلاعات اپنے تکنیکی آلات کے ذریعے حاصل کی ہیں لیکن اس زمانے میں سی آئی اے اس کا اقرار نہیں کرتی تھی۔ حتیٰ کہ فلیٹ کمانڈر کو بھی لاعلم رکھا جاتا تھا۔ صرف ڈھائی سال بعد وہ موڑ آیا جب بطور ڈی سی آئی اے مجھے ہر تکنیکی انٹیلی جنس سسٹم کے ذریعے حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ یکم اکتوبر ۷۸ء کو صدر کارٹر نے فیصلہ کیا کہ ہمارے اس سسٹم کے متعلق امریکی عوام اور نیول کمانڈر کو بے خبر نہیں رکھا جائے گا اور انہوں نے انکشاف کر دیا کہ ہم سٹیلائٹ سسٹم کے ذریعے جاسوسی مقاصد کے لیے تصاویر حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح صدر کارٹر دراصل دنیا کو باور کروانا چاہتے تھے کہ اگر روس سالٹ II معاہدے کی کوئی خفیہ خلاف ورزی کرے گا تو ہمیں اس کا علم ہو جائے گا۔

امریکی عوام اس نظام کی تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھے لیکن انہیں صرف ایک حد تک ہی اطلاعات بہم پہنچائی گئیں۔ یکم ستمبر ۸۳ء کو جب روس نے کوریائی ائیر لائن کا ایک جہاز تباہ کیا تو امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے یہ بیان دے کر تہلکہ مچا دیا کہ روسی پائلٹوں نے اپنے ریڈیو پر جو بات چیت کی تھی وہ ہم نے اپنے الیکٹرونک سسٹم کے ذریعے ریکارڈ کر لی ہے۔ ایسے بیان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ذریعے خواہ مخواہ روسیوں کو ہوشیار کر دیا گیا اور ہمیں پھر نئی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

میں ایک مرتبہ کسی ملک کی انٹیلی جنس کے سربراہ سے ملاقات کر رہا تھا۔ ہماری ملاقات مشترکہ مفادات کے حوالے سے ترتیب پائی رہی تھی۔ یہ شخص

اپنے بزنس میں خاصا ماہر جبکہ میں ایک طرح سے نو وارد تھا۔ ہماری آفیشل گفتگو کے خاتمے پر جب ہم غیر رسمی بات چیت کر رہے تھے تو اس نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا "تم نے اطلاعات کے حصول کے لیے کبھی مقامی ذرائع کو بھی استعمال کیا ہے؟" میں نے اقرار کیا کہ واقعی میں نے اس معاملے پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے کہا۔

"بسا اوقات تم اپنے کسی ایجنٹ کو بعض اہم نوعیت کی اطلاعات کسی غیر ملک میں حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہو جبکہ وہ تمہیں بڑے آرام سے بیٹھے بٹھائے اپنے ملک میں مل جاتی ہیں۔"

اس کا اشارہ صحافیوں، اساتذہ اور تاجروں کی طرف تھا جو دیگر ممالک میں اپنے ہمکاروں کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے وہاں کے پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے اساتذہ ہوتے ہیں جن کے غیر ملکی شاگرد اپنے ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز اور خاصے باخبر ہوتے ہیں۔ صحافی بین الاقوامی نوعیت کے سیاستدانوں اور دانشوروں سے رابطہ رکھتے ہیں کیونکہ یہ ان کے بزنس کا تقاضا ہے۔ تاجروں کے دوسرے ممالک کے تاجروں سے بڑے گہرے مراسم ہوتے ہیں۔ گو کہ ان لوگوں سے کسی ملک کی کیبنٹ یا پولٹ بیورو کے حساس ترین معاملات کا علم نہیں ہو سکتا لیکن کم از کم ان لوگوں کو متعلقہ ملک کی معیشت، عوامی سوچ اور بے چینی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کا علم ضرور رہتا ہے۔ میں نے غور کرنا شروع کیا کہ کوئی خطرہ مول لیے بغیر میں ان لائنوں پر کیسے کام کر سکتا ہوں۔

جن دنوں میں ڈی سی آئی بنا ان دنوں ہمارے میڈیا میں یہ روش عام پائی جاتی تھی کہ وہ لوگ بھلا انٹیلی جنس کے لیے کیا کارآمد ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ ۱۰ سال پیشتر سی آئی اے اور امریکن پریس میڈیا میں بڑا تعاون ہوا کرتا تھا۔ کسی غیر ملکی سٹیشن پر سی آئی اے کا سٹیشن چیف یا بیورو چیف اور امریکی نمائندہ اخبار اکثر ایک دوسرے سے خاصا تعاون کرتے تھے۔ چونکہ دونوں پارٹیوں کا مطمع نظر زیادہ سے زیادہ معلومات کا حصول ہوتا تھا۔ جذبہ حب الوطنی کے تحت وہ اکثر معلومات کا موازنہ اور تبادلہ بھی کرتے رہتے تھے کبھی کبھی اخبار نویس، سی آئی اے کی خواہش پر اس کے لیے خصوصی راز حاصل کرتے تھے

جس کا انہیں خطیر معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ پھر طرفین پر اکٹھی ہی حقیقت آن گری سی آئی اے نے محسوس کیا کہ سٹیشن چیف کے ساتھ وہاں موجود امریکی نامہ نگار کے تعلقات بسا اوقات راز داری کا پردہ فاش کر دیتے تھے۔ جیسے ہی اس چیف کا تبادلہ کسی اور ملک میں ہوتا۔ متعلقہ اخبار نویس کسی حوالے سے اس کے متعلق خبر لگا دیتا اور اس کی شخصیت ظاہر ہو جاتی۔ اس خدشے کے پیش نظر سی آئی اے نے غیر ممالک میں امریکی صحافیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ میری تعیناتی سے کچھ عرصہ پہلے اخبار نویسوں سے رابطہ بہت محدود کر دیا گیا تھا اور اب اگر کوئی ضرورت درپیش ہوتی تو سی آئی اے کے "بنگلے" آفس سے ہی کسی اخبار نویس سے درخواست کی جاتی کہ وہ فلاں ملک میں "نیوز سٹوری" کی تلاش کے لیے چلا جائے۔

ان تعلقات پر سب سے زیادہ ۱۹۷۶ء میں چرچ کمیٹی کی رپورٹ اثر انداز ہوئی۔ جس میں بتایا گیا کہ ۵۰ نامور امریکن صحافی سی آئی اے کے تنخواہ دار ملازم تھے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی سی آئی اے کو اطلاعات پہنچا کر "فریڈم آف انفارمیشن ایکٹ" کی صریحاً خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صحافیوں میں یہ نظریہ جڑ پکڑنے لگا کہ اس طرح ان کی حیثیت "ٹاؤٹ" کی بن کر رہ جاتی ہے اور اپنے ساتھیوں کی نظروں میں ان کا مقام گر جاتا ہے۔

کچھ یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے سی آئی اے اور صحافیوں کے تعلقات میں خلیج سی حائل ہو کر رہ گئی تھی۔ بہت سے اخبار نویسوں نے غیر ممالک میں سی آئی اے کے سٹیشن چیف یا مقامی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ کسی بھی قسم کی خدمات پر معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ ایک روز "واشنگٹن پوسٹ" کی پبلشر کیتھرائن گراہم کا فون آیا کہ اس کی ایک صحافی دوست جس نے حال ہی میں چین کا دورہ کیا ہے، سی آئی اے کو اپنی معلومات میں حصہ دار بنانے کو تیار ہے۔ اگر ہم اس کی مرضی کے مطابق اس کے لیے ایک اور تفریحی دورہ ترتیب دے سکیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے فوراً اس سے ملاقات کی خواہش

ظاہر کی۔ ہماری ایک غیر رسمی ملاقات بھی ہوئی۔ اس کے بعد میں اس سے ایک "کاک ٹیل" پارٹی میں ملا اور اسے دعوت دی کہ وہ ہمارے آفس "بنگلے" آئے۔ جس پر اس کا جواب بالکل غیر متوقع اور میرے لیے قدرے پریشان کن بھی تھا۔ اس نے کہا۔

"میں آپ کے دفتر نہیں آ سکتی۔ مجھے اپنی برادری کو بھی بہرحال منہ دکھانا ہے۔"

تحقیق پر علم ہوا کہ اس کے ہم پیشہ کچھ لوگوں کو میری اور اس کی ملاقات کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے طعنہ زنی شروع کر دی تھی۔ اب جبکہ میں صحافیوں سے تعلقات استوار کرنے جا رہا تھا تو میری پوزیشن دفاعی نوعیت کی تھی۔ کیونکہ میرے پیشرو جارج بش نے اوول میں ایک تحریری بیان دے دیا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ سی آئی اے کسی امریکی تشہیری ادارے، اخبار، ٹی وی، ریڈیو سے وابستہ یا فری لانس جرنلسٹ کی خدمت کبھی کسی معاملے میں مستقلاً یا عارضی بنیادوں پر حاصل نہیں کرے گی۔

یہاں میں نیو یارک ٹائمز کے ایپے اولنسٹل سے ہوئی گفتگو کا حوالہ ضرور دوں گا۔ میں ایپے کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک ڈنر پارٹی میں جہاں ایپے اور "ٹائمز" کے

کیمیائی جنگ کے لئے تیار امریکی فوج کے سپاہی

بہت سے لوگ شامل تھے۔ اس نے دلائل دینے شروع کر دیئے کہ کسی امریکن بادیگزار جرنلسٹ کی مدد سی آئی اے کو حاصل نہیں رہی۔ میں نے اس سے کہا۔

”ا پیسے! تم کو علم ہے کہ واشنگٹن میں موجود ”پراودا“ کا نمائندہ ہمارا تنخواہ دار ملازم ہے۔“

اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور خاموشی اختیار کر لی۔ اس بات سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اگر امریکن صحافی ہمارے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو ہم اس معیار کے کسی اور غیر ملکی صحافی کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ روسی ہی کیوں نہ ہو۔

ایک ”آزاد پریس“ کا وجود جمہوریت کی بقا کے لیئے ناگزیر ہے لیکن یہ بات بھی غلط ہے کہ جب سی آئی اے اور امریکن صحافت دونوں قوم و ملک کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بالکل ہی تعاون نہ کریں یا پھر سی آئی اے کو پابند

سی آئی اے کا نمائندہ

انقرابانی لیڈر

کر دیا جائے کہ وہ کسی صحافی سے تعاون حاصل نہ کرے۔ اگر کسی ہائی جیکر نے بہت سے مسافروں کو یرغمال بنا رکھا ہے اور وہ صحافی سے براہ راست ڈائیلاگ کر رہا ہے تو کیا ہم صحافی سے مدد کی درخواست نہیں کر سکتے؟

میں نے فوراً ایک ریگولیشن جاری کیا جس کے ذریعے ناگزیر حالات میں اخبار نویسوں کے تعاون کو ضروری قرار دیا۔ میری مدت ملازمت میں دو ایسے مواقع آئے جب ہم نے اخبار نویسوں کا تعاون حاصل کیا۔ ایک تو ایران میں امریکی سفارت کاروں کی محبوسی کے ایام میں ہم نے ایک اخبار نویس کی مدد حاصل کی۔ حالات نے یہ مدد ہمارے لیے ناگزیر کر دی تھی۔ ہم نے اس شخص کو استعمال نہیں کیا اسے اطلاعات کے حصول کا ذریعہ ضرور بنایا۔

اخبار نویس عموماً ایک بات کہتے ہیں کہ پہلے وہ ہماری خفیہ مدد کریں لیکن جب بھی وہ کسی غیر ملک میں ہوں اور متحارب ایجنسی کو یہ علم ہو جائے کہ ہم ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو ان کی جان کو خطرہ درپیش رہتا ہے لیکن میں اس دلیل سے متفق نہیں۔

ساری دنیا کو اس بات کی خبر ہے کہ سی آئی اے اور امریکی صحافیوں کے درمیان ملاقاتیں معمول کی بات ہے۔ جس دوران ہم ایک دوسرے سے معلومات کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی ضابطہ جاری کرنے سے تو یہ ممکن نہیں کہ ان پر یہ الزام ہی نہ آئے گا۔ اس کے برعکس یہ بھی وہ جانتے ہیں کہ روسی صحافی کے جی بی سے مکمل تعاون کرتے ہیں بلکہ ”پراودا“ کے بیشتر غیر ملکی نامہ نگار تو ان کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ اس کے برعکس اگر سی آئی اے کسی قانونی موشگافی کے ذریعے امریکی صحافیوں کی مدد کو غلط قرار دیتی ہے تو ساری دنیا یہی سمجھے گی کہ ہم انہیں دھوکہ دینے کے لیے یہ ڈرامہ رچا رہے ہیں، جھوٹ بول رہے ہیں۔

میں نے پریس کے معاملات پر توجہ دی اور ایک مرتبہ پھر سی آئی اے اور پریس کے درمیان اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔ دوسرا میدان اساتذہ کا تھا۔ یہاں ایک مجبوری یہ تھی کہ امریکن یونیورسٹیوں کے قانون کے مطابق اس کے ملازمین کو اگر وہ کوئی

"پارٹ ٹائم جاب کرتے ہوں تو وہ بتانا ہوتی تھی۔ جبکہ ہمارے ساتھ تعاون کرنے والے اساتذہ کا مطالبہ تھا کہ ان کی خدمات کو خفیہ رکھا جائے۔ ہم نے رابطہ عوام مہم کے سلسلے میں ٹی وی سے دو پروگرام "۶۰ منٹ" اور "گڈ مارننگ امریکہ" شروع کئے۔ پروفیسر حضرات سے ہماری ڈیمانڈ یہی ہوتی تھی کہ وہ ہمیں مختلف موضوعات پر ہونے والی ریسرچ سے آگاہ کریں۔ یہاں ہماری یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ ان کے ذاتی نظریات کے بجائے عوام کے بدلتے رجحانات کے حوالے سے ان کی تحقیق سامنے آنی چاہیے تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک اہم کام ہم ان پروفیسر صاحبان سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے غیر ملکی شاگردوں اور سی آئی اے کے درمیان رابطہ پیدا کرائیں تاکہ ان لوگوں کو "امریکہ حمایتی" بنایا جا سکے اور جب وہ اپنے ممالک کو واپس جائیں تو ہمیں ان کے ذریعے بہترین ایجنٹ اپنے کام کے لیے میسر آ سکیں۔ ان کے اپنے ممالک میں بسا اوقات سخت سیکورٹی کی وجہ سے ہمیں ایجنٹوں کے حصول میں دشواری پیش آ سکتی تھی جبکہ یہاں یہ کام قدرے آسان تھا۔ چرچ کمیٹی کے سامنے اس مسئلے پر خاصی لے دے ہوئی اور یہ کہا گیا کہ غیر ممالک سے جو نوجوان طلبہ یہاں امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ ان کی ہر طرح کی حفاظت امریکہ کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس کے برعکس سی آئی اے انہیں ورغلا کر اپنا آلۂ کار بنانے لگتی ہے۔

۱۱ نومبر ۱۹۷۸ء کو وائٹ ہاؤس سے ایک انتہائی اہم لفافہ "پیکٹ" اس ہدایت کے ساتھ بھیجا گیا کہ اسے صرف میں ہی کھولوں۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں صدر امریکہ جمی کارٹر کی تحریر موجود تھی۔ صدر نے لکھا تھا کہ وہ ہماری "سیاسی انٹیلی جنس" سے مطمئن نہیں ہے اور اس کی خواہش تھی کہ انہیں جلد از جلد ایک منضبط رپورٹ پیش کی جائے کہ دنیا بھر میں کن کن ممالک میں امریکہ کی سیاسی حیثیت کیا ہے اور اس کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اور کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں حالانکہ اس خط میں میرے علاوہ سیکرٹری آف سٹیٹ اور صدر کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کو بھی مخاطب کیا گیا تھا لیکن میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ دراصل یہ ایران سے متعلق ہماری کمزور رپورٹنگ

کی شکایت ہے جو صدر نے مجھ سے کی تھی۔

ابھی چند روز پہلے ہی صدر نے ایک محفل میں میری خدمات کی تعریف کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا اور مجھے کہا تھا کہ ان کی خواہش ہے کہ میں بطور ڈی سی آئی زیادہ دیر تک اس عہدے پر فائز رہوں۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی اور آج صدر نے یہ کہہ دیا مجھے شک گزرا کہ اس سرزنش کے پیچھے برزنسکی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ میرے شکوک کی تصدیق بعد میں اخبارات میں چھپنے والی ایک کہانی کے ذریعے ہوگئی۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ کہانی کن ذرائع سے اخبارات تک پہنچی۔ نیوز سٹوری کے ذریعے یہ تاثر پیدا کیا گیا تھا کہ میں ایران کے معاملے میں ایک ناکام اور کسی حد تک مشتبہ سی آئی اے کا ڈائریکٹر ہوں اور مجھے اس عہدے پر فائز رکھنے کا بظاہر کوئی جواز نہیں دکھائی پڑتا۔

کیا واقعی ایران کے معاملے میں ہماری پالیسی ناکام تھی؟

اس سوال کا جواب بیک وقت ہاں اور نہیں میں ہے۔ بظاہر تو اس کا جواب ہاں میں ہی ہوگا لیکن اس انداز میں "نہیں" میں اس کا جواب نہیں تھا جس انداز میں اس مسئلہ کو برزنسکی نے اٹھایا تھا۔ برزنسکی نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا کہ ہم شاہ ایران کو بروقت مطلع نہیں کر سکے کہ وہ کس نوعیت کی مشکلات کا شکار ہو چکا ہے۔ حالانکہ کسی بھی انقلاب سے بروقت مطلع ہو جانا، انٹیلی جنس کے دھندے میں یہ بات خاصی مشکل ہے۔ کسی ملک کے عوام، دانشور، اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں کی سوچ سے باخبر تو رہا جا سکتا ہے لیکن یکایک برپا ہونے والے انقلاب کی بسا اوقات خبر نہیں ملتی۔ جاسوسی ذرائع سے حاصل کردہ رپورٹوں کی مدد سے آپ ایک رائے تو قائم کر سکتے ہیں لیکن اس میں بھی وقت لگتا ہے۔ ایسی تمام رپورٹیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور ان پر بحث اور غور و خوض کے بعد ہی کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

ایران میں یہی ہوا۔ ہم جب تک کسی نتیجے پر پہنچے اور اپنی اطلاعات صدر تک پہنچائیں وہاں انقلاب آ گیا۔ میرے خیال سے کم از کم دو ایسی بنیادی وجوہات تھیں جن کا سراغ لگانے میں ہمیں اور ہم سے پہلے فورڈ انتظامیہ کو ناکامی ہوئی۔ ان میں سے ایک بنیادی وجہ تو

ایرانی عوام کی شاہ سے روز بروز بڑھتی ہوئی نفرت اور دوسری ایران میں مذہبی بنیاد پرستوں کی تحریک کی شدت جو ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ متحرک اور فعال ثابت ہوئی۔ ہم یہ جانتے تھے کہ ایرانی ملا طبقہ شاہ کے لادین نظریات، مغربی تہذیب کی طرز ایران کی تیزی سے پیش قدمی، بے حیائی اور ملک کو خالصتاً لادین معاشرے کی طرف لے جانے کے تو مخالف ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے رہے کہ شاہ کی طرف سے کیونکہ مولویوں کو وظیفے کی شکل میں ایک خطیر رقم بطور رشوت ملتی رہتی ہے۔ اس لیے شاید وہ سر نہ اٹھائیں اور مطمئن رہیں۔ ہمیں یہ بھی علم تھا کہ لادین حلقے خصوصاً سیاسی حلقوں میں شاہ کی آمرانہ پالیسیوں کی وجہ سے اس کے خلاف شدید نفرت کی فضا جنم لے رہی ہے اور ہمیں یہ بھی علم تھا کہ چھوٹا تاجر طبقہ جو ایران میں بڑے سرمایہ دار کے ہاتھوں پس کر رہ گیا ہے۔ شاہ سے غیر مطمئن ہے۔

جس بات کا اندازہ ہمیں نہ ہو سکا وہ یہ تھی کہ تینوں طبقات کی براہ راست کمان ۷۹ سالہ آیت اللہ خمینی کے ہاتھوں میں ہے جس نے ان دنوں فرانس میں جلا وطن حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ایک مرتبہ تو یہ نظر آتا تھا کہ عوام الناس سیاستدان اور تاجر طبقے تو شاد منٹ چکے ہیں اور ان میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن ہماری توقعات کے بالکل برعکس اور حیران کن حد تک مذہبی بنیاد پرست طاقت پکڑ گئے اور یکا یک انہوں نے ان تمام طبقوں پر برتری بھی حاصل کر لی۔ ہم اندازے کی غلطی کا شکار کیوں ہوئے!؟ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سی آئی اے کے بیشتر تجزیہ کار شاہ کے جلال کی چکا چوند سے آگے کچھ دیکھ سکے۔ ۱۹۷۸ء کے موسم بہار میں جب ہم نے شاہ کو دیکھا تو ہمارے علم میں یہی بات تھی کہ بھلے عوام اس کے خلاف ہوں۔ لیکن شاہ ایک طاقتور حکمران ہے فوج، ائیر فورس اور پولیس پہ اس کا مکمل کنٹرول ہے علاوہ ازیں "ساواک" کی صورت میں ایک طاقتور خفیہ فورس اس کے ماتحت اور اس کی فرمانبردار ہے۔ ہمارے خدشات کے جواب میں یہ تسلی موجود تھی کہ اگر کسی نے سر اٹھایا تو شاہ کا معمولی اقدام اس طاقت کو کچل کر رکھ دے گا۔ بد قسمتی سے ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ افسوس شاہ نے ہماری اطلاعات کو کبھی درخور اعتنا ہی نہیں جانا۔ وہ شخص اپنے ملک کے حالات کی تو جیسے خبر ہی نہیں رکھتا تھا۔ جب شاہ نے حالات کو سمجھ کر سختی

اٹھایا تو ایرانی علماء کے پیروکاروں نے وہاں خون کی ندیاں بہادیں: شاید شاہ نے حالات کا مقابلہ کرنے سے ذہنی طور پر دستبرداری اختیار کر لی تھی کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اب معاملہ اس کے بس میں نہیں رہا اور اس کی حیثیت ایک مرتے ہوئے انسان سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو شاہ سی آئی اے کی توقعات پہ پورا نہ اتر سکا۔ امریکہ نے کسی معاملے میں براہ راست مداخلت اس لیے نہیں کی کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا کہ امریکہ کو اس خطے میں جس قسم کا رول بھی ادا کرنا ہوگا وہ شاہ ایران کر رہا ہے۔ ہم اس کی طرف سے مطمئن تھے اس کو صرف انٹیلی جنس کی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے ساتھ "پالیسی ساز" بھی اس ناکامی میں برابر کے شریک تھے۔ انٹیلی جنس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو حالات سے مطلع کرتی رہے۔ ہم نے اپنا فریضہ ادا کیا۔ اس کے بعد پالیسی سازوں کا کام ہے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ہم نے ایران کے حالات کی مکمل رپورٹ صدر کو پہنچادی تھی۔ جب شاہ ایران ایک سال پیشتر امریکہ کے دورے پہ آئے تو صدر کارٹر نے انہیں متنبہ کیا تھا کہ وہ اپنے ملک کے سیاسی ڈھانچے میں تبدیلی کریں اور اس سلسلے میں اپنا رویہ لبرل بنائیں کیونکہ حالات بگڑ رہے ہیں اور بصورت دیگر ان کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ کو درپیش خطرات کا اعلان ہم نے ڈھول بجا کر نہیں کیا تھا لیکن کوئی ایسی اطلاع بھی نہیں تھی جو صدر کو نہیں پہنچائی گئی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پالیسی سازوں کو اس سے بے خبر رکھا گیا۔ نکسن کے دور سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ سی آئی اے تو رہی ایک طرف ان دنوں تو صورتحال یہ تھی کہ مڈل ایسٹ سے نکلنے والے بیشتر اخبارات میں ایسے مضامین شائع ہو رہے تھے جن سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی تھی کہ ایران میں ایک خاموش انقلاب جنم لے رہا ہے اور صورتحال کسی بھی لمحے کوئی ڈرامائی موڑ لے سکتی ہے۔ جب زیر زمین تبدیلی کو مڈل ایسٹ کے دانشور اور صحافی سونگھ سکتے تھے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سی آئی اے اس سے بے خبر رہی ہو۔!

میں نے سی آئی اے میں آ کر ایک اور کوشش بھی کہ ہم وہ اطلاعات جن سے

امریکی عوام کا باخبر رہنا ضروری ہے انہیں شائع کر دیا کریں۔ گو کہ اس میں ہم اپنے ذرائ
معلومات' چھپا لیتے تھے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی توانائی' انرجی کرائسس' رپورٹ
تھی جو اپریل ۷۷ء میں صدر کارٹر کی ایک تقریر کے بعد ہم نے شائع کی۔ اس کی اشاعر
کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں اس پر متضاد آراء موصول ہوئیں۔ کچھ نے اس سے اتفاق کیا اور
نے اختلاف میں نے ان لوگوں کو "بیٹھکے" آنے کی دعوت دی۔ اس طرح ہمیں مزید اور بروقت
معلومات حاصل ہو گئیں۔

دوسری مثال اس رپورٹ کی اشاعت کی ہے جو روس سے متعلق تھی۔ اس میں
بتایا گیا تھا کہ ایٹمی حملہ ہونے کی صورت میں روس اپنے عوام کو کیا تحفظ دے سکتا ہے۔
رپورٹ کے ذریعے انکشاف ہوا کہ ایٹمی حملے کی صورت میں روس صرف ۵ فیصد شہریوں کو
بچا سکتا ہے۔ بقیہ ۹۵ فیصد جو زیادہ تر دیہاتی علاقے میں قیام پذیر ہیں ان میں سے بیشتر کو
تو اس حملے کی اطلاع دینے کا بھی بندوبست نہیں ہے۔ ۹۵ فیصد لوگوں کو بچانے کے ل
جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ عوام کے علم میں نہیں تھا۔ میرے خیال کے مطابق عوام الناس
کو ایسی معلومات بہم پہنچانا ضروری تھیں ان رپورٹوں کی اشاعت پر بہت لے دے ہوئی
کچھ لوگوں نے اس کو برا کہا اور کچھ نے اچھا۔ بہرحال کوئی کچھ بھی سمجھے میرے خیال سے یہ
ایک بہترین فیصلہ تھا جس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے جب ہم نے پولینڈ کی معیشت
رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا کہ مغرب کی طرف سے امداد کے باوجود وہاں کوئی تبدیلی نہ
آ سکی تو برزنسکی جو پولینڈ کا پیدائشی تھا۔ اس پر بہت جز بز ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نوعیت
کی رپورٹوں کی اشاعت سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ صدر امریکہ کی پالیسی ناکام رہی ہے
مجھے اب یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ وائٹ ہاؤس کی طرف سے ہمارے معاملات میں مداخلہ
ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ہماری اپنی آزادی کے متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ میں برزنسکی کی
اس بات سے متفق ہوں کہ ہمیں صدر کی پالیسیوں کی اندرون خانہ مخالفت کا حق نہیں پہنچتا
میں صدر کے ہر اقدام کو تنقید سے بالا سمجھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ حالانکہ میرے لیے یہ آسا
بات تھی کہ ہم کچھ شائع ہی نہ کریں یہی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ ان کی کارگزاری نہ کسی کے علم

میں آئے اور نہ کوئی اس پر تنقید کرے جبکہ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر سی آئی اے کے ماہرین
کی آراء کے بعد مرتب کی گئی رپورٹوں کو عوام میں بحث کے لیے رکھا جائے تو ہمیں ان کی
حیثیت' کا تعین کرنے میں آسانی رہے گی۔

ہم نے ۷۷ء میں انرجی پر اپنی دوسری رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۰ء
کے فوراً بعد سے روس اپنی تیل کی پیداوار میں کمی کرنا شروع کر دے گا۔ سی آئی اے سے
باہر جو ماہرین تھے انہوں نے معمولی سے اختلاف کے ساتھ اس بات سے اتفاق کیا اور
یہ کہا گیا کہ ہماری رپورٹ کے مطابق الباقوراً نہیں ہو گا۔ ہماری رپورٹ غلط نہیں تھی۔
اصل میں بات یہ تھی کہ اس کی اشاعت کے بعد روسیوں نے اپنا طریق کار تبدیل کر لیا۔ انہوں
نے تیل کی پیداوار میں کمی سے بچنے کے دوسرے طریقے تلاش کر لیے۔ کچھ بھی ہو بہرحال یہ ایک
اہم رپورٹ تھی جس میں روس کو پیش آنے والے ایک بحران کی نشاندہی کی گئی تھی۔

اس روز میں اور صدر جمی کارٹر دوپہر کا کھانا اکٹھے کھا رہے تھے صدر نے میرے لئے
خصوصی کھانے کا اہتمام کیا تھا لیکن مجھے کبھی کھانے سے دلچسپی نہیں رہی۔ میں تو یہاں ایک تجویز
لے کر آیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ ہفتے میں کم از کم صدر مجھے ۲۰ منٹ بالمشافہ ملاقات کے لیے
دے دیا کریں۔ جب میں نے یہ تجویز صدر کے سامنے رکھی تو اس کے جواب نے چونکا دیا۔ صدر
کے ذہن میں بھی یہی تجویز تھی۔ اور ہفتے میں کم از کم تین مرتبہ ایسی ملاقات کا خواہاں تھا۔ اور ہر
ملاقات اس کے خیال میں ۳۰ منٹ کی ہونی چاہئیے تھی۔ یہ میری توقعات سے بڑھ کر تھا۔

صدر کی سیکرٹری استقبالیہ ٹموتھی گرافٹ نے منگل سے جمعہ کے درمیان کے دن ان
ملاقاتوں کے لیے منتخب کئے تھے۔ اور میں نے باقاعدگی سے اس پروگرام پر عمل شروع
کر دیا تھا۔ گو کہ یہ ملاقات ۳۰ منٹ کی ہوا کرتی تھی لیکن مجھے اس کی تیاری پر دس بارہ
گھنٹے صرف کرنے پڑتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ واشنگٹن میں ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۶ء جب
میں نیوی میں لفٹیننٹ تھا میں کمانڈر کو ارد گرد کے سیاسی حالات سے باخبر کرتا تھا۔ یہ تجربہ کام آیا۔

صدر کارٹر بڑے مضبوط اعصاب کا انسان تھا کیا مجال جو کبھی کسی موضوع پر گفتگو کرتے
ہوئے اس نے تشنگی کا احساس پیدا ہونے دیا ہو۔ وہ حاضر دماغ اور بیدار مغز انسان تھا

میں نے کبھی اسے کسی معاملے میں پریشان نہیں پایا سوائے اس موقع کے جب ۱۹ فروری ۱۹، کو ایرانی طلبہ کے ایک گروپ نے تہران میں ہمارے سفارت خانے پر قبضہ کر کے وہاں کے عملے کو یرغمال بنا لیا اور ایک ایسے کرائسس کی بنیاد رکھی جس کا خاتمہ پھر ۶ ماہ بعد ہوا۔ خمینی حکومت نے طلبہ کو منتشر کر دیا تھا لیکن ایک امریکی سارجنٹ اس ہنگامے میں شدید زخمی ہو گیا جسے بعد میں ہسپتال لے جانا پڑا۔ جب اس سارجنٹ کی یرغمالی بنانے والوں کے ہاتھوں رہائی عمل میں آئی تو صدر کارٹر نے خود اس کی والدہ کو مینیسوٹا میں فون کر کے مبارکباد دی تھی۔ صدر نے بتایا اس ایک پریشانی نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میرے لیے ایک امریکی کے ساتھ یہ سلوک ذہنی اذیت کا باعث بنا رہا۔ اس واقعے کے نو ماہ بعد صدر کو ایسے پچاس یرغمالیوں کی وجہ سے جس اذیت ناک ماحول سے گزرنا پڑا اس کا تصور ہی بڑا مشکل ہے۔

صدر جمی کارٹر نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اسے ساؤتھ ایشیا میں فی ایکڑ چاول کی پیداوار کے متعلق بتایا قریباً چھ ہفتے بعد میں نے بھارت کے متعلق ایسی ہی رپورٹ پیش کی۔ صدر نے جھٹ سے دونوں کا موازنہ کرنا شروع کر دیا حالانکہ مجھے پہلی بات بھول چکی تھی۔ تاہم صدر کو جو معلومات درکار ہوں وہ ہم بسا اوقات فوری نوٹس پر فراہم نہیں کر سکتے تو روزانہ ایک مکمل سکیپ کاغذوں پر مشتمل رپورٹ صدر کے لیے تیار کی جاتی تھی جسے ہم "پی ڈی بی" کہتے ہیں۔ سی آئی اے کے غیر ملکی جاسوسی آپریشنز میں چرچ کمیٹی اکثر آڑے آتی تھی۔ اس سے پہلے عموماً کوئی بھی آپریشن بحث کے لیے کمیٹی کے سامنے پیش ہوتا تھا جس کے بعد اس پر بحث کا لمبا سلسلہ چلتا اور عمل درآمد کی نوبت آنے تک معاملہ کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ ۷۶ میں سی آئی اے نے کچھ خصوصی اختیارات اس سلسلے میں حاصل کیے تھے جب میں نے ۷۷ میں چارج سنبھالا تو محسوس کیا کہ ابھی حالات ہماری توقعات کے مطابق کام کرنے کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ میں نے اسی سلسلے میں کچھ اور پیش رفت مناسب جانی اور اب اسی نوعیت کے معاملات ہم صدر کے سامنے رکھتے تھے۔ اس سے پہلے یہ معاملہ نیشنل سیکورٹی کونسل میں زیر بحث آتا تھا۔

ان دنوں میرے سامنے ایک ایسا ہی کیس رکھا گیا۔ ہماری ایک غیر ملکی جاسوس برانچ کا سربراہ پیٹر بروک ایک ملک میں اسلحہ کی بڑی کھیپ کی غیر قانونی ترسیل کا تقاضا کر رہا تھا۔ اس نے چارٹس اور دیگر دستاویزات کی مدد سے آپریشن کے لیے مجھے قریباً قائل کر لیا تھا لیکن وہی قباحت آڑے آ رہی تھی کہ ہم اس معاملے کو بحث کے لیے نیشنل سیکورٹی کونسل کے سامنے پیش کریں جس کی منظوری کے بعد بات آگے بڑھے۔

میں نے اس معاملے کو براہ راست صدر کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں ایک بات مجھے ضرور کہنی ہے کہ اکثر سی آئی اے کے معاملات سے متعلق معلومات کا افشا وائٹ ہاؤس سے ہی ہوا کرتا تھا۔ اس میں صدر کا ذاتی سٹاف پیش پیش رہتا تھا۔ دراصل صدر کے ماتحتوں کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ ان کے ہاتھ کوئی ایسا راز لگ جائے جس سے صدر کی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہو اور وہ اس کا پہلے سے تدارک کر سکیں۔ صدر کارٹر کے لیے بھی دنیا کے دیگر صدور کی طرح اپنے ذاتی سٹاف کو ایک خاص ڈسپلن کے تابع رکھنا ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کچھ ہو رہا ہے میری یہ عادت تھی کہ مخصوص معاملات پر کبھی ضرورت سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا تھا اور اس گفتگو میں بھی صدر، نائب صدر، نیشنل سیکورٹی کونسل کے سربراہ موجود ہوتے تھے۔

میں نے پیٹ والے معاملہ پر نیشنل سیکورٹی کونسل کے ممبران برزنسکی، ہیرالڈ براؤن اور سائرس وینس سے الگ الگ اور مشترکہ میٹنگوں میں بات کی۔ قدرتی طور پر وینس کی خواہش یہ جاننے کی تھی کہ اس آپریشن کے عوض ہمیں سفارتی سطح پر کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ برزنسکی باقی تمام تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی تشفی کے لیے پیٹ سے اس کی علیحدہ ملاقات کا بندوبست بھی کر دیا جس میں پیٹ نے اسے مرحلہ وار تمام تفاصیل سے آگاہ کر دیا جس کے بعد مزید تفصیلات کی گنجائش باقی رہ ہی نہیں جاتی تھی۔ کونسل نے مطمئن ہونے کے بعد آپریشن کی اجازت دے دی۔ پیٹ اس ملک میں پہنچ گیا۔ ہم نے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ عمل درآمد کے دن تک ہمارے درمیان کھچاؤ میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا مجھے آپریشن کے آغاز اور اختتام کے بالکل صحیح وقت کا علم تھا۔ ہم ایک ایک لمحے سے باخبر تھے

منصوبے کے خاتمے سے چند ہی منٹ بعد ہمیں ایک انتہائی اہم پیغام موصول ہوا۔

"ہم گرفت میں تو نہیں آئے لیکن آپریشن کامیاب نہیں رہا" پیغام کا پہلا حصہ میرے لیے باعث تسلی تھا۔ دوسرا حصہ انتہائی پریشان کن۔

پٹ واپس آیا اور اس نے منصوبے کی ناکامی کی وجوہات بیان کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ خوش قسمتی سے ہمارا راز محفوظ رہا اور کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ اس معاملے میں سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہم دوبارہ کوشش کریں تو صد فی صد کامیابی ہو سکتی ہے پٹ میرا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں دوبارہ معاملہ کونسل میں لے گیا جس کی منظوری بھی مل گئی۔ ہماری دوسری کوشش کامیاب رہی اور آپریشن توقعات کے عین مطابق انجام پا گیا۔

اکتوبر ۸۰ء میں کانگریس نے نیشنل سیکورٹی ایکٹ ۱۹۴۷ء میں ایک ترمیم کا بل پاس کر دیا جس کی رو سے ہر انٹیلی جنس ایجنسی کے سربراہ کے لیے یہ ضروری قرار پایا کہ انٹیلی جنس کمیٹی کو تازہ ترین جاسوسی سرگرمیوں سے مکمل طور پر باخبر رکھے۔ انٹیلی جنس کمیٹی کو ہر دم تازہ ترین معلومات سے باخبر رکھنا ناممکن تھا کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کسی بھی ڈی سی آئی اور انٹیلی جنس کمیٹی کے درمیان یہ معاملہ ہمیشہ متنازعہ رہا ہے کہ کمیٹی کو کس حد تک معاملات سے باخبر رکھا جائے۔

جب میں نے عہدہ سنبھالا تو میرے اور کمیٹی کے درمیان یہی مسئلہ زیر بحث آیا کہ انٹیلی جنس کمیٹی کو کس حد تک کوئی معلومات درکار ہے اور متعلقہ اطلاعات کا کتنا حصہ کمیٹی کے علم میں لانے سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان جلد ہی ایک سمجھوتہ طے پا گیا جس کی رو سے پہلی بات تو یہ تھی کہ سی آئی اے کبھی اپنے ایجنٹ کی پہچان ظاہر نہیں کرے گی۔ پاؤل ہڈ جسے میں نے ۱۹۷۸ء میں کاؤنٹر انٹیلی جنس میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا نے پہلے رپورٹ دی کہ ایک ہمارا سینئر آفیسر جسے ہم نے کسی ملک میں سٹیشن چیف مقرر کیا تھا مشتبہ ہے۔ پاؤل کا کہنا تھا کہ اس شخص نے کے جی بی سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور ان کے لیے کام کر رہا ہے اس سلسلے میں اس نے کچھ شواہد بھی فراہم کئے تھے میرے لیے فوری طور پر اس شخص کو سبکدوش کر دینے کے بارے میں اختیارات موجود تھے کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ایسا ایک خاص

اختیار ڈی سی آئی کو مل چکا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کم از کم ہمیں یہ تو اندازہ ہونا چاہیے کہ اگر متعلقہ شخص واقعی "ڈبل کراس" ہے تو اس نے کس حد تک ملکی سلامتی سے متعلق اطلاعات کے جی بی کو فراہم کر دی ہیں اور ہم اس نقصان کا ازالہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے باقاعدہ ایک منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت پاؤل نے مشتبہ سٹیشن آفیسر تک کچھ اہم اطلاعات پہنچائیں۔ یہ اطلاعات اس نوعیت کی تھیں جن کو حاصل کرنے میں کے جی بی بہت سرگرم رہتی تھی ہمیں امید تھی کہ اب ہمارا مشتبہ آدمی ان اطلاعات کو اپنے کے جی بی کے کسی آفیسر تک پہنچانے کے لیے اس سے ملاقات کرے گا۔ اور ہم نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

ہم نے بڑی مہارت سے اس کے گرد جال بنا تھا۔ سٹیشن چیف درجہ بدرجہ ہماری توقعات پر پورا اتر رہا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی تک ہمیں اس کے خلاف کسی غیر ملکی طاقت سے ملاپ کا ثبوت نہیں ملا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا میں یقین کر لوں کہ ہماری اطلاعات اس کے متعلق غلط تھیں۔ یا وہ شخص ہماری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا یا ہمارا نظام احتساب اتنا کمزور ہے کہ ہم آستین کے سانپوں کو بے نقاب نہیں کر سکتے؟ کیا ہمارا چیک سسٹم ناقص ہے۔ بہت سے ایسے سوالات پیدا ہوتے تھے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کیا میں اس شخص کو بے گناہ تصور کر لوں یا پھر اس کی آزمائش کے لیے ایک اور جال اس پر پھینکا جائے کیا یہ ممکن تھا کہ میں دوبارہ اٹارنی جنرل کو اس بات کا قائل کر سکوں کہ ہم اس مشتبہ شخص کو غیر ملکی طاقت کا ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے ایک اور چال چلنے والے ہیں اور اس طرح کچھ اور ملکی راز داؤ پر لگا دیئے جائیں۔

ثبوت نہ ملنے کی صورت میں ہم اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ اور خواہ مخواہ تحقیقات کے ضمن میں متعلقہ شخص ہمیں عدالت میں گھسیٹ سکتا تھا میں نے اس ضمن میں فوری طور پر یہ احکامات دیئے کہ اگر آئندہ کسی شخص کو مشتبہ خیال کیا تو اس کے خلاف تحقیقات اس کی ذاتی فائل میں نہ رکھی جائیں اور اس سلسلے میں ایک الگ

فائل کھولی جائے اسے "مستقل زیر نگرانی" رکھا جائے اور اگر دوبارہ کبھی تحقیقات کی ضرورت پیش آئے تو اس کی الگ فائل ہی کھولی جائے۔ کاؤنٹر انٹیلی جنس کے سلسلے میں پیش آنے والی قانونی پیچیدگیوں کی یہ ایک مثال ہے۔ جس سے آپ ہماری مشکلات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری حریف کے جی بی کو اس ضمن میں کسی تردد کا سامنا نہیں ہوتا نہ انہیں کاؤنٹر انٹیلی جنس کے لیے کسی قانونی دشواری کا سامنا ہے نہ کوئی عدالتی حکم اس راستے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

برقی جاسوسی کے ضمن میں بھی ہماری کاؤنٹر انٹیلی جنس کو کے جی بی پر ابھی برتری حاصل نہیں تھی ہم نے ۱۹۷۰ء میں ماسکو کی اطلاع پر روسیوں کی طرف سے امریکن ایمبیسی ماسکو میں خفیہ جگہوں پر نصب کردہ ۵۲ مائیکروفون برآمد کئے تھے۔ ہمیں اچھی طرح علم تھا کہ روسیوں نے ہمارے سفارت خانے پر برقی جاسوسی آلات کی بمباری کی ہوئی ہوتی ہے اور یہ سلسلہ کم و بیش ۲۰ سال سے جاری تھا۔

۱۹۷۸ء میں جب ماسکو میں ہمارے سفارت خانے کے ایک حصے میں آگ لگی تو مرمت کے دوران ہمارے سکیورٹی کے ایک ہوشیار آدمی نے دیکھا کہ ملحقہ عمارت کی ایک چمنی ہماری طرف جھکی ہوئی ہے۔ اس چمنی کا جائزہ لیا گیا تو اس میں تاروں کا ایک وسیع سلسلہ موجود تھا۔ اس چمنی میں روسیوں نے انٹینا نصب کر رکھا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ہمارے ایمبیسی میں سگنلز بھیجتے تھے جن کے ذریعے اندر ہونے والی گفتگو سنی جاتی تھی۔

ہمارا یہ آدمی چمنی سے داخل ہو گیا اور اندر ہی اندر سفر کرتا ہوا اوپر والے کمرے تک جا پہنچا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا یہاں تو برقی آلات کا مکمل گورکھ دھندہ پھیلا ہوا تھا اس چھوٹے سے کمرے سے وہ ایک سرنگ میں داخل ہوا جس کے آخری کونے پر اسے ایک روسی فلش لائٹ چمکاتا نظر آیا خوش قسمتی سے یہاں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ ہمارا آدمی بخیریت واپس لوٹ آیا۔ ہم نے اس صورت حال پر ایک پریس ریلیز جاری کی اور حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس پریس ریلیز کو اخبارات نے معمولی سی کوریج دی تھی۔ پریس ریلیز کے دوسرے دن ہمارے پاس روسی دفتر خارجہ کا احتجاج ضرور پہنچ گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم نے روسی قوانین

کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لیز پر حاصل کردہ عمارت کی چمنی کو توڑا ہے۔

ہمیں علم تھا کہ روسی اس نوعیت کے برقی آلات کے ذریعے امریکہ کے اندر کی خبریں بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً نیو یارک میں اپنی ایمبیسی میں انہوں نے ایسے آلات نصب کر رکھے تھے جن کے ذریعہ وہ سان فرانسسکو، شکاگو تک ڈومیسٹک ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو بھی اپنے مائیکروویو نظام پر سن سکتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے کیوبا کے شمال مغرب میں ایک طاقتور انٹینا نصب کر رکھا ہے جس کے ذریعے وہ امریکہ سے دوسرے ممالک میں ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو سٹلائٹ سسٹم کے ذریعے سن لیتے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ٹیلی فون پر سکیورٹی سے متعلق گفتگو کرنے کی روایت عام ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو کانگریس نے ایک بل پاس کیا جس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں۔

"اس ایکٹ کی رو سے سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی اور وزارت دفاع کو نکاراگوا کی حکومت کے خلاف باغیوں کو مسلح کرنے، ان کی معاونت کرنے، انہیں تربیت دینے، ہتھیار سپلائی کرنے یا کسی کو انفرادی حیثیت میں امداد دینے کے لیے فنڈز مہیا نہیں کیے جائیں گے۔"

صرف ایک سال بعد سی آئی اے نے اس بل کی محرک کمیٹی کو مطلع کیا کہ ہم نکاراگوا کی حکومت کے خلاف پانچ سو باغی گوریلوں کے ایک گروپ کو مسلح کر رہے ہیں۔ اس بریفنگ کے خاتمے پر کمیٹی کے سربراہ مسٹر بولانڈ نے فوراً ڈی سی آئی کیسی کو ایک احتجاجی مراسلہ لکھ دیا جس میں سی آئی اے کے اس ایکشن پر زبردست تنقید کی گئی تھی۔ ہمیں یہ تو علم نہیں کیسی نے اس پر کیا ردعمل ظاہر کیا تھا لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ سی آئی اے نے اس منصوبے پر عمل ضرور کیا اور کسی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا پروگرام نہیں بدلا بلکہ بعد میں اس آپریشن کا دائرہ بیس گنا بڑھا دیا گیا اور سی آئی اے نے نکاراگوا کے خلاف دس ہزار مسلح گوریلوں کو متحرک کر دیا۔ بولانڈ کو شروع میں ہی حقیقت سے بے خبر رکھا گیا اور یہی بتایا گیا کہ ہم ایک چھوٹے گروپ کو متحرک کر رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

ایک انٹیلی جنس کمیٹی کے سربراہ کو جب ایسی صورت حال کا سامنا ہو تو سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ وہ پھر کیا کرے؟ جب اس معاملے پر بحث شروع ہوئی تو سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر شلز نے کہا کہ ہم نکاراگوا کے خلاف گوریلوں کو مسلح نہیں کر رہے بلکہ یہ امداد السلواڈور کو دے رہے ہیں تاکہ وہ اپنا دفاع مضبوط کر سکے لیکن جب اسلحے کی ایک بڑی کھیپ جو باغیوں کو جا رہی تھی پکڑی گئی تو شلز نے کہا ہمارا مقصد یہ ہے کہ نکاراگوا کے انقلاب کو السلواڈور میں منتقل ہونے سے روکا جائے اور اس کے خلاف برسرپیکار قوتوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ کانگریس نے اس پر واویلا کیا کہ حکومت کی طرف سے معزز اراکین کو غلط اطلاعات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ بولنڈ کی طرف سے متعدد مرتبہ حکومت کو تنبیہ کی گئی کہ وہ "کونٹرا باغیوں" کو اسلحہ کی سپلائی بند کرے۔

۱۹۸۲ء میں مجبور ہو کر چیئرمین بولنڈ کو یہ کہنا پڑا: "سی آئی اے ایک بپھرا ہوا ہاتھی ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے"۔

جب نکاراگوا سے متعلق حقائق سامنے آئے تو کانگریس کی طرف سے کہا گیا کہ ۸۰ء کے پاس شدہ ایکٹ کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ولیم کیسی سے کہا گیا کہ وہ سب سے پہلے تو گولڈ واٹر کمیٹی کے سامنے پیش ہو اور اپنے اس عمل پر معافی مانگے اس کے بعد وہ وعدہ کرے کہ آئندہ سے رولز کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ سینیٹر ولیم ہڈلسٹن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم نے آج تک اس معاملے کو ڈھیل دے رکھی تھی لیکن اب یوں دکھائی پڑتا ہے کہ سی آئی اے کی طنابیں کھینچنی پڑیں گی اور ہم کوئی چور دروازہ کھلا نہیں چھوڑیں گے۔

آخر اس اپوزیشن کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آخر کونٹرا باغیوں نے نکاراگوا میں کسی دوسرے ملک کی مداخلت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ اسی صورت حال نے عام امریکیوں کے ذہن میں کئی پریشان کن سوالات پیدا کر دیئے تھے۔ ہمارا یہ اصول رہا ہے کہ ہم اپنے سنٹرل امریکہ کے ہمسایوں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتے لیکن یہاں صورت حال اس کے متضاد تھی۔ دنیا نے دیکھا کہ ہم نے نکاراگوا کے خلاف کسی اعلان کے بغیر جنگ کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی اور اس کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس

مشرقی یورپ کے ممالک میں کھلم کھلا مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہے؟ امریکی عوام کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ہم روس کو اس نوعیت کی کارروائیوں سے کس طرح منع کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ تھی کہ سات ماہ پہلے ہم اس نوعیت کے ایک ایکشن کی زبردست مذمت کر چکے تھے جیسا کہ ہم اب نکاراگوا میں کر رہے تھے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ۲۴۱ امریکن میرین بیروت میں ایک ٹرک بم کے دھماکے میں مارے گئے تھے۔ یہ ٹرک ان کی بیرک سے ٹکرا کر تباہ ہوا تھا۔ ہم نے اسے "حکومتی سطح کی دہشت پسندانہ کارروائی" کہا تھا اور اس کے لیے شام اور ایران کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ ہمارے آپریشن کی نوعیت ایسی تھی کہ بندرگاہ میں بارودی سرنگیں بچھائی تھیں۔ اس کارروائی کے نتیجے میں جو جہاز ران مارے گئے تھے ان کی موت کے ذمہ دار "کونٹرا باغی" تھے اور یہ بھی ایک نوعیت کی حکومتی سطح کی دہشت گردی تھی"۔

اس حادثے کے بعد اس مسئلے نے اتنا طول پکڑا کہ پھر ولیم کیسی کو نہ صرف معافی مانگنا پڑی بلکہ اس نے سی آئی اے کے پانچ نچلے درجے کے افسران کو معطل بھی کر دیا ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا۔ اس "خفیہ آپریشن" کے قابو سے باہر ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ کونٹرا باغیوں کے اپنے مقاصد اور طریق کار ہے اور ہم اس نوعیت کی صورت حال میں ایک خاص حد تک ہی ان لوگوں پر کنٹرول کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں نکاراگوا کے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک کے حالات کا موازنہ ۱۹۵۳ء کے ایران یا ۱۹۵۴ء کی گوئٹے مالا کی صورت حال سے نہیں کیا جا سکتا جہاں سیاسی صورت حال بتدریج تبدیلی کا تقاضا کر رہی تھی۔ نکاراگوا میں بہت سے لوگ "سینڈنسٹا" حکومت سے نالاں تھے لیکن ۱۹۷۹ء کی سی صورت حال کا وقوع پذیر ہونا دور کی بات تھی۔ تب سی آئی اے نے ایک ایسا مشن انجام دینا چاہا جو ان حالات میں ناممکن تھا اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بالآخر انہیں کونٹرا باغیوں کی بھرتی کرنا پڑی۔ جس کے بعد انہوں نے باغیوں کو بارودی سرنگیں سپلائی کیں جنہوں نے تباہی پھیلائی اور قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی اجازت سی آئی اے کو نہیں تھی"۔

سی آئی اے کو صرف خفیہ آپریشن کرنے کی اجازت ہے۔ ہم کھلی جنگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس صورت حال سے نمٹنا فوج اور اس کے متعلقہ اداروں کی ذمہ داری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپریشن کی نگرانی کرنے والوں نے صدر کی ان ہدایات کو نظرانداز کیا اور اپنی حدود سے تجاوز کر گئے۔ ریگن انتظامیہ کے سامنے ولیم کیسی نے اکتوبر ۱۹۸۴ء میں جو بیان دیا تھا ممکن ہے اس کی لفاظی نے اس کے حاضرین کو متاثر کیا ہو لیکن میرے خیال میں وہ بالکل لایعنی اور کسی حد تک خطرناک تھی۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے ریگن کی ٹیم کو عوام کی عدالت میں مباحثے کے لیے لاکھڑا کر دیا اور ہماری انٹیلی جنس کے مستقبل کے لیے خدشات بھی پیدا کر دیئے۔

ریگن کا انٹیلی جنس طریقہ کار دوسری جنگ عظیم والی او ایس ایس جیسا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں او ایس ایس کا طریق کار کامیاب تھا لیکن وہ زمانہ جنگ تھا آج ۸۰ء میں زمانہ امن کے حالات میں ہم اس طریقہ کار کو نہیں اپنا سکتے ریگن اور کیسی کی دانست نے کمال کی کا مظاہرہ کیا اس کا اظہار ہگز ریان ترمیم میں لکھے اس جملے سے ہوتا ہے جس کے مطابق "کوئی بھی خفیہ آپریشن ہو اس میں قومی تحفظات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔

ایک روز مجھے صدر جمی کارٹر نے اپنے پاس طلب کیا اور بیٹھتے ہی مجھ سے کہا۔ "سٹین! تمہارے پاس جدید تکنیکی نظام موجود ہے میں جنگ سے متعلق کچھ فوٹوگرافس دیکھنا چاہتا ہوں" صدر کی یہ عام سی درخواست ایک نئی بحث کی بنیاد رکھ گئی۔

ان دنوں تیسری دنیا کے دو ممالک کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور صدر نے اس کی تصاویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں جانتا تھا صدر امریکہ کو اس جنگ کی تصاویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پس پردہ کوئی اور بات ہے۔ دراصل صدر اس طرح میری استعداد کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اپنے دفتر واپس لوٹا میں نے ہینک نوچی کو طلب کیا اور اسے صدر کی خواہش سے آگاہ کر دیا میں نے یہ معمول کی کارروائی جان کر کیا اور کسی قسم کی

ہنگامی صورت حال کا اعلان نہیں کیا کیونکہ صدر نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے فوری اس پر عمل ہو۔ نوچی نے مجھے کہا صدر کی یہ خواہش ہمارے لیے کیک کا ٹکڑا ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے لیے یہ بالکل معمولی کام ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ صدر کے ساتھ میری اگلی ملاقات تین روز بعد ہونے والی تھی اور میں اس ملاقات پر تصاویر سے مسلح ہو کر جانا چاہتا تھا۔ ملاقات سے ایک روز پہلے میں نے ہینک سے تصاویر کے متعلق دریافت کیا۔

"ہمارا اسٹلائٹ سسٹم متعلقہ تصاویر حاصل نہیں کر سکا سٹین! دراصل جنگ ایک چھوٹے سے علاقے میں ہو رہی ہے اور ہم ابھی تک اس مخصوص علاقے میں جہاں لڑائی جاری ہے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔"

میں نے اگلے روز صدر سے معذرت کی اور یہ وعدہ کیا کہ تین روز بعد ہونے والی ملاقات میں ہم ضرور اس خواہش کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔ واپسی پر میں نے اگلے روز سی آئی اے کے اعلیٰ افسران کی جنرل میٹنگ میں یہ مسئلہ رکھا اس میٹنگ میں تمام شعبوں کے سربراہ موجود تھے۔ میں نے اس مسئلے کو ایک چیلنج بنا کر ان کے سامنے پیش کیا لیکن میں حیران رہ گیا جب مجھے جواب ملا۔

"ابھی نہیں!"

میں نے اس پر تاسف کا اظہار کیا اور اسے متعلقہ لوگوں کی نااہلی سے تعبیر کیا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سی آئی اے کے چیف کی حیثیت سے میری عزت نفس داؤ پر لگ جائے اگر انٹیلی جنس کا شعبہ یہ کام نہیں کر سکتا تو جاسوسی کا شعبہ یہ کام کرے۔ اس پر جاسوسی برانچ کے سربراہ بل ایلس نے مجھے کہا کہ ہم جس طرح کے فوٹوگرافس چاہتے ہیں اس کے آدمی ان کا بندوبست کر سکتے ہیں۔

"کیسے؟" میں نے دریافت کیا۔

منصوبہ کچھ یوں تھا کہ ہم متحارب ممالک میں سے کسی ایک سے ایک پائلٹ کی خدمات حاصل کرتے، ایک چھوٹا جہاز حاصل کرتے۔ اسے کیمرہ اور معمولی سی تربیت

چمڑے کا ایک تھیلا تھا۔ جس میں شاید اس کے کپڑے تھے۔

دوسرا ایک اُدھیڑ عمر کا مرد تھا۔ بس اُنہیں اُتار کر آگے نکل گئی اور نزدیک ہی آگے اڈے پر جا کر کھڑی ہو گئی جو وہاں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ نوجوان جب ایک طرف بڑھنے لگا تو اس بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے کچاں والی جانا ہے، کدھر کو جاؤں ؟

نوجوان نے ہاتھ سے اپنے سامنے نزدیک ہی ایک گاؤں کی طرف اشارہ کر دیا۔

بوڑھا پھر بولا۔

یہ دوسرے گاؤں کون کون سے ہیں ؟

اس نے پھر جواب دیا۔

یہ تو سگر ہے اور اس سے آگے بس نہیں جاتی۔ دائیں طرف جو تین گاؤں دکھائی دے رہے ہیں یہ جون پور۔ نخود لتی اور چیرا ہیں اور یہ بائیں طرف بدر۔ چاندی کوٹ۔ مہیرالہ۔ جابانی اور آدم پور ہیں اور سگر کے اس طرف جوگی کوٹ، کچاں والی اور مرالہ ہیں۔

تم کہاں جاؤ گے ؟

میں نے سگر ہی میں جانا ہے۔

تو پھر یہاں کیوں اُترے ہو اڈے پر اُتر جاتے۔

وہاں اس وقت بانی کھڑا ہو گا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ یہیں اُتر جاؤں۔ بس والے یہاں بس روکتے تو نہیں پر وہ میرے جاننے والے ہیں۔

اس لیے روک دی ہے۔

میں تو تمہیں دیکھ کر یہاں اُتر گیا تھا۔ اب میں یہاں سے ہی سگر کے باہر باہر نکل جاؤں یا اڈے سے کوئی راستہ جاتا ہے۔

اڈے ہی چلے جاؤ وہاں سے ایک کچی سڑک کچاں والا کی طرف جاتی ہے جو آگے جا کر دریا کے کنارے کنارے پہاڑ کی جانب نکل گئی ہے۔

دریائے چناب یہاں سے کتنی دور ہے ؟

بس ایک میل۔

اور کچاں والا ؟

آدھا میل۔ تم شاید پہلے کبھی اِدھر نہیں آئے۔

ہاں، پہلی بار ہی آیا ہوں۔

کس کے ہاں جاؤ گے ؟

جاؤں گا تو کسی کے ہاں نہیں۔ تمباکو کا بیوپار کرتا ہوں، وہاں سے تمباکو خریدوں گا۔ اس گاؤں کا تمباکو اچھا ہوتا ہے۔

بوڑھا اڈے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نوجوان ایک کچے راستے سے جس پر پانی کھڑا ہوا تھا گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی چادر اور قمیض بُری طرح بھیگی ہوئی تھی اور بوٹوں پر خوب کیچڑ لگی ہوئی تھی۔

گاؤں سے باہر ہی وہ ایک حویلی کے سامنے رُک گیا۔ وہاں شاید کوئی آٹا پیسنے کی مشین۔ کیونکہ چھت پر دھواں نکلنے کا لمبا سا سلنڈر تھا اور اس

ایک طرف تو یہ تین محاذ کھلے تھے دوسری طرف اس درمیان میں اپنے شعبہ تکنیک برائے حصول اطلاعات سے معاملہ نمٹا رہا تھا۔ ان کے علاوہ اطلاعات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہی رہ جاتا ہے کہ ہم آرمی کے ریڈیو سے نشر ہونے والے سگنل پکڑنے کی کوشش کریں یا وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے احکامات کا جائزہ لیں۔ ان سگنلز کے ذریعے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ متحارب گروپس جنگ سے متعلق کیا حکمت عملی اختیار کر رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے نیشنل سیکورٹی ایجنسی جو برقی تکنیک آلات برائے بلاغ کی زیادہ تر نگرانی کرتی ہے کی ایک "خفیہ سروس پوسٹ" میدان جنگ کے نزدیک موجود تھی۔

اتفاق سے یہ جنگ ان دنوں شروع ہی ہوئی تھی جب مجھے صدر نے مطلوبہ حکم سنایا۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ ہم این ایس اے کے اس انٹرسیپٹنگ شارٹ رینج ریڈیو کو میدان جنگ کے نزدیک ترین لے جائیں اور ان کی ایک ٹیم وہاں جا کر سگنلز موصول کرے۔ گو کہ یہ ایک معمولی نوعیت کے کام کے لیے ایک لٹکا دینے والا تجربہ تھا۔ لیکن مجھے بہر صورت اس تجربے سے گزرنا پڑا۔

ٹیکنالوجی نے جاسوسی کی قیمت اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ تجزیہ نگار اگر ایک طرف متعلقہ ڈاٹا پروگرام، تازہ ترین اطلاعات وغیرہ سے باخبر رہنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا تجزیہ سائنسی بنیادوں پہ صحیح ثابت ہو تو دوسری طرف ان کی یہ خواہش بھی رہتی ہے کہ متعلقہ پروگرام حاصل کر کے ان تک پہنچانے والی تمام ایجنسیاں اس ضمن میں ہونے والی معمولی تبدیلی سے بھی انہیں بروقت آگاہ کریں۔ اس سلسلے میں دقت بھی پیش آتی ہے اور عین ممکن ہے کہ کسی ایک کی کوتاہی کا ذمہ دار بھی سی آئی اے کو ہی ٹھہرا دیا جائے۔

ایسی بدقسمتی کا ایک بہترین نمونہ ۱۹۷۹ء کے موسم گرما کے واقعات ہیں میرے دور ملازمت میں یہ انٹیلی جنس کی ناکامی کا بدنما دھبا جو مجھ پر لگا۔ ہماری اس قدر میں شاہ ایران سے متعلق معلومات بروقت حاصل نہ کر لینے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان

دنوں کیوبا میں روس کے فوجی دستوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور ہماری زیادہ توجہ اس طرف مبذول تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایران میں ہم ناکام رہے۔ ہم شاہ ایران کے زوال سے چھ یا سات ماہ پہلے اس کے زوال کی پیشگوئی کرنے میں ناکام رہے۔ ہماری توجہ زیادہ تر سالٹ II معاہدے پر لگی تھی اور کیوبا میں روسی فوجوں کی آمد سے اس معاہدے پر کسی بھی طرح کے اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔

جون ۷۹ء میں صدر کارٹر اور بریژنیف کی ملاقات ہوئی جس میں سالٹ II معاہدہ طے پا گیا۔ ۱۸ جولائی کو جب امریکی سینٹ میں اس معاہدے کے محرکات پر بحث ہو رہی تھی تو "واشنگٹن سٹار" نے لکھا کہ روسی فوجوں کی کیوبا میں موجودگی اس مسئلے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش ہے جو ۶۲ء میں کیوبا میں میزائل نصب کرنے سے متعلق پیش آیا تھا۔

صورتحال یہ تھی کہ اگر روسی ایک پرانے معاہدے پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں تو سینٹ ایک نئے معاہدے کی منظوری کس طرح دے سکتی تھی۔ جن دنوں سالٹ II طے پا رہا تھا انہی ایام میں دسمبر ۷۹ء میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں اور معاہدہ صحیح طور پر نہ طے پا سکا۔ دکھائی بھی پڑتا تھا کہ اب بدقسمتی کا یہ سلسلہ طویل ہوتا چلا جائے گا۔ واقعات کی مختلف کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط تھیں۔ اس سلسلے کا آغاز ۱۹۷۹ء کے موسم بہار سے ہوتا ہے جب برزنسکی کی طرف سے تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کو ہدایت جاری ہوئی کہ کیوبا میں روسی فوج کی نقل و حرکت کا سخت نوٹس لیا جائے اور اس پر کڑی نظر رکھی جائے۔ وہ روس اور کیوبا کی مشترکہ افواج کی طرف سے سنٹرل امریکہ میں بڑھتی ہوئی مداخلت پر متفکر تھا۔ بس نے تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کو مزید متحرک ہونے کی ہدایت کی جس پر صوبائی نیشنل سیکورٹی ایجنسی ایک پرانی لیکن نئی اطلاع کے ساتھ موجود تھی۔

بہانا کیا تھا؟ ہماری فائلوں میں دبا ایک مسئلہ جس کے مطابق روسی کیوبا میں ایک نیا بریگیڈ تیار کر رہے تھے لیکن یہ خبر متنازعہ حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ مختلف ایجنسیوں کی اس پر متضاد رائے تھی۔ اب نیا پن یہ آیا تھا کہ این ایس اے نے مختلف

تم کیوں فکر کرتے ہو۔ چُپ کر کے گھر بیٹھے رہو، کوئی ضرورت نہیں ہے دھکے کھانے کی۔

پھر وہ کشور سے مخاطب ہوا۔

کشور!

جی باپو!

چلم ہی بھر دو بیٹی!

سلیم نے سجاد کو نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

تم رہنے دو بھابی! مَیں خود بھر دیتا ہوں۔

گلشن بھی کھڑی ہو گئی۔

مَیں حقہ بھر دیتی ہوں کشور! تم سلیم کو کپڑے نکال کر دو۔ اس کی پتلون قمیض دیکھو کیسے بھیگ رہی ہیں۔

گلشن حقہ بھرنے لگی۔ کشور اندر سے کپڑے لے آئی اور سلیم کو تھما دیے۔

چلو بدلو کپڑے!

سلیم نے چُپ چاپ کپڑے بدل لیے۔ بوٹ اُتار کر اس نے چپل پہن لی۔ کشور اس کے بوٹ اُٹھا کر باہر لے جانے لگی۔

پڑے رہنے دو بھابی! مَیں صاف کر دیتا ہوں۔

نہیں، مَیں دھو دیتی ہوں۔ وہ نل کی طرف بڑھی۔

سلیم نے اُٹھ کر بوٹ پکڑ لیے۔

کیوں گناہ گار کرتی ہو بھابی!

کشور نے بڑے پیار سے کہا۔

'چھوڑو نا مَیں دھو دیتی ہوں'

سلیم نہ مانا۔

'اونہوں۔ یہ میرا کام ہے۔'

غفور بھی بولا۔

دھونے دو سلیم۔

یہ کام میرا ہے باپو!

ضد نہ کیا کرو بیٹا!

سلیم نے بوٹ چھوڑ دیے اور کشور نل پر آئی۔ خوب اچھی طرح بوٹ صاف کر کے اس نے برآمدے میں ایک طرف رکھ دیے۔

گلشن چلم بھرنے کے بعد پھر آٹا چھاننے لگی۔ سلیم نے اس سے پوچھا۔

'بھیا کہاں ہیں ماں!

گلشن نے چھلنی جھاڑتے ہوئے کہا۔

'چارہ لینے گیا ہے بیٹے!'

'کس وقت گیا ہے؟'

'بس تمہارے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے۔'

سلیم کھڑا ہو گیا۔

'میں بھی جاتا ہوں پھر۔'

'کھانا تو کھا لو نا۔' کشور نے اسے ٹوکا۔

آج کی دنیا میں معاشی تحفظات اور برتری کی جو دوڑ لگی ہے اور جس طرح ٹیکنالوجی نے زور پکڑا ہے میرے خیال سے ان حالات میں ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم اپنی "معاشی انٹیلی جنس" کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اپنے ایجی پر دگرا متعلق زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔

سی آئی اے کے ڈی سی آئی کو تجزیہ سازوں پر خصوصی توجہ دینا ہو گی اور کیر کے بجائے کوالٹی کا اپنا اصول بنانا پڑے گا۔ ہمیں اطلاعات کی تجزیہ کاری میں قلیل الم کے بجائے طویل المدت منصوبہ سازی کرنا ہو گی۔ سوویت ملٹری پاور کا مسلسل تجزیہ ہے۔ اس پر ہر لمحہ نظر رکھنی ہو گی۔ ملیشیا، پاکستان، ایران، انڈونیشیا، نائجیریا، سعودی ارجنٹائن، برازیل، میکسیکو، مراکو اور جنوبی کوریا ان ممالک سے ہمارے بہت سے مفا وابستہ ہیں۔ ان میں سے ہر ملک کے حالات کا تجزیہ کرنے کے لیے سی آئی اے کو ہر ملک کے لیے ایک الگ تجزیہ نگاروں کا گروپ ترتیب دینا ہو گا۔ جو ان ممالک کے لوگوں زبان اور روایات پر مکمل دسترس رکھتے ہوں۔

ہمیں معاشی تجزیہ کاروں کی ضرورت ہے۔ ہمارے طرز زندگی کے لیے بین الا سطح پر خدشات جنم لیتے رہتے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ خیال سے سی آئی اے کی مزید بہتری کے لیے ڈی سی آئی کے رول کو سی آئی اے کے سر کے رول سے الگ کرنا ضروری ہے۔ جاسوسی اور تجزیاتی شعبہ جات کو ایک ہی شعبے ختم کر دینا چاہیے۔ ڈی سی آئی کو نیشنل سیکورٹی ایجنسی پر انحصار ہونا چاہیے۔ ڈیفنس جنس ایجنسی کی مدد کر کے اس کے معیار تجزیہ کاری کو بلند کرنا ہو گا۔

ہمیں اس امر پر کڑی نظر رکھنا ہو گی کہ ہمارے اہم اطلاعات کہاں سے جاتی ہیں۔ ان چور دروازوں پر کڑی نظر رکھنا ضروری ہے۔ انٹیلی جنس برادری کے بنیادی اصولوں پر مبنی ایک چارٹ بنانا ضروری ہے۔ دیگر ممالک میں خفیہ آپریشن انحصار کم کرنا چاہیے اور ڈی سی آئی کی سیاسی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔

ہماری انٹیلی جنس کا کردار ایسا ہونا چاہیے کہ ہمیں اپنے ملکی تحفظ کے

انسانیت کی بقا بھی عزیز ہے۔ دنیا میں جمہوری اقدار کا فروغ ہمارا مقصد ہونا چاہیے ہمیں اپنے جاسوسی نظام کو ایسے خطوط پر مرتب کرنا ہو گا کہ دنیا میں جمہوری اقدام کی عظمت کا بول بالا ہو۔ یہی ہمارا نصب العین اور یہی ہمارا مطمح نظر ہے

پاکستانیات

میجر جنرل ریٹائرڈ ممتاز علی راجہ کا تعلق پنجاب رجمنٹ سے ہے ۱۹۴۸ء میں جنگ کشمیر میں اہم رول ادا کیا اور جنرل اکبر خان کی کمانڈ میں پانڈو پہاڑی پر قبضہ کیا۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں اہم فوجی آپریشن کامیابی سے کرنے سے ستارہ جرأت سے نوازے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں راجستھان سیکٹر میں لڑے اور فقیہ الشال کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں سیالکوٹ سیکٹر میں دادِ شجاعت دی۔ پاکستان آرمی کے پہلے افسر ہیں جنہوں نے بیک وقت دو ستارہ جرأت حاصل کئے۔

سوال... جنرل صاحب آپ ۶۵ء میں رن کچھ کے ہیرو کہلائے آپ کو ستارہ جرأت بھی ملا۔ اس معرکے کی تفصیلات۔

جواب... مونا باؤ ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ اس سٹیشن کو میں نے خود فتح کیا تھا یہ انڈیا کی سرحد کا آخری ریلوے سٹیشن ہے اس وقت ہمارے پاس صحرا میں صرف دو بٹالین تھے ایک میری بٹالین تھی جس کو ۱۸ پنجاب کہتے ہیں وہ میں کمانڈ کر رہا تھا۔ اس وقت کئی میل لمبے علاقے میں انڈیا کی فوجیں تھیں میرے خیال میں ۲ یا ۳ ڈویژن سے زیادہ تھے اس وقت میری بٹالین ڈیفنس لیے ہوئے تھی اور ہم مونا باؤ پر قبضہ کرنے کیلئے پلاننگ کر رہے تھے۔ مونا باؤ میں ان کی ۲ کمپنیاں تھیں ایک مرہٹہ رجمنٹ ایک پیرا ملٹری فورسز اور ایک بی ایس ایف اور ایک ڈیزرٹ ان کے پاس تھی۔ ہم پلاننگ بنا ہی رہے تھے کہ ہمیں اچانک ان کے وائرلیس پر ایک اہم خبر ملی ہم نے لوپچانے

سے ان پر بمباری شروع کی تو اس سے وہ گھبرا گئے۔

اچانک ہمیں خبر ملی کہ وہ اپنے دوسرے اعلیٰ افسروں کو پیغام بھجوا رہے تھے کہ پاکستانی بٹالین بڑا دباؤ ڈال رہی ہیں ہمارا دفاع مشکل میں ہے مجھے حکم ملا کہ جلو پنجاب مونا باؤ پر حملہ کرو ہمیں نے تقریباً ۸ میل پیدل ہی سفر کر کے اپنی بٹالین کو ان کے پر کر دیا وہ دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہم نے ان پر ایک فائر کئے بغیر ہی قبضہ کر لیا۔ اور ہمارا کوئی آدمی بھی کام نہیں آیا۔ وہ لوگ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے جس میں کافی فوجی سامان تھا۔ ریلوے پراپرٹی بہت ساری تھی جو کہ ہم سنبھال نہیں سکتا تھا اس لیے ہم نے پیچھے خبر دے دی کہ کسی متعلقہ آدمی کو بھجوایا جائے تاکہ یہ سب مال اپنے قبضے میں کر لے اور سنبھالے۔ پھر ریلوے، کسٹم اور فوج کے آدمی آ گئے اور انہوں نے وہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے آگے جا کر آدمی بھیجے تو دشمن آٹھ دس میل تک بھاگ چکا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ ہمارے پاس فورس تھوڑی تھی ہم دس میل اور بھی آگے جا کر قبضہ کر سکتا تھا اگر ہم قبضہ کر لیتے تو اس کو سنبھال نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کیا۔

اس میں ایک اور بات یہ ہے کہ وہاں کا ریلوے سٹیشن ماسٹر ایک مسلمان تھا جاتے ہوئے ہندوستانیوں نے اسے مار دیا۔ اور اس کی بیوی کو لے کر بھاگ گئے انہوں نے اس پر الزام لگایا کہ تم چونکہ مسلمان ہو اس لیے تمہاری اطلاع پر انہوں نے ہم پر حملہ کیا ہے۔

سوال... آپ ۶۵ء میں صرف اسی علاقے میں رہے؟

جواب... نہیں میں آگے بھی گیا۔ مونا باؤ کے علاوہ تنکر لو پر قبضہ کیا۔ ڈالی ایک جگہ ہے اس پر قبضہ کیا۔

سوال... کسی جگہ آپ کو دشمن سے اچھی طرح لڑنے کا بھی موقع ملا؟

جواب... ایک جگہ تنکر لو ہے۔ ایک ڈالی تھی جہاں پر ہمارا حملہ دن رات رہا جس میں ۲ بٹالین ۵ مرہٹہ رجمنٹ اور ۱۷ مدراس رجمنٹ کا ہم نے صفایا کیا۔ اس میں

ہم نے ان کے ٹینک اور ۲۰، ۲۲ گاڑیاں پکڑیں۔ ۷، ۱۱ افسروں کو قید کیا۔ ۱۸۰ کے قریب ہم نے قیدی پکڑے ۶۵ء میں کسی اور نے اتنا نہیں کیا یہ میری بٹالین ۱۸ ار نے کیا۔ پھر ایک اور جگہ "ٹلوں کا قلعہ" اس پر ہم نے قبضہ کیا۔ اس میں کافی لڑائی ہوئی۔

سوال... جنرل صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم ۶۵ء میں انڈیا سے بہتر فوجی پوزیشن میں تھے۔؟

جواب.... لہٰذا اس کی وجوہات اور بھی ہیں۔ ۶۵ء کی جنگ میں ہمارے پاس سارا سامان ہتھیار وغیرہ بہت اچھے تھے۔ کیونکہ امریکہ سے امداد ملی تھی اس سے قبل جنہیں ہم استعمال کر رہے تھے اور ہندوستانیوں کے پاس ۱۹۶۲ء تک وہ پرانے ہتھیار تھے۔ ان کو اس وقت تھوڑا سا لگا پتا صاحب کہ چین نے انڈیا پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے یکدم تیز رفتاری سے اپنے آپ کو اچھے ہتھیاروں سے لیس کیا۔ اس طرح ان حالات میں ہماری حالت ان سے بہتر تھی۔

سوال.... یہ سنتے ہیں کہ پاکستان کا توپ خانہ اس وقت زیادہ اچھی پوزیشن میں تھا لیکن ہمارے سامنے کوئی ایسا فعال کردار نظر نہیں آتا اس توپ خانے کا جب ہم کشمیر کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ کشمیر پر حملے کا آپ بطور ایک جنرل کیا تجزیہ کرتے ہیں۔

جواب.... جہاں تک توپ خانے کا سوال ہے۔ میرے خیال میں ہمارے پاس پاکستانی توپچی بہت اچھے ہیں۔ ۶۵ء کی جنگ میں، میں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا وہاں سے ان کے کئی کاغذات ملے جو کہ توپ خانے کے استعمال اور فائر کرنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ اور یہ کافی حساب کے سوال ہوتے ہیں۔ وہ اسی طریقے سے اپنا توپ خانہ استعمال کر رہے تھے۔ جو دوسری عالمی جنگ کا تھا۔ لیکن ہم نے اس دوران میں اور بہت سے طریقے استعمال کرتے تھے اس لیے ہمارے توپ خانے کا استعمال ان کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔

ہم نے پورے سیالکوٹ، لاہور کے علاقوں میں اس سے فائدہ اٹھایا

شام سے ذرا پہلے جب کہ سلیم مشین چلا رہا تھا اور نصیر اس میں باجرہ دے رہا تھا چودھری حاکم کا ایک آدمی آیا اور نصیر سے کہا۔

نے یکدم ہم پر کونسٹریٹ کر کے حملہ کیا۔ ہماری فوج ایک تو بکھری ہوئی تھی اور دوسرا لوگ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ یہ بات ہوئی تھی۔ ہم نے انڈیا پر حملہ نہیں کیا تھا۔ مشرقی پاکستان سے۔

سوال۔۔۔ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ مغربی پاکستان سے حملہ کرتے؟

جواب۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ کیا ہو سکتا تھا۔ اس وقت کی حکومت کی بات ہے کہ یہ دیکھیں کہ آیا مشرقی پاکستان میں جب ہنگامے تھے وہاں ہی محدود رکھا جائے یا پوری لڑائی لڑی جائے اس میں فیصلہ کرنا کہ آج شروع کرنی چاہیے۔ نہیں شروع کرنی چاہیئے۔ کب شروع کرنی چاہیئے۔ یہ بڑا مشکل فیصلہ ہوتا ہے یہ حکومتی سطح پر سوچنا پڑتا ہے کہ کیا کیا جائے۔

سوال۔۔۔ آپ ۱۷ء میں کس طرح لڑ رہے تھے؟

جواب۔۔۔ میں تو سیالکوٹ کی طرف سیالکوٹ کے علاقہ میں ایک ریزرو فورس تھی۔ میرا ہیڈ کوارٹر ڈسکہ کی طرف تھا۔ میرا علاقہ کشمیر سے لیکر یہاں لاہور کے قریب سائفن تک تھا۔

سوال۔۔۔ کیا یہ صحیح ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات سے ہماری فوج بد دل ہو چکی تھی۔

جواب۔۔۔ جی ہاں یہ درست ہے اس کی وجہ ہے کہ اس سے کافی لوگوں کو صدمہ ہوا۔

سوال۔۔۔ لیکن جنرل صاحب ایک اچھے کمانڈر کو خصوصی حالات میں لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے؟

جواب۔۔۔ یہ بھی درست ہے مگر یہ کہ آدھا حصہ ملک کا ٹوٹ جائے تو قدرتی بات ہے کہ ہر ایک کو صدمہ ہوتا ہے۔ اوپر کی سطح سے نیچے سپاہی تک۔ یہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے کہ ایسی حالت میں دل نہیں چھوڑنا چاہیئے فوجی کو ایسی تربیت ہی ہوتی ہے۔

سوال۔۔۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی سرحد پر ہماری پلاننگ ناقص تھی۔ اسلیئے ہم کچھ نہیں کر سکے۔ یہ تو عام سویلین بات کہہ سکتا ہے لیکن فوجی نہیں کہہ سکتا فوجی میں تو جذبہ انتقام پیدا ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اگر مشرقی پاکستان لیا ہے تو ہم مغرب میں قبضہ کریں۔!

جواب۔۔۔ جہاں تک جوش اور ولولے اور جذبے کا تعلق ہے وہ تو ہے لیکن بدلہ لینے کے لیے آپ کو وسائل چاہیئں۔ مطلب خود بازوؤں سے تلوار سے ڈنڈے سے اس کے لیے کافی نہیں۔ میں ایک اور بات بتاتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کو انڈیا نے پہلے کٹ آف کر لیا۔ بنگال کے ساحل سے ہمارے جہاز بند دیئے اور یہ گنگا جہاز کا معاملہ تھا۔ اور ساتھ ہی فلائٹ بند کر دی۔ ابھی آج کل کی بات ہوتی ہے کہ ایک جہاز ہوتا ہے جو کہ بہت اونچا پرواز کرتا ہے۔ جو کہ میرا خیال ہے پاکستان آرمی یا ائر فورس کو پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے روس سے لیا تھا۔ اس کا نام میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ وہ ہزاروں میٹر بلندی پر اڑتا ہے اسی میں کیمرے لگے ہیں اسی میں ریڈار ہے اب یہاں سرگودھا سے پشاور جیسے ہی جہاز اٹھتا تو اسے خبر ہوتی ہے اور وہ جہاز اتنا اونچا ہے کہ آپ اس کو مار نہیں سکتے جس کی وجہ سے ان کی ائر فورس ۱۷ء کی جنگ میں ہماری ائر فورس سے زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکی تھی۔ مطلب یہ کہ جو لڑائی ہوتی ہے وہ سامان کے لحاظ سے سائنس کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ ۶۵ء جنگ میں حالت ان سے بہتر تھی۔

سوال۔۔۔ ہم نے ۶۵ میں بھی کچھ نہیں کیا۔ کم از کم ہم کشمیر تو لے لیتے۔

جواب۔۔۔ دیکھیئے اس میں کافی چیزیں ہیں۔ کشمیر بڑی مشکل جگہ ہے وہاں بھی آپ کو کافی وسائل درکار ہیں۔ مین پاور کافی ضروری ہے۔ وقت کافی چاہیئے۔ آپ ایک پہاڑی پر حملہ کر کے قبضہ کریں گے تو اس کے بعد کافی دنوں کے بعد دوسری پہاڑی پر کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کافی وقت چاہیئے ہماری ایک پوزیشن ہے تو اس کی دو پوزیشن آگے لگی ہوتی ہیں۔

سوال۔۔۔ ۱۹۷۱ء کے بعد سے ہم نے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا ہے
پاکستانی فوج کے حالات کافی بہتر ہوئے اور ہم ہتھیاروں کے حساب سے بھی اب
کافی اچھی پوزیشن میں ہیں۔ لیکن حال ہی میں سیاچین گلیشیر پر بھارتی اور پاکستانی فوجوں
کی لڑائی کی جو خبریں مل رہی ہیں۔ اور انڈین فوج کا وہاں قبضہ کرنا آپ کے نزدیک
اس کی کیا وجہ ہے۔؟

جواب۔۔۔ ایک تو اصل میں میں ادھر گیا نہیں مجھے پتہ نہیں لیکن بہت سے
علاقے ہیں کہ جہاں پر آدمی آباد نہیں ہے وہاں کوئی رہ نہیں سکتا اب نئی صورت
حال کیسے ہے اس کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مجھے علم نہیں ہے۔

سوال۔۔۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں انڈیا کے خلاف
پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔؟

جواب۔۔۔ فوجی نقطہ لحاظ سے تو میں یہی کہوں گا کہ ہمیں ہر وقت تیار رہنا
چاہیئے۔ ہمیں اپنی فوج کو تیار رکھنا چاہیئے منظم کرنا چاہیئے ان کے فوجی سامان ٹھیک
ہیں بڑا چوکنا رہنا پڑتا ہے کیونکہ مغربی سائیڈ پر بھی ہمارے حالات اس طرح
ہیں ایسٹرن سائیڈ پر بھی اس طرح تو پھر ہمیں کافی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ تیار رہنے کا
مطلب نہیں کہ آپ حملہ کریں آپ کا دفاع مناسب ہونا چاہیئے۔

سوال۔۔۔ جنرل صاحب ہمارے ملک میں دفاع کی ایک بڑی عجیب
بکلی ہے۔ پہلے تو بات یہ ہے کہ ایک سیدھا اصول ہے کہ جارحیت ہی دفاع
ہو جاتا ہے۔ ہم دفاع کو یہ سمجھ رہے ہیں یا ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ آپ اپنے گھر میں
رہیں اور انتظار کریں کہ کب دشمن آپ پر حملہ کرے آپ کا نقصان کرے پھر آپ
دیں کیا ان مروجہ اصطلاحات کو ہی دفاع کہتے ہیں کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ دشمن
حملہ کرنے سے پہلے اس کی حملہ کی قوت ختم کر دیں۔

جواب۔۔۔ نہیں دفاع کا یہ مطلب نہیں کہ چپ کر کے بیٹھے رہیں
ہی ہم کہتے ہیں کہ جو حملہ ہے وہ دفاع کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ تو اس میں دفاع

کر نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ دفاع کیسے کیا جائے۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ اس میں حملہ بھی
ہوتا ہے۔ دفاع بھی ہوتا ہے۔ ہر طریقہ اور حربہ ہوتا ہے۔

سوال۔۔۔ ہم نے حملہ کر کے تو آج تک دفاع کیا ہی نہیں۔ افغانستان
بمباری کرتا ہے تو ہم احتجاج کر دیتے ہیں۔ بھارت کا جب جی چاہتا ہے ہمیں بے نقط
سناتا ہے۔ اس پر بھی صلح امن کی باتیں کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کا سانحہ ہم نے بھلا دیا ہے
پھر یہ دفاع کس طرح کا ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ قوم کا مورال ختم ہو رہا ہے

جواب۔۔۔ نہیں جتنا ڈیفنس ملٹری کا ہے وہ میں نے آپ کو سمجھا دیا ہے
کہ کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اسکو حملہ کس وقت کرنا چاہیئے افغانستان حملہ کر رہا ہے
ہم خاموش ہیں یہ انتہائی اعلیٰ سطح پر سیاسی نقطہ نظر سے یہ دیکھنا پڑتا ہے اس میں
فوجی کمانڈر کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اگر ابھی آپ کہیں کہ انڈیا حملہ کر رہا ہے تو کس وقت
اس پر حملہ کرنا چاہیئے یا افغانستان پر کب کرنا چاہیئے یہ سیاسی فیصلہ ہے اور
فوجی نہیں ہے۔

سوال۔۔۔ ہمارے ملک میں فوج کا سیاست میں بھی بھرپور حصہ رہا ہے
پاکستان بننے سے آج تک ہمیشہ فوج کا اہم رول رہا ہے۔ سیاست میں بھی فوج نے
ہمیشہ اچھا کردار ادا کیا ہے۔

اور بطور فوج تو ہمیشہ ہی اچھا رہا۔ دنیا تسلیم کرتی ہے۔ تو جب اتنے اتنے
بڑے سیاسی فیصلے فوج کرتی ہے تو یہ فیصلہ بھی فوج کو کرنا چاہیئے۔

جواب۔۔۔ ابھی جیسے آپ نے افغانستان کا کہا ابھی کیسے یہاں بیٹھ کر ہم
کہہ سکتے ہیں جو اس وقت آدمی ان ذمہ دار عہدوں پر ہیں ان کے پاس کیا خبریں ہیں
کیا حالات ہیں ان کے خیالات کس طرح کے ہیں اگر کل کو افغانستان اور پاکستان کی لڑائی
شروع ہو جائے تو پھر کیا ہو گا۔ مطلب یہ چیزیں اس سطح پر سوچنی پڑتی ہیں۔

سوال۔۔۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جو توقعات قوم کو مسلح افواج سے تھیں کیا فوج
ان معیار پر پوری اتری۔؟

جواب . . . . میرے خیال میں ۶۵ء کی جنگ ٹھیک تھی۔ ویسے یہ ہے کہ اس جنگ میں اور اچھا ہو سکتا تھا جس طرح یہ کھیم کرن کا معاملہ تھا۔ وہ کیا انڈیا نے کہا تھا کہ جگوان نے ہمیں بچایا ہے۔ تو وہ ہمیں قبضہ کرنا چاہیئے تھا کافی آگئے۔

سوال . . . . جو ہمارے سامنے بات آئی ہے مختلف کتابوں کے مطالعے سے وہ تو یہی ہے کہ وہاں توپ خانے اور پیدل فوج کا ملاپ ٹھیک نہیں تھا۔ کیا وجہ ہے ہم وہاں وہ نتائج حاصل نہیں کر سکے اور پھر کمانڈ کی تبدیلی کا مسئلہ تھا۔ اور ایسے مسائل تھے لیکن قوم کے نزدیک یہ باتیں اس لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتیں کہ فوجی فیصلے کیا تھے لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ فوج انکی توقعات پہ پوری اترے۔

جواب . . . . بالکل یہ درست ہے۔ لیکن وہ کسی نے کچھ غلطی کر دی کسی نے کچھ کر دیا تو لڑائی میں تو یہ ہے کہ ذرا سی غلطی ہو جائے تو فتح شکست میں شکست فتح میں بدل جاتی ہے۔ کھیم کرن والے معاملے میں میں تو ادھر نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کامیاب ہوگا لیکن نہیں ہوا۔ چھمب جوڑیاں والا ہمارا خیال تھا کہ کامیاب ہونا چاہیے تھا لیکن یہ بھی۔ آپ نے خود ہی بتا دیا کہ کمانڈ کی تبدیلی ہو گئی۔ پھر انڈیا نے ادھر حملہ کر دیا۔ یکدم وہ ادھر والے ادھر بلانے پڑے اگر مزید تیزی ہوتی۔ ایک ڈویژن کی کمی محسوس کی گئی تھی اس وقت۔ اور فوج نے اس وقت کی حکومت کو کہا تھا کہ ایک ڈویژن کی مزید ضرورت ہے۔ گورنمنٹ نے منظوری نہیں دی تھی۔ کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس وقت اگر ایک ڈویژن اور ہوتا تو حالات ہی بدل جانے ادھر حکومت کو پیسہ بھی سوچ کر خرچ کرنا پڑتا ہے کہ فوج پر کریں یا تعلیم پہ یا زراعت پر اس وقت کے جو حالات ہوتے ہیں اس کے مطابق آدمی بہتر سمجھتا ہے بعد میں ثابت ہو سکتا ہے کہ اس نے غلطی کی۔

سوال . . . . آپ کچھ آپریشن جبرالٹر پہ روشنی ڈالیں گے؟ یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح؟

جواب . . . . وہ جو بھیجے تھے انہوں نے میرے خیال میں وہ کامیاب

نہیں ہو سکتا تھا اس طرح کے کام کرنے کے لیے بہت تیاری چاہیے جو پیچھے ساری آبادی ہے ان کو اپنے ساتھ ملانا پڑتا ہے اس میں سیاسی نقطہ نظر آتا ہے اور فوجی نقطہ نظر بھی یہ صرف اس وقت بھیج دینا اور کہنا کہ اب یہ کر دو یہ ٹھیک نہیں۔

سوال . . . . ۶۵ء میں ائیر فورس نے ایس ایس جی کی ایک پلاننگ کی اور پٹھانکوٹ آدم پور اور ہلواڑہ پہ پیرا ڈراپس اتارے۔ ان کا جو حشر ہوا وہ بھی قوم کے سامنے ہے۔ آپ کے نزدیک جن لوگوں نے یہ پلاننگ کی تھی کیا صحیح کی تھی؟

جواب . . . . یہ بھی اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کو کامیاب کرنے کے لیے پرانی تاریخ کو سٹڈی کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ درست فیصلہ نہیں تھا اگر یہ فیصلہ کرنا تھا۔ تو اس مقدار میں کرتے کہ یہ کامیاب ہو جاتا جو گئے انفرادی طور پر انہوں نے بڑی کوشش کی۔ مگر پھر بھی یہ آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ہماری عسکری تاریخ کے خفیہ گوشے

ایس ایس جی کے سابقہ کمانڈر کرنل غفار مہدی کی زبانی

سوال۔۔۔ کرنل صاحب! آپ نے ۶ ستمبر ۸۴ء کے ایک اخبار میں چھپے اپنے انٹرویو میں "گمنام ہیروز" کا ذکر کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ قوم کو ان عظیم لوگوں کی اصلیت سے باخبر کیا جائے۔ اور اس موضوع سے ہم اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔؟

کرنل مہدی۔۔۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آج آپ لوگوں کے روبرو بیٹھا ہوں۔ اس اخبار کی تحریریں قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوئی تھیں اور مسلسل بلند ہوتی آرہی ہیں۔ آپ کا سوال میرے ۶ ستمبر ۸۴ء کے انٹرویو "تاریخ آپ سے مخاطب ہے" سے متعلق ہے جس کا ایک حصہ جنگ ستمبر ۶۵ء کے گمنام ہیروز سے متعلق تھا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے۔ گھمنڈ خدانخواستہ نہیں کہ میں حقائق سے مسلسل پردہ ہٹاتا آرہا ہوں۔ اخبارات میں یہ تحریریں پچھلے آٹھ سال سے آنی شروع ہوئی ہیں۔ لیکن جنگ ستمبر سے پہلے اپنے خطوط کے ذریعے جی ایچ کیو کو میں ان لوگوں کی منصوبہ بندیوں کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا رہا تھا بلکہ آگاہ سے زیادہ میں ان کو "وارننگ" دیتا رہا۔

میں ۲۳ مارچ ۸۵ء کو ٹی وی پر فوجی جوانوں کی مشقیں دیکھ رہا تھا جہاں پیرا کمانڈوز نے "پیراشوٹ فری ڈراپ" کا مظاہرہ کیا تو میری جذباتی حالت بڑی عجیب ہوئی۔ پرانی یادیں تازہ ہوئیں اور آنکھوں میں بے اختیار نمی بھی آگئی۔ یہ خوشی

کی نمی بھی تھی اور اس میں تھوڑا سا تاسف بھی تھا۔ خوشی اس بات کی کہ پیراشوٹ ٹریننگ سپیشل سروس گروپ میں خصوصاً اور فوج میں عموماً میری ہی زیر قیادت ۶۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ یہ پودا جو اللہ نے میرے ہاتھ سے لگوایا تھا جب اسے میں تناور درخت کی صورت دیکھتا ہوں تو بے اختیار خوشی کے آنسو بہہ نکلتے ہیں کہ میری محنت اللہ کے ہاں بارآور ہوئی۔

سوال۔۔۔ آپ کا اشارہ پی ٹی ایس کی طرف ہے؟

ج۔۔۔ جی ہاں پیراشوٹ ٹریننگ سکول پشاور کی طرف بلکہ اس سے بھی پہلے دوسری جنگ عظیم میں بھی "پیراشوٹرز" تھا جب کہ یہاں پشاور میں اس سکول کے قیام کا پروگرام بنایا گیا تھا۔

موجودہ کمانڈر سپیشل سروس گروپ بریگیڈیئر طارق محمود (ٹی ایم) کا انتخاب کرنے کا شرف بھی مجھے ہی حاصل ہے ۱۹۶۲ء میں اس مایہ ناز سپوت کا چناؤ کمانڈوز کے لیے میں نے ہی کیا تھا تب وہ فوج میں کیپٹن تھے اب تک شاید ہی کبھی سال چھ ماہ کے لیے وہ باہر رہے ہوں ورنہ مسلسل وہ سپیشل سروس گروپ کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سوال۔۔۔ اب اپنے "تاسف" کی وضاحت بھی کر دیجئے۔؟

جواب۔۔۔ جی ہاں! میں نے یہ جو لفظ "تاسف" استعمال کیا ہے تو یہ میرا تاریخی تاسف ہے۔ اس میں میرے "مادیت" سے متعلق جذبات کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔

سپیشل سروس گروپ کی ایک مایہ ناز شخصیت جسے میں نے خود کمانڈوز کے لیے بلایا تھا اور جو میرے بلانے پر رضاکارانہ طور پر ایس جی میں آگئے اور ۶۵ء کی جنگ کے بعد تک وہ کمانڈوز کے ہر شعبہ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتے رہے۔ انکے کارنامے اتنے عظیم ہیں کہ اگر وہ کسی دوسری فوج کے سپاہی ہوتے تو انہیں عظیم ترین اعزاز سے نوازا جاتا۔ ان کے کارنامے صرف فوجی درسگاہوں ہی میں نہیں بلکہ عوام الناس کو بھی جلی الفاظ میں پڑھائے جاتے۔

اس شخص کا نام ہے مرحوم میجر جنرل احسان الحق ڈار مرحوم ہیں نے اسس ڈائریکٹر ملٹری آپریشن تب بریگیڈیئر گل حسن تھے جو بعد میں کمانڈر انچیف بنے
لیے کہہ دیا کہ یہ دعائیہ کلمہ ہے جس سے مرنے والے کی مغفرت طلب کی جاتی ہے۔ اصل میں یہ ایک سازش تھی جب کہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ مقبوضہ کشمیر کو
ورنہ میں اسے مرحوم نہیں کہتا۔ ایسے لوگ کبھی نہیں مرا کرتے۔ بقول جنرل موسیٰ جنگ آزاد کروانے کا بہت شاندار منصوبہ تھا۔ میں ان لوگوں میں شامل نہیں۔ کیونکہ اسس
ستمبر ۶۵ء کا آغاز مقبوضہ کشمیر میں کمانڈوز بھیجنے سے ہوتا ہے مجھے جنرل ہیڈکوارٹر منصوبے میں سوائے کمزوریوں کے اور کوئی پہلو سامنے نہیں آتا۔
نے مئی اور جون کے درمیان اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ ایک اس قسم کا منصوبہ بنایا مجھے یہ ملال تھا کہ آخر ہیڈکوارٹر اس منصوبے کی خامیوں کو کیوں نظر انداز
جا رہا ہے اور حکم دیا کہ میں میجر جنرل اختر حسین ملک کے پاس جو مری میں ان دنوں کر رہا ہے اور میں نے انہیں زبانی ہی نہیں تحریری بھی یہ لکھ کر بھیجا کہ اس منصوبے
جی اوسی تھے جاؤں اور انہیں کمانڈوز کی ہر ممکنہ مدد بہم پہنچاؤں۔ سے آپ کو سوائے ناکامیوں کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ میرے الفاظ یہ تھے
س... کرنل صاحب! یہ بات آپ اکثر کہتے ہیں کہ آپریشن جبرالٹر کا منصوبہ، آپ پاکستان میں "بے آف پگز" کی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں بالکل اس کے سے انداز
طے پا جانے کے بعد آپ کو مطلع کیا گیا۔ آپ ایس ایس جی کے کمانڈر تھے اور اس میں آپ کام کر رہے ہیں لیکن اس کا انجام سوائے ایک اندوہناک المیے کے اور
آپریشن میں مرکزی اور خصوصی کردار بھی ایس ایس جی نے ادا کرنا تھا یہ سمجھ نہیں آتی کہ یہ نہیں ہو سکتا۔
آپ کی شمولیت کے بغیر یہ منصوبہ کیسے بن گیا؟ میرا مطلب ہے آپ کو اعتماد میں یہ رپورٹ میرے دستخطوں کے ساتھ ہیڈکوارٹر میں گئی تھی اور اسے مرتب کرنے
لیے بغیر بظاہر ایسے کسی منصوبے کی تیاری سمجھ میں نہیں آتی؟ میں میرے سپیشل آپریشن سٹاف آفیسر احسان الحق ڈار کا مشورہ بھی شامل تھا اور سپیشل
ج.... آپ نے بہت اچھا سوال کیا لیکن اس کا جواب جنرل اختر ملک سروس گروپ کے دوسرے افراد کا مشورہ بھی ہم نے لیا تھا۔ لیکن پاکستانی فوج میں
دے سکتے تھے، عزیز احمد دے سکتے تھے۔ بھٹو یا ایوب خاں دے سکتے تھے جو اب قائد اعظم کے انتقال کے فوراً ہی بعد ایک چھوٹا سا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کے سیاسی
دنیا میں نہیں ہیں۔ ہاں ایک شخص ضرور ایسا ہے جو زندہ ہے اور اس سوال کا جواب عزائم زیادہ تھے اور پیشہ ورانہ دلچسپیاں کم تھیں۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے کہ جو مسلسل
بھی دے سکتا ہے اور وہ ہیں جنرل موسیٰ۔ تا چلا گیا جسے آپ "عسکری ملوکیت" کہہ سکتے ہیں جس کی مثال ہمیں ہندوستان میں
سوال.... آپ اشارتاً کچھ تو بتائیے۔! اندان غلاماں میں اور پھر مصر میں "ملوک" کے دور میں نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بہت
جواب..... ایک اور کردار جو ان دنوں بہت اہم حیثیت کے حامل تھے سپاہی تھے بہت بہادر تھے لیکن ان کا محور اور مقصد سیاست کی کرسی تھی۔ ایک
تھے اور الحمدللہ بقید حیات بھی ہیں مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر وہ بھی اس راز سے پردہ کی حیثیت سے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اپنا نکتہ نگاہ ان لوگوں
کیوں نہیں اٹھا رہے۔ زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تک پہنچا دوں۔ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا پیرا کمانڈوز سے۔ کیوں نہ آپ کو پاکستان
وقت آ گیا ہے کہ وہ اس راز سے ضرور پردہ اٹھائیں۔ اور وہ ہیں میجر جنرل ملک کے جیالے کمانڈوز کی اس پیرا لینڈنگ کا حال سناؤں جو ۶۵ء کی جنگ کے آغاز
بہادر شیر جو بہت نیک انسان ہیں اور جنہیں اصلیت کا علم ہے یہ ان دنوں چیف میں پاکستان کے جانباز کمانڈوز سے بڑے ظالمانہ اور غلط طریقے سے بھارتی ہوائی
آف سٹاف تھے۔ ان کے ماتحت بریگیڈیئر بلگرامی وائس چیف آف سٹاف تھے۔ اڈوں پر کروائی گئی۔

"دیکھو بھابی میرے سامنے جھوٹ نہ بولا کرو۔"

کشور کا سر جھک گیا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بس دس پندرہ منٹ۔"

"میں پھر بیٹھتی ہوں اکٹھے ہی چلتے ہیں۔"

سلیم نے بیج لے کر جھولی میں ڈال لیا اور بیل زمین میں ڈال دیے۔

جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں یہ حربہ ناکام ہوگیا تھا جب جرمن نے لوناز
اس طرح پیرا ڈراپنگ کی یا امریکہ اور برطانیہ نے "آرن ہل بریج" پر۔ انہوں
انتہائی مار کھائی۔ اگر کسی نے فتح بھی حاصل کرلی تو دوبارہ تجربے کی ہمت نہیں کی۔
نے یہ تجربہ آخری مرتبہ لبنان پر کیا اور ان کا اتنا نقصان ہوا کہ انہیں دوبارہ "ا
لینے کی ہمت نہ پڑی۔

جہاں تک امریکہ اور برطانیہ کا تعلق ہے تو اس آپریشن کے نتیجے میں
پیرا ٹروپر مر گئے۔ ہزاروں زخمی ہوگئے اور باقی قید ہوگئے۔

انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ معاملہ چلے گا کیسے؟ میں نے کہا کہ
طرح ممکن ہے کہ جس طرح آپ انہیں لے کر جائیں گے ہوائی راستے سے اسی طرح
لے کر آنے کا بندوبست بھی کیجئے۔ انہیں لے کر کون آئے گا؟

کہنے لگے صاحب۔ پیدل چل کر آئیں گے۔

میں نے کہا دیکھئے مذاق مت کیجئے۔ یہ کیسے ممکن ہے سو فیصد غیر مسلم علاقہ
کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اچھا! ہم نے یہی نہیں کہا بلکہ یہ سب کچھ قلمبند کیا اور اس میں
احسان الحق ڈار کا بہت حصہ آتا ہے وہ سٹاف آفیسر تھا ہم نے یہ سب کچھ جی ایچ
کو بھی روانہ کردیا۔

ہم نے یہی کیا بلکہ تاریخ میں آج تک جتنے بھی کمانڈو ایکشن ہوتے تھے
کے حوالے سے بھی اعلیٰ قیادت کو سمجھانے کی کوشش کی کہ گوریلا آپریشن کیا ہو
اور کیا نہیں ہوتا۔ کہاں تک ممکن ہے اور کہاں تک ناممکن؟

مقصد یہی تھا کہ ہمارے جرنیل صاحبان بزپڑھ لیں اور ہم اس بڑے
سے بچ سکیں جو ہمارے ساتھ ہونے والا تھا اس کے باوجود ہم نے یہ بھی کہا کہ تم
ڈنڑ پیلنے والے پہلوان نہیں اگر ناگزیر ہے تو انہیں رات کے پہلے پہر میں ڈرا
کردیجئے تاکہ صبح تک یہ بہادر کم از کم واپس تو آسکیں۔

دوسری بات یہ کہ تم نہیں "ٹارگٹ" کے اوپر ڈراپ کیجئے۔ اگر آپ نے

چھ میل دور ڈراپ کیا تو انہیں تو مضافات کے کتے ہی دم نہیں لینے دیں گے اور
تیسری اہم بات یہ کہ اسی ٹارگیٹ سے آپ ان لوگوں کو دو چار گھنٹے بعد واپس
لا سکیں۔

لیکن اس صورت میں بھی کامیابی تب ہی ممکن ہوتی ہے جب کہ جنگ کی
حالت دونوں ممالک کے درمیان نہ ہو کیونکہ جنگ میں ہونے کی صورت میں افواج
بیدار ہوتی ہیں یہ اسی صورت میں کامیاب ہوتے ہیں جیسے اسرائیل نے اچانک
بے خبری میں مصر اور شام کی ائیر فورس کو جا لیا تھا اور انہیں ختم کردیا۔

جب میں نے ائیر فورس کے کمانڈر انچیف کے سامنے یہ بات رکھی تو انہوں
نے کہا کہ یہ تو سیاسی عمل ہے میں نے کہا کہ جنگ کا عمل بھی سیاسی عمل ہی کا ایک
تاریک حصہ ہوتا ہے اور امن بھی سیاسی عمل کا ہی حصہ ہے اس کے بعد جنگ،
اور جنگ کے بعد امن اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

یہاں میں احسان الحق ڈار کے کردار کا ذکر کروں گا سات ستمبر کو حالت یہ تھی
کہ میں تو وہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے تو ۱۲۔ اگست کو "جرات نکالا" مل چکا تھا۔ اب آپ
خود دیکھیں کہ آپ ایک ایسے کمانڈر کو جس کی ساری زندگی کمانڈوز کے ساتھ
گزری تھی یہاں سے نکال دیا گیا اور ایک ایسے شخص کو یہاں لایا گیا جس کا کورس
ابھی لندن میں مکمل ہی نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تھے کرنل نصیر احمد چوہدری۔

چونکہ نصیر چوہدری صاحب کورس مکمل کر رہے تھے اس لئے عارضی کمانڈ میرے
نائب لیفٹیننٹ کرنل عبدالنبین کو دی گئی۔ کیونکہ میں تو اس سلسلے میں تعاون کر ہی
نہیں رہا تھا میں نے ایک اور بات کہی کہ اگر آپ کچھ اور نہیں کرسکتے تو جنگ
کشمیر میں عروج پر ہے کم از کم آپ یہ تو کریں کہ کمانڈوز کی چھٹیاں منسوخ کرکے انہیں
واپس بلائیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶ ستمبر کو جب یہ پلان طے کیا گیا تو سپیشل سروسز گروپ
کا ۷۰ فیصد حصہ چھٹی پر تھا بہر حال ۶ ستمبر کو لڑائی جاری ہوئی تو فیلڈ مارشل نے کہا کہ اب

ائر فورس والے پلان پر فوراً عمل کیا جائے جس پر احسان الحق ڈار نے کہا کہ جناب ہمارا ۲۵ فیصد عملہ چھٹی پر ہے اور جن کمپنیوں کو ہم نے اس خصوصی مقصد کے لیے تربیت دی تھی ان کے اکثر کمانڈوز چھٹی پر گئے ہوئے ہیں دوسری بات کہ آپ نے تو ابھی تک ہم کو ٹارگیٹ کے نقشے ہی فراہم نہیں کئے اور تیسری بات یہ کہ ایک کمپنی کے مختلف جوانوں میں مختلف ذمہ داریاں بٹی ہوئی ہیں اگر چھٹی پر گئے لوگوں کی جگہ دوسروں کو بھی لایا گیا تو وہ آپس میں بہترین تعاون نہیں کر سکیں گے۔

لیکن میجر احسان الحق ڈار کی سنتا کون تھا۔

وہ جنرل ہیڈ کوارٹر فون کرتے تو اس طرف سے بریگیڈیئر بلگرامی جواب دیتے کہ بھئی یہ ائر فورس کا معاملہ ہے تم ان سے بات کرو۔ یونٹ جو ہے وہ فوج کا ہے۔ کمانڈ اس کی فوجی ہے اور کہا جاتا ہے کہ رابطہ ائر فورس سے قائم کرو۔ اصل میں وہ لوگ ایک اہم فیصلہ کرنے سے دامن بچا رہے تھے۔

اب ادھر سنتا کون ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ بھی پاس تھا اسی کے ساتھ حکم ہوا کہ کارروائی کا آغاز کر دو۔

جب میجر احسان الحق ڈار نے دیکھا کہ جی ایچ کیو بضد ہے تو اپنے جوانوں کو اکیلے چھوڑنا ناپسند کیا اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ ۳ مرتبہ کمانڈوز کے ساتھ مختلف آپریشن پر گئے۔ یہ قیادت، شجاعت اور جوانمردی کی انتہا ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ وہ آخری وقت تک فوجی رہا۔ وردی تو انہوں نے سال ڈیڑھ سال پہلے اتاری تھی لیکن ملٹری ہسٹری پر ان کی نظر ہمیشہ رہی اور ان کے مضامین تو آپ نے اکثر شائع کئے ہیں وہ آخری لمحے تک اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔

میرا مطلب یہ کچھ کہنے سے یہ ہے کہ فوج میں صرف وردی پہننے والے ہی جرنیل نہیں بنا کرتے بعض مرتبہ اچھا ذہن رکھنے والے جرنیل بھی بنتے ہیں۔

سوال ... کرنل صاحب معذرت سے کہہ رہا ہوں کہ آج آپ نے میرے زخم تازہ کر دیئے ہیں یہ معاملہ شاید دبا ہی رہتا تو بہتر تھا پاکستان ائر فورس نے اپنی رپورٹ میں اس ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے ان سرفروشوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخری دم تک لڑتے رہے سنگینوں سے خالی ہاتھوں سے الا یہ کہ ناخنوں سے میجر درانی اور ان کے ساتھی دس روز تک بھوکے پیاسے دریائے بیاس کے گرد بھٹکتے رہے۔ کمانڈوز نے گھاس کھا کر گزارہ کیا لیکن افسوس یہ انسانی معرکہ نہیں تھا اس کے ساتھ ہی ونگ کمانڈر ڈوگر کا یہ کہنا ہے کہ عین وقت پر منصوبے کو منسوخ کر دینا بھی ناممکن تھا۔ نہ وہ لوگ اس پوزیشن میں تھے کہ سی ڈی ۱۳۰ وہاں اتار سکیں جو کمانڈوز کو واپس لے آتے۔ انہوں نے پہلے ہی سے جی ایچ کیو کو بتا دیا تھا کہ کمانڈوز کو واپس لانا ان کے بس میں نہیں ہوگا؟

جواب ..... اب میں آپ سے اس معاملے میں کیا کہوں؟ وہ تو خدا کرے کبھی ایسا موقعہ بنے کہ ڈوگر صاحب اور میں آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کریں۔ دیکھیے فوج ایک منضبط محکمہ ہے۔ جہاں ہر بات ایک ضابطے کے تحت کی جاتی ہے۔ جو منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں ضرور یہ بتایا جاتا ہے کہ کمانڈوز نے اگر یہ کارروائی کرنی ہے تو رات کے کس پہر میں کس طریقے سے وہ جائیں گے؟ کیسے واپس آئیں گے؟ انہیں کہاں اتارا جائے گا؟ کہاں سے واپس لایا جائے گا؟ ٹارگیٹ کے عین اوپر اتارا جائے گا یا اس سے کچھ دور فاصلے پر؟ انہیں نقشے مہیا کئے جاتے ہیں تاکہ انہیں علم ہو کہ فلاں جگہ اے ڈی سی ہے فلاں جگہ واچ ٹاور ہے یہ آپریشنل ایریا ہے یہ ایڈمن ایریا ہے وغیرہ وغیرہ اسی طرح اس پلان میں یہ بات موجود تھی کہ کمانڈوز کو واپس لانے کی ذمہ دار پاکستان ائر فورس ہوگی۔

سوال ..... یہ بات واقعی اس منصوبے میں شامل تھی؟

جواب ..... یہ اس منصوبے کی بنیاد تھی اور یہ منصوبہ اسی بنیاد پر استوار تھا کہ کمانڈوز کو بذریعہ ہوائی جہاز واپس لایا جائے گا

سوال ... کرنل صاحب! یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں براہ کرم بتایئے کہ ان گمدم، زبلواڑہ، پٹھانکوٹ، آدم پور میں کہاں یہ گنجائش ہے کہ وہاں سی ڈی ۱۳۰.

اتریں اور ان لوگوں کو واپس لے کر آئیں اتنی دیر میں تو دشمن ہوشیار ہو چکا ہوتا اور ان بڑے بڑے جہازوں کے اترنے کے امکانات ہی ختم کر دیئے جاتے؟

جواب.... . وہاں یہ بات نہیں تھی کہ سی ڈی ۱۳۰ ہی وہاں اترتا اس کے متبادل تجاویز بھی تھیں۔ مثلاً ایک تجویز یہ تھی کہ ٹارگٹ کے نزدیک ہی قریب میل آدھ میل کے فاصلے پر دو چار گھنٹے طلبہ ہیلی کاپٹر پہنچ جائیں گے یہ سی ڈی ۔ کے لحاظ سے بہت موزوں جہاز ہے کہ اسے جیٹ جہاز کی طرح لینڈ کرنے کے لیے کسی بہت بڑے رن وے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انتہا یہ کہ اگر پولو گراؤنڈ جیسے سائز کی سڑک وغیرہ ہی مل جائے تو اسے وہاں اتارا جا سکتا ہے اور انجن بند کئے بغیر دوبارہ وہیں سے بآسانی اڑایا جا سکتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ متبادل تجاویز تھیں لیکن حتمی طور پر ابھی کچھ طے نہیں پایا تھا۔

سوال.... . آپ نے کرنل صاحب بڑا احساس موضوع چھیڑا ہے ہم: ہیں ان جیالوں کو افراتفری کے عالم میں ٹارگٹ سے میلوں دور اتارا گیا۔ البتہ یہ کہ پٹھانکوٹ پر اترنے والے پیراٹروپرز کو وہاں سے ۱میل دور جموں کی طرف جانے والی شاہراہ پر اتارا گیا جہاں بھارتی فوج کا ایک بکتر بند ڈویژن جیسے انہی کا منتظر ہوا تھا یہ الگ کہانی ہے لیکن سمجھ نہیں آتی جب بقول آپ کے کمان کو پیش آمدہ خطرات سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور اس ضمن میں آپ کے خیال سے ہم خیال بھی جی ایچ کیو میں موجود تھے تو پھر سرے ہی سے آخر جی ایچ کیو نے انکار کیوں نہ کر دیا؟ اتنے بڑے سانحے سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟

جواب..... خدا آپ کا بھلا کرے میرے بھائی یہاں جنہوں نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیا ابھی تک ان کے چہرے بھی عوام کے سامنے نہیں لائے گئے یہ تو بڑی بات ہے۔

سوال..... اس سے کیا ہم یہ سمجھ لیں گے اے کی شکست کی بنیاد ۶۵ میں رکھ

دی گئی تھی؟

جواب.... . اس بات میں تو کسی معمولی سے ذہن رکھنے والے کو بھی شک ہونا ہی نہیں چاہیئے کہ اے کی لڑائی کی جڑیں ۶۵ میں جاتی ہیں اور ۶۵ کی جنگ کے بعد ان عوامل سے ان کا تعلق ہے جن سے کہ ان تمام کوتاہیوں پر جان بوجھ کر پردہ ڈالا گیا۔ ان شخصیتوں کو چھپایا گیا جو اس سانحے کی ذمہ دار تھیں۔ ان میں سیاسی شخصیتیں بھی تھیں سول سرونٹس کے عہدے دار بھی تھے اور ظاہر ہے ان میں خاکی وردی پہننے والے حضرات بھی شامل تھے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کو جنگ کے فوراً ہی بعد ملٹری کورٹس کے سامنے لایا جاتا تو سقوط ڈھاکہ کا المیہ ہرگز نہ ہوتا کیونکہ ان میں بہت سے وہ حضرات بھی ہیں جو اے کی جنگ کے دوران بہت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ کمانڈروں ہی کی بات نہیں اکھنور کا معاملہ لیجیئے۔

سوال.... . میں اس طرف آ رہا ہوں جنرل ٹکا خان کے ڈویژن کا کردار ہے کھیم کرن میں انفنٹری اور آرٹلری کے تعاون کا فقدان ہے اکھنور سیکٹر میں کمانڈ بدلنے کا معاملہ ہے وغیرہ وغیرہ یہ ایسی باتیں ہیں جو حساس ذہنوں کو ہمیشہ کچوکے لگاتی رہیں گی!

جواب..... میں آپ سے کیا بتاؤں کن کن باتوں پر جی ایچ کیو نے آنکھیں بند رکھی ہوئی ہیں بھائی حمود الرحمن کمیشن رپورٹ میں کتنے بھی نقائص کیوں نہ ہوں آپ شائع کر دیجئے اگر پچھلی حکومت نے نہیں کی تو آپ کر دیجئے اگر یہ نقائص قوم کے علم ہی میں نہیں آئیں گے تو بات کیا بنے گی یہاں سے جنرل ڈار مرحوم کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا میں آپ کو دراصل بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس فوج میں بڑے بڑے عظیم لوگ بھی موجود تھے ۶۴ میں اسے (جنرل ڈار مرحوم) میں نے ایک بڑے اہم مشن کے لیے چنا یہ اتنی خطرناک مہم تھی کہ اس وقت کے ایس ایس جی کے کمانڈر کے پسینے چھوٹ گئے تھے اور اس نے کہا تھا کہ یہ منصوبہ ناممکن العمل ہے اور میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ یہ تصور یہیں دفن کر دیجئے میں نے کہا بھائی میں تو اس قصے کو نہیں چھوڑوں گا تم البتہ اس سے الگ ہو جاؤ میں نے ڈار سے کہا تم اس کی قیادت کا بیڑہ اٹھا سکتے ہو؟ اس نے

کہا ہاں؛ یہ چلتا ہے اور جب اٹک پر پہنچا ہے تو اس کی گاڑی روک کر اسے مطلع کیا جاتا ہے کہ تمہاری بیوی بچوں کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور تمہارا نوزائیدہ بچہ مر گیا ہے دوسرا بیٹا اور بیوی بھی سخت زخمی ہیں یہ شخص دیکھئے کیا کرتا ہے۔ اپنے بیٹے کی خیریت معلوم کی اور انہیں ہسپتال ہی میں چھوڑا اور اپنے مشن پر نکل گیا۔ اس نے اتنے زبردست جذباتی حادثے کے باوجود یہ مشن نہایت کامیابی سے مکمل کیا میں نے اس کی کامیاب واپسی کے بعد اسے "ہلال جرأت" کے لیے "ریکمنڈ" کیا تھا اسے نہیں ملا کوئی بات نہیں ایسے عظیم کارنامے تمغوں کے لیے نہیں کئے جاتے اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں ہے لیکن میں نوائے وقت کی وساطت سے حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ اسے اس کا حق مرنے کے بعد ہی دے دیا جائے جب ڈار ریٹائر ہوا ہے تو اس کا بنک بیلنس صرف ۲ ہزار روپے تھا۔ اب اس کے گھر والوں کو اس کی پنشن ۱۲ سو روپے شاید ملتی ہو گی تو میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے عظیم لوگوں کے گھر بار کا خیال رکھنا عظیم قوموں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دیکھئے یہ لوگ دل ٹوٹنے سے مرے ہیں اور ڈار کا دل تو نجانے کتنی مرتبہ ٹوٹا تھا ۲۵ سال سے وہ صدمات جھیل رہا تھا۔ بالآخر اس کا دل بند ہو گیا صبح اس نے تہجد کی نماز پڑھی اور صبح کا ناشتہ بھی خود تیار کیا۔ جب دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ۱۵ سال کے وہ صدمات اس کے دل پر اکٹھے ٹوٹ پڑے اور اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اب میں آتا ہوں آپ کے سوال کی طرف بریگیڈیئر امجد صاحب نے جب ۶۵ پر اپنی کتاب لکھی ہے تو جنرل یحییٰ خان صاحب اس وقت بقید حیات تھے اور وہ بھٹو صاحب کا دور بھی نہیں تھا کہ ان پر کہنے سننے کی کوئی پابندی ہو ان پر تو اس وقت کرم رحم کی بارش ہونی شروع ہو گئی تھی وہ کتاب آنے کے دو سال بعد بھی زندہ رہے لیکن انہوں نے اس معاملے پر زبان نہیں کھولی۔ باوجود اس بات کے کہ نوائے وقت نے اس وقت بھی اس پر بہت واویلا کیا اور نمایاں شہ سرخیوں کے ساتھ اس معاملے کو عوام تک پہنچایا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے اس معاملے پر جو کچھ کہا اور لکھا وہ آپ کے سامنے ہے اور

یہی بات نہیں میں نے ۵۲ میں جب میں کوئٹہ سٹاف کالج میں تھا اپنی ہائی کمان کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ہم نے یہ غلطیاں کیں تو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ ہے وہ خط جو میں نے لکھا تھا اور جس پر مجھے کہا گیا تم ماہر حرب ضرب ہو یا منجمی۔؟

اس پر جنرل رحمن نے مجھے کہا تھا میں نے کہا فوجی ہوں جوتشی نہیں! جس پر انہوں نے کہا میں تمہیں اس لیے جوتشی کہتا ہوں کہ تم نے مشرقی پاکستان میں سرنڈر کرنے کی شرائط ۶۲ میں بنا دی تھیں۔

سوال ... کرنل صاحب موجودہ صورتحال پر کچھ تبصرہ فرمائیں۔

جواب ... یہ دور ہمارے جنرل صاحب کے بقول نظریاتی جنگ کا دور ہے اور آپ جانتے ہیں نظریاتی جنگیں اکیلا فرد نہیں پوری قوم مل کر لڑا کرتی ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ ساری قوم کو اعتماد میں لیا جائے لوگ ملک کے دفاع میں حصہ لینا چاہتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ انہیں ایسا کرنے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ انتہا یہ کہ ایک دور یہاں ایسا تھا جس کو نظم و ضبط کا دور کہا جاتا ہے اس دور میں جو کالجوں کے اندر ٹریننگ ہوا کرتی تھی وہ بھی بند کر دی گئی تھی۔

سوال ... کرنل صاحب اب تو کالج کے ہر نوجوان کے لئے فوجی تعلیم لازمی بن چکی ہے اور نیشنل کیڈٹ سکیم کے تحت نوجوان تربیت حاصل کر رہے ہیں کیا آپ کے خیال میں اس کے بعد آنے والے دور کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔

جواب ... بالکل نہیں یہ کاغذی کارروائی بظاہر بہت خوبصورت نظر آتی ہے لیکن جب تک اس کی جڑیں عوام میں نہیں پھیلتیں یہ سب کچھ بیکار ہے یہ سکیم گاؤں گاؤں قریہ قریہ کوچہ کوچہ پھیلائی جائے تب بات بنے گی۔

سوال ... ہمارے ہاں اب ایک "دفاع" کی اصطلاح مروج ہو گئی ہے جو اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو اس طرح ہے کہ آپ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے دفاع کے لیے متفکر رہے اور اس وقت کے منتظر جب دشمن آپ پر چڑھ دوڑے آپ کیا

سمجھتے ہیں کیا اس طرح دفاع ممکن ہے؟

جواب ۔۔۔۔ دفاع اپنے گھر میں بیٹھ کر کرنے کا کوئی تصور ہی موجود نہیں شاہجہان جب دہلی میں لال قلعہ تعمیر کروا رہا تھا تو اس کے ایک ترک مغل رشتہ دار اسے ملنے آئے شاہجہان نے بڑے فخر سے زیر تعمیر قلعہ دکھایا اور پوچھا کہ بتاؤ یہ قلعہ کیسا ہے؟ اس نے کہا بہت بودا اس میں فلاں کمزوری ہے فلاں خامی ہے وغیرہ وغیرہ تم یہاں سے سلطنت مغلیہ کا دفاع ہرگز نہیں کر سکتے تو شاہجہان نے چڑ کر کہا کہ تم سے کس کافر نے کہا ہے کہ میں اس قلعے میں بیٹھ کر دفاع کروں گا سلطنت مغلیہ کا دفاع تو کوہ ہندوکش پر ہوگا اس کماری میں ہوگا یہ تو ہمارا ایک مورچہ ہے اور بس۔ تو آپ دیکھ لیجیے کہ اسی شاہ جہاں کی اولاد جس نے گھر میں بیٹھ کر دفاع کیا ان کا کیا حال ہوا۔ عالمی تاریخ میں ہمیں دونوں مثالیں ملی ہیں ایک وہ مثال کہ جب تک کوئی ہمارے گھر پر حملہ کرے ہم دفاع نہیں کریں گے۔ جنگ عظیم سے پہلے اس کا ثبوت چیمبرلین کی پالیسیوں سے ہوا جس کا نتیجہ میونخ میں نکلتا ہے اس وقت ان کا بالکل یہی نکتہ نگاہ تھا کہ ہم جارح نہیں ہوں گے ٹھیک ہے ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کیا تو کرے چیکوسلواکیہ پر کیا تو کرے ہم جارحیت نہیں کریں گے۔ اور آپ نے دیکھا ان کا یہ فلسفہ غلط ثابت ہوا کہ چیکوسلواکیہ اور آسٹریا کے بعد وہ نازی ازم کا سیل رواں نہیں رکا اور وہ فرانس اور پولینڈ تک آ گیا اور ہم نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ غرق ہو کر رہ گیا۔ پھر عالمی طاقتیں نہ ہوتیں تو شاید اس کا نام و نشان ہی مٹ جاتا اب ان لوگوں کا نظریہ بالکل الگ ہے انہوں نے روس کو گھیر رکھا ہے چاروں طرف سے اور نئے سے نئے جدید ترین ہتھیار بنا رہے ہیں۔ وہ بھی چیمبرلین کی طرح کہہ سکتے تھے کہ صاحب جب تک روس حملہ نہیں کرے گا ہم خاموش رہیں گے۔ لیکن انہیں معلوم ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔ اچانک حملہ کی صورت میں یہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔

کہوٹہ پر بھارت کا ممکنہ حملہ

پاکستانی فوج کے نامور افسران کے ماہرانہ مشورے

مطبوعہ: ۲۱ جنوری ۱۹۸۵ء

آج ہم لوگ جس مسئلے پر بات چیت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں یہ خالصتاً پاکستان اور ہمارے دفاع کے حوالے سے نہایت اہم بلکہ اب تو سنگین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ آپ حضرات نے حال ہی میں بھارت کے منتخب وزیر اعظم راجیو گاندھی کا نیوز ویک کو دیا ہوا انٹرویو پڑھا ہوگا جس میں انہوں نے دو باتیں کیں۔ ایک تو یہ کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام سے دست بردار ہو جائے اور دوسرا پاکستان جدید اسلحہ لینا چھوڑ دے اس کے ساتھ حال ہی میں جو جاسوسی سکینڈل پکڑا گیا ہے اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوئی کہ ان لوگوں کا وہ منصوبہ جو آج تک ہم سنتے آ رہے تھے کہ وہ اسرائیل کی مدد سے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کا بنا رہے ہیں۔ سننے میں آیا کہ وہ راز بھی چوری ہو گئے ہیں۔ موجودہ سیاسی تناظر اور برصغیر کے حالات روس کی جارحیت اور بھارت کے عزائم کے پس منظر میں دفاعی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرمائیں گے ہم گفتگو کا آغاز جنرل سرفراز سے کرتے ہیں۔

جنرل سرفراز خان ۔۔۔ یہ جو چرچا چلا ہے اب کہ ہندوستان کے چند دفاعی منصوبوں کے راز افشا ہو چکے ہیں۔ ان میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملے کا منصوبہ بھی ہے تو یہ میرے لیے کسی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے دو تین اپنے مضامین میں اس کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آئندہ اگر بھارت اور پاکستان میں کوئی چیز جنگ کا باعث بن سکتی ہے تو وہ اس دفعہ کشمیر کا مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایٹمی تنصیبات

اور شالیمار رشیم ۔ یہ دو ایسے ہمارے کریٹیکل مسئلے ہیں جہاں پر تصادم کے امکانات
ہیں اس سے جنگ بھڑک سکتی ہے ۔ اب کہاں تک یہ خبر جو شائع ہو چکی ہے مستند
ہے ۔ اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک عام سمجھ کا آدمی
جس کو خود ہی حالات سے دلچسپی ہے وہ یہ توقع نہیں کرے گا کہ اگر بھارت کو
یقین ہو کہ پاکستان واقعی ایٹمی توانائی کو بم بنانے یا ایٹمی ہتھیار استعمال کرے گا بجائے
کی سوچ یہی ہو گی کہ پیشتر اس کے کہ پاکستان اس قابل ہو جائے کہ وہ اس قسم
کوئی ہتھیار بنا سکے ۔ ان کی تنصیبات کو ختم کر دیا جائے اور یہ بھی ایک مسلمہ چیز ہے
کہ بھارت نے جو جنگوار طیارے برطانیہ سے خریدے ہیں کچھ آنے ہیں جیگوار
طیارہ ہے جو اس قسم کے حملے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ
اس میں نیچی پرواز کرنے کی صلاحیت ہے اور پھر بار بار اس چیز کا اعادہ ہو
ہو رہا ہے کہ اگر مسز اندرا گاندھی کے ساتھ حادثہ پیش نہ آتا تو اب تک کچھ نہ کچھ
ہو چکا ہوتا لیکن اب ہو سکتا ہے کہ حالات بدل جائیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان رازوں
کے افشا ہونے سے تمام دنیا چونکہ اس کے متعلق چوکنا ہو چکی ہے شاید اتنی جلدی بھارت
اس قسم کے اقدام کرنے کی جرأت نہ کر سکے ۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس معاملے
میں کسی قسم کے تصادم کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔ ہمیں اس کے جواب میں کیا کرنا چاہیے سب
سے پہلی چیز یہ ہے کہ پاکستان کی جو فوجی قوت ہے اس میں بدستور حالات کے مطابق
اضافہ ہوتا رہے اور جدید ہتھیار جیسے جیسے سامنے آتے ہیں ان کے مطابق جو کچھ بھی ہم
حاصل کر سکیں ۔ اب اس بات پر قیاس آرائی کرنا کہ ہماری فوجی تدابیر یا پلاننگ
اس کے متعلق وہ کیا ہے اس پر کسی قسم کی بحث ناممکن ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ
پاکستان کو اپنے دفاع میں اگر اس قسم کی کسی جارحیت کا ارتکاب ہوتا ہے تو فوجی نقطۂ نظر
سے کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے سوائے اس کے کہ دونوں محاذوں پر جو صورت
حال ہے وہ ہماری کمزوری کا باعث بن سکتی ہے ۔ اسکا ذکر میں بعد میں کروں گا لیکن
چیز جو ہم حاصل کر سکتے ہیں غالباً اس کی کوشش ہو بھی رہی ہے اب یہ معاملہ کہاں تک

پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ اسے دکیں قسم کے جاسوسی کے جہازوں کا پاکستان کے لیے
حصول لازمی ہے ۔ اب امریکہ کو قائل کرنے کی بھی کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے
کہ پاکستان کے کوئی جارحانہ عزائم نہیں بہرحال امریکہ اس سے بخوبی آگاہ ہے کہ پاکستان
کے خلاف بھارت کی نیت میں فتور ہے اور اس قسم کا حملہ ہو سکتا ہے ۔ اسرائیل کا اس
میں کہاں تک ہاتھ ہے یہ بات بھی خبروں کے ذریعے منظر عام پر آ چکی ہے کہ بھارت
نے اسرائیل کے ساتھ اس قسم کے تعاون کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے عراق کے
ایٹمی پلانٹ پر اپنا حملہ کیا تھا ان کا کیا منصوبہ تھا اس میں کن کن چیزوں کی ضرورت
ہوتی ہے تو ان کے تجربے سے انہوں نے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے اب
بم بنانے میں اسرائیل کہاں تک ہندوستان کی مدد کر رہا ہے ۔ اس کے متعلق میں
کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ کیونکہ مجھے غالباً یہ چیز اس نقطہ نظر سے ممکن نظر نہیں آتی کہ جب
تک کوئی فوجی معاہدہ یا جب تک اس قسم کا مقابلتاً معاہدہ دونوں ملکوں کے
درمیان نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کا حامل ہو تو اس قسم کے رازوں کو
دوسرے ممالک کے حوالے کرنا یا ان کی مدد کرنا مشکل سا کام ہے ۔ لیکن جہاں تک
مورال سپورٹ کا تعلق ہے ایسے شوروں کا تعلق ہے کس قسم کا انہوں نے پلان
تیار کیا ہے یا کن کن چیزوں کی ضرورت ہے غالباً وہ تو اسرائیل ضرور بھارت کو مہیا
کرے گا تو ایک چیز میں نے عرض کی کہ ہماری اپنی دفاعی صلاحیتوں کو اس ردعمل
کی وجہ سے مضبوط تر بنانا چاہیئے اس میں جس چیز کی کمی ہے اس کا بھی میں پہلے ذکر کر
چکا ہوں اب دوسری چیز جو اس ضمن میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریق
کار ہے کہ جس کے ذریعے بھارت کا پاکستان پر یہ جو ایک قسم کا شک ہے اس کو دور
کیا جا سکے اور اس یقین کو بدلا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی طرف سے
جو اقدامات کئے ہیں پاکستان تو اس میں کوشاں ہے کہ بھارت کو مطمئن کیا جائے
عدم جارحیت کا معاہدہ بھی پاکستان نے آفر کیا پھر پاکستان نے یہ بھی کیا کہ دونوں
ملکوں کی باہمی ایٹمی تنصیبات کا معائنہ کرنے کے لیے آپس میں رضامند ہو جائیں

تیسری بات یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے عدم جارحیت کے معاہدہ کی جتنی بھی کوشش ہو سکتی ہے وہ کی جا چکی ہے اور یہ غالباً جاری رہے گی تو اب جو پاکستان کی دفاعی ... ہیں اور پاکستان کی استقامت اور اس وقت ملک میں جو اندرونی بیرونی معاملات اور سیاسی بحران ہے اس کا مناسب حل لازم ہے۔ کیونکہ اگر یہ صورت حال بنتی ہے یہ صرف فوجوں کا کام نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کریں بلکہ پوری قوم جب تک ایک ... لیے صف آراء نہ ہو گی وہ تو پھر یہ کام ادھورا رہے گا۔ اس کے لیے موجودہ سیاسی تعطل کو دور کرنا ایک لازمی بات ہے۔ پاکستان میں اب ایسی جمہوری طاقت آئے جس پر عوام کا اعتماد ہو ایک اور چیز میں اس ضمن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے ... میں دیکھا کہ ہماری انٹیلی جنس سروسز بہت ہی کمزور ہے اس لیے نہیں کہ ہمارے ... کوئی اس قسم کے قابل افراد موجود نہیں ہیں جو اس کو صحیح طور پر منظم نہ کر سکیں لیکن ... سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ ہمارے پاس اس قسم کا جدید سامان نہیں ہے ہمارے ... اتنا پیسہ بھی نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق خاص توجہ دینی چاہیئے پہلی دو جنگوں میں یہ ہمارا کمزور ترین پہلو تھا اور اس میں مناسب بندوبست کر... چاہیئے۔

سوال ..... ابھی آپ نے فرمایا کہ ان حالات میں عوام کو اعتماد میں لینا ضروری ہے لیکن آپ کوئی تجاویز تو دیں کہ یہ تعطل کیسے دور ہو سکتا ہے۔

جنرل سرفراز خان ... میں تو یہی چاہتا ہوں کہ حکومت اور سیاست دانوں کے ساتھ کوئی مصالحت کی صورت نکلے۔

سوال ... جنرل صاحب ہم خصوصاً انڈیا کے حوالے سے بات کرتے ... ہمارا رویہ خاصا معذرت خواہانہ قسم کا ہوتا ہے اس ملک میں جب وال سٹریٹ جرنل ... پلان نمبر ۱ نمبر ۲ اور پھر امریکن دانشوروں کی طرف سے ایرانی اور پاکستانی بلوچستان کو متحد کرنے کا منصوبہ ایسی چیزیں بھی تو کبھی اور سنی جا رہی ہیں تو آخر ہم یہ کیوں سوچتے کہ ہمارے دفاع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اب دفاع سے آگے بھی کچھ ...

جنرل سرفراز خان ... یہ تو آپ نے بہت ہی اہم موضوع چھیڑا ہے اس سلسلے میں میری رائے محفوظ ہے۔

سوال ... جنرل انصاری صاحب آپ نے جنرل سرفراز خان کے خیالات سنے آپ اس ضمن میں کچھ فرمائیں۔

جنرل انصاری ... میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے فوجی قوت میں اسلحہ میں ترقی رونما ہوئی ہے اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ جاسوسی کے میدان میں بھی ترقی ہو رہی ہے ہر طاقت یہ چاہتی ہے کہ دوسری طاقت کے تمام راز چرا لیے جائیں اور اپنے رازوں کو اخفا میں رکھا جائے اس لیے یہ سکینڈل منظر عام پہ آتے رہتے ہیں بھارت کوشش کرتا ہے ہمارے فوجی راز چرائے اور ہم کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہم ان کے راز چرائیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے تمام ممالک ایسا کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر بھارت یہ کوشش کر رہا ہے کہ ہمارے فوجی راز چرائے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے فوجی رازوں کو اخفا میں رکھنے کا اور موثر طریقہ اختیار کریں جو کمزوریاں اس سکینڈل میں بھارت کے جاسوسی نظام میں سامنے آئی ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنے فوجی رازوں کو مزید صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی کوششوں کو اور بہتر بنائیں اس سکینڈل کی روشنی میں جو چیزیں منظر عام پر آئی ہیں کہ ہم ان کے راز کیسے لیں یہ تو مسلسل بات ہے جو چلتی رہے گی اور چلتی رہنی چاہیئے۔ اب آپ نے اس گفتگو میں یہ فرمایا کہ ہمارا معذرت خواہانہ رویہ ہے یہ ایسی بات نہیں ہے دراصل بات یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ کھل کر بات کرتا ہے اور کچھ تو اپنی طاقت کے بل بوتے پر اور کچھ قوت ایمانی پر بھروسہ رکھتے ہوئے وہ کھل کر بات کرتا ہے لیکن آج کے جدید زمانے میں یہ اچھی بات نہیں ہے اپنی طاقت کو بہت مضبوط کرنا چاہیے لیکن خواہ مخواہ اپنی طاقت کا پروپیگنڈا اپنی طاقت کی گفتگو، اپنی سوچ کو سامنے نہیں آنے دینا چاہیے۔ بھارت اسلحہ کی خرید اور ایٹمی تنصیبات کے بارے میں جو واویلا کر رہا ہے میرے خیال کے مطابق ان کے پاس نیوکلیر صلاحیت ہم سے زیادہ ہے لیکن

نواب نے طویل سانس لیا۔

"دُکھ بھری کہانی ہے ایک۔"

"سناؤ تو سہی۔"

"مَیں قوم کا ترکھان ہوں۔ پچھلے سموں میں جب ووٹنگ ہوئی تھی تو مَیں نے اپنے چوہدری کی خواہش کے خلاف اپنی مرضی کے مطابق بہتر شخص کو ووٹ دیا۔ چوہدری اس پر ناراض ہوگیا اور میرا گاؤں میں کام کرنا بند کرا دیا۔"

ناچار مَیں شہر جا کر محنت مزدوری کرنے لگا۔ مگر اس ظالم چوہدری نے میری غیر موجودگی میں میری بوڑھی ماں اور بیوی کو گھر سے نکالنا چاہا۔ جب انہوں نے انکار کر دیا تو اس بھیڑیے نے انہیں اتنا مارا کہ وہ دونوں مر گئیں۔

نواب جذباتی ہوگیا۔

یہ سرمایہ دار اور جاگیردار اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں میرے بھائی! مجھے جب شہر اس واقعہ کی اطلاع ملی تو مَیں گاؤں آیا اور چودھری، اس کے تین بیٹوں، ایک بیوی اور بیٹی کو اپنے کلہاڑے سے ختم کر دیا۔ تب سے مَیں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اس علاقے میں جو شخص بھی غریبوں پر ظلم کرے گا مَیں اس سے انتقام لوں گا۔

وہ غصے میں اور بھڑک اُٹھا۔

یہ چوہدری، یہ وڈیرے، سرمایہ دار اور جاگیردار، چور ہیں۔ ڈاکو لٹیرے بھیڑیے اور آدم خور ہیں۔ مَیں ان کتوں کے پلّوں سے جینے کی آرزو چھین لوں گا۔ یہ بڑی بڑی توندوں والے جو کبھی میرا نام حقارت سے لیا کرتے تھے۔ اب میرے لیے اپنی اولاد کو ڈراتے ہیں، مَیں موت ہوں اُن کی،

"عذاب ہوں خدائے برتر کی جانب سے"

"مَیں انہیں بتاؤں گا کہ غریب کی آن جب سرِ عام نیلام کی جاتی ہے تو کیا رنگ دکھاتی ہے۔

یہ چور اُچکے۔

یہ ننگ وطن اور قوم

یہ دولت کے پُجاری

یہ خون کے دیوتا

مَیں اُنہیں ادھیڑ دوں گا جس طرح بھیڑیا بکری کی کھال ادھیڑتا ہے۔

مَیں انہیں روئی کی طرح تُوم کر رکھ دوں گا۔

یہ ہم سے جینے کا حق چھینتے ہیں۔

ہمارے منہ سے لقمہ نکال لیتے ہیں۔

یہ فرعون!

یہ نمرود

سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

زیادہ جذباتی نہ ہو۔ ادھر آؤ۔

نواب اس کے ساتھ ہو لیا۔

اگر کہو تو چودھری کے جن چمچوں نے تمہارے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔ پڑے جانے اُنہیں۔ ادھر دیکھو، اس نے اپنے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ میرے پاس ایک رائفل ہے جس میں دس گولیاں ہیں۔ ایک سٹین گن ہے۔

"پھر کیا ہوا؟"

سلیم پھر خاموش ہو گیا۔ اندر کشور دروازے کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔ غفور نے زور دے کر کہا۔

"کیسے آئی پھر چوٹ؟"

سلیم خاموشی کے ساتھ بیلوں کو علیحدہ کرنے لگا۔ کشور بھی جلدی جلدی باہر آئی اور بیلوں کی رسیاں پکڑ کر ناند پر باندھنے لگی۔ سلیم ہل پنجالی اٹھا کر ایک طرف رکھنے لگا تھا کہ گلشن نے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا۔

"بتاتے کیوں نہیں سلیم!"

"بیل نے سینگ مارا تھا ماں!"

"پر ہمارے بیل مارتے تو نہیں؟"

"میں اس کی لٹکی ہوئی رسی ٹھیک کرنے لگا تھا کہ اس نے اپنا سر زور سے اوپر اٹھایا۔ شاید مکھی لڑ گئی تھی اسے۔ اس طرح سینگ میری پیشانی پر لگ گیا اور زخم آ گیا۔"

"اور تم اداس اور غمگین بھی ہو؟"

"نہیں ماں"! وہ برآمدے کی طرف چلا گیا۔

بظاہر اس نے بہانہ بنا کر بات کو وقتی طور پر ٹال دیا تھا۔ مگر غفور اور گلشن کو اطمینان نہ ہوا تھا اور وہ کسی جستجو میں پڑ گئے تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ کو سرخ طوفان پھر سر پر منڈلانے لگا ہے۔ سلیم بے شک اس طوفان کے آگے بند باندھ چکا تھا مگر ان کی تجربہ کار نگاہیں اندازہ لگا چکی تھیں کہ زخم بیل کا لگایا ہوا نہ تھا!

دو دن گزر گئے۔ سلیم چلچلاتی دھوپ میں ہل چلا رہا تھا۔ کشور اسے کھانا کھلا کر چلی گئی ہوئی تھی کہ چودھری کے وہی آدمی غصے میں بولا۔

"ہم نے تمہیں کہا نہ تھا۔ ہل نہ جوتنا؟"

سلیم ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"میں نے بھی کہا تھا کہ میں اپنی زمین ضرور جوتوں گا؟"

"تو اس مار سے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہوا؟"

"دماغ تو پہلے ہی ٹھیک ہے چودھری! پر تم لوگ ہی اسے خراب کر رہے ہو۔"

"تو تم باز نہیں آؤ گے؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ یہ ہل اس وقت اس وقت ہی رکے گا جب میں خود ختم ہو جاؤں گا؟"

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں رکتا تمہارا ہل۔ پکڑ لو اسے اور خوب گرم کرو"

اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سارے بڑے بے رحمی اور بے دردی سے سلیم کو مارنے لگے۔

سلیم مار بھی کھا رہا تھا اور چلا بھی رہا تھا۔

"مارو، خوب مارو؟"

عدالت اگر اندھی ہے۔

قانون کے ہاتھ اگر کٹ گئے ہیں۔

انصاف اگر اندھا ہو چکا ہے تو پرواہ نہیں۔

کہ ان کی جو فضائیہ ہے . . . آپ دیکھیں عراق پر حملہ ہوا اس پر عراق نے احتجاج تو کیا اور شور مچایا ہمارے وزیر خارجہ سے جب نیویارک میں اس بارے میں پوچھا گیا کہ اگر ایسا حملہ آپ کی تنصیبات پر بھی ہو سکتا ہے تو انہوں نے جواب دیا اگر پاکستان پر اس قسم کا حملہ کیا گیا تو ہم نے علانیہ کہہ دیا ہے کہ یہ بھارت کے ساتھ کھلی جنگ ہو گئی۔ دوسرا یہ ہے کہ بھارت اس کوشش میں ہے کہ ہماری بالادستی قائم رہے اب بالادستی قائم رکھنے کے لیے وہ کتنی جدوجہد کر رہے ہیں انہیں پتہ ہے کہ وہ ہماری افرادی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہ تو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے قطع نظر ۱۹۶۵ء کی جنگ کو آپ دیکھیں اگر وہ ہم پر بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں وہ صرف جدید ترین اسلحہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت حالات ایسے ہو گئے ہیں جدید ترین ہتھیار آ رہے ہیں تو اب ہم امریکہ سے توقع کر رہے ہیں جبکہ ۱۵۵ ملی میٹر کی توپیں جو کہ دنیا میں موثر ترین توپ خانہ مانا جاتا ہے وہ ہمیں ملنے کی امید ہے لیکن جدید ہتھیاروں کے لیے انڈیا نے ساری دنیا چھان ماری ہے ابھی پچھلے دنوں اخبار میں تھا کہ وہ یورپ سے ۱۵۵ ملی میٹر کی توپیں جو کہ ہماری توپوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں حاصل کر رہا ہے اب دیکھیں ۱۹۶۵ء میں ہمارے پاس بہترین اسلحہ تھا ان کے پاس دوسری جنگ عظیم کی توپیں تھیں ہمارے پاس امریکہ کی توپیں تھیں ہمارے توپ خانے نے ہر جگہ پر ان کو بری طرح سے شکست دی۔ اب یہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ہتھیار بھی اچھے ہوں اور ان کی افرادی قوت بھی ہم سے اچھی ہے۔ تو جیسے جنرل انصاری صاحب نے فرمایا ہے ہمیں جدید ترین اسلحہ پر زور دینا چاہیے لیکن جو چیز ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فیصلہ کن ہو گی وہ ہتھیاروں کی زیادتی ہو گی اور میں سمجھتا ہوں ملک میں نمائندہ حکومت ہو اور حکومت کو عوام کی تائید حاصل ہو اس صورت میں ملک مضبوط ہوتا ہے جیسا کہ سرفراز صاحب نے فرمایا کہ اب جنگوں میں فوجیں نہیں لڑتیں قومیں لڑتی ہیں تو پاکستانی قوم جو ہے بطور قوم تب ہی لڑ سکتے ہیں کہ اگر ایسی حکومت ہو جن کی سربراہی وہ لوگ کریں جن پر عوام کا مکمل اعتماد ہو اور چنے ہوئے نمائندے ہوں اور وہ ان کے کہنے پر اپنی جانیں تک قربان کر سکیں۔

سوال . . . آپ نے فرمایا کہ جنگ جیتنے کے لیے جدید ترین اسلحہ ہونا چاہیے اور فوج کو مزید تربیت بھی دینی چاہیے لیکن ہمارے لیے یہ مسئلہ ہے کہ جب سے مارشل لاء لگا ہے تو ہماری فوج دو حصوں میں بٹ گئی ہے زیادہ تر انتظامی معاملات میں ہیں اس حوالے سے کیسے ممکن ہے کہ فوج یکسوئی سے تربیت کی طرف توجہ دے؟

. . . . بریگیڈیئر امجد چوہدری . . . جب ہم فوج میں تھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ دنیا بھی باہر ہے یا نہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اب نظریات بدل چکے ہیں اب کہتے ہیں کہ ملک کے جو اندرونی مسائل ہیں ان پر بھی نظر ہونی ہے۔

جنرل سرفراز خان . . . جب ہم داخلی ڈیڈ لاک کی بات کرتے ہیں تو اس میں یہ امر بھی شامل ہے کہ اگر ملک میں ڈیڈ لاک ہے سیاسی انتشار ہے تو اس سیاسی انتشار کو روکنے کے لیے آپ کے پاس ذرائع ہیں ان میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ بار بار فوج کو اقتدار سنبھالنا پڑتا ہے۔ اگر فوج اس کام میں استعمال ہوتی ہے وہ تو دفاعی نقطہ نظر سے واقعی اس میں کمزوری ہے ہم سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی ڈیڈ لاک کو کسی نہ کسی طریقے سے ختم ہونا چاہیے۔ اب یہ کس طریقے سے ختم ہونا چاہیے یہ اتنا بڑا لمبا اہم دقیق مسئلہ ہے اس کا کوئی تیار شدہ منصوبہ تو ہمارے پاس نہیں ہے اگر آسان سے آسان طریقہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کریں وہ یہی ہے کہ سیاست دان اور حکومت بیٹھ کر کانفرنس کریں اور اس بات کو طے کریں۔

جنرل انصاری معاملہ اتنا الجھا ہوا ہے قومی نقطہ نظر اتنا اہم ہے کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیے۔ ماضی کے حقائق کو بھی نظر انداز کر دینا چاہیے جو کچھ بھی ہے ہمیں ساری توجہ مستقبل پر مرکوز کرنی چاہیے۔ اور اس ڈیڈ لاک کو ہر صورت ختم ہونا چاہیے۔

سوال . . . جنرل انصاری صاحب آپ کے نزدیک پاکستان میں فوج کا کیا کردار ہونا چاہیے۔

جنرل انصاری . . . یہ بڑی لمبی بحث ہو جائے گی بہر حال فوج کا کردار یہی ہونا چاہیے کہ جو حکومت برسر اقتدار ہو اس کی وفادار رہ کر ملک کے دفاع کا پورا انتظام کرے اور

اس کے لیے تیار رہے اور ہماری فوج کا یہی طریقہ رہا ہے اگر حقیقت دیکھیں تم اس کو عراق مت سمجھو یہ پاکستان ہے میرے خیال میں یہ ان کا اصلی لڑائی کے لئے آغاز

اس میں فوج ملوث نہیں رہی۔ ہمارے ہاں فوج کا یہی طریق کار رہا ہے کہ جو سیٹ اپ ز کرنے کا بہانہ تھا۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ اگر اندرا گاندھی ۳۱ اکتوبر کو قتل نہ ہوتیں۔

ہوتا ہے وہ ضرورت کے مطابق مارشل لاء لگاتا ہے چند لوگ اس میں ملوث ہوتے ہیں تو یکم اور پانچ نومبر کے درمیان مکمل طور پر حملہ بھارت اور روس کی طرف سے ہم پر

باقی فوج تو اپنا کام کرتی رہتی ہے اب بھی فوج اپنا کام کر رہی ہے فوج نے ہمیشہ شروع ہو جاتا تھا ہندوستان کو اپنے اندرونی حالات درست کرنے کے لیے بڑا اچھا

اقتدار حکومت کا ساتھ دیا ہے اور یہی فوج کا کردار ہونا چاہیئے۔

ٹارگٹ ہمیشہ پاکستان مل جاتا ہے قوم کو دوبارہ منظم کرنے کے لیے۔ دوسرا ہندوستان

سوال ... بریگیڈیئر امیر جان صاحب آپ اس سلسلے میں کیا فرمائیں گے: اور روس کی تیاری قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ تیسرا موسمی حالات کی وجہ سے بھی یہ

بریگیڈیئر امیر جان۔ سب سے پہلے تو یہ ایٹمی تنصیبات چلے پشت پناہی فرا موزوں ترین سال کا حصہ ہوتا ہے۔ جب کہ دریاؤں میں پانی کم ہوتا ہے اور چاول

طور پر بھارت نہیں کر رہا اس کے ساتھ اسرائیل بھی ملوث ہے کیونکہ انہوں نے کی فصل کٹی ہوتی ہے زمین کو ایک دفعہ دھوپ لگ جائے تو اس پر ٹینک بھی جا سکتا

بڑا کامیاب تجربہ بغداد میں کیا تین مسلم ممالک کے اوپر سے اپنے ہوائی جہاز اڑا کر ان ہے تو ان وجوہات کی بنا پر میرا اپنا اندازہ ہے کہ یہ اس نے بالکل یکم اور پانچ نومبر

کا ایٹمی پلانٹ تباہ کر کے واپس آئے اور ان پر ایک گولی بھی نہیں چلی ان کا مقصد یہ درمیان حملہ کرنا تھا تاکہ ریگن کے الیکشن سے اور اس آخری ہفتے میں امریکن قوم اپنے

صرف ایک تھا۔ الیکشن میں مصروف ہوتی ہے اور اس کنفیوژن سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے

کہیں اس عالم اسلام میں ایٹم بم ان کے ہاتھ نہ آ جائے اگر آ جائے تو ان کے خلاف استعمال

حملہ کر دینا تھا۔

نہ ہو اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے اسرائیل کی یہ انتہائی کوشش ہے کہ پاکستان بھی جیسے جنرل صاحبان نے فرمایا ہے کہ ان کی انتہائی کوشش ہے کہ ہم کسی سٹیج

یہ صلاحیت حاصل نہ کرے کہ اس کے پاس ایٹم بم بن جائے اور ان کا بڑا اچھا دست ہے یہ ان کی برابری نہ حاصل کریں ہم کو چار ہتھیار ملتے ہیں ادھر جنگ کا واویلا شروع

ہندوستان ان کی جیب میں ہے یہ دونوں مل کر انتہائی یہ کوشش کی ہے اور ہو جاتا ہے صرف اپنے پروپیگنڈہ کو تیز کر کے عوام کا دھیان ہٹانے کے لیے واویلا شروع

سنا ہے کہ ستمبر کے تیسرے ہفتے میں ایک سکواڈرن نے حملہ کرنے کی کوشش بھی کی کر دیتے ہیں اور جہاں تک سیاست کا تعلق ہے جنرل انصاری نے جو فرمایا بالکل صحیح

جیگوار سکواڈرن آیا اور جب ان کو پتہ چل گیا کہ ہمارے ایف ۱۶ پہلے سے ہوا میں ہے کہ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں ایٹم بم سے بھی زیادہ کوئی اور چیز بنا سکتے ہیں۔ تو وہ

موجود ہیں تو وہ کابل چلے گئے ان کے لیے ایک تو ہوائی حملے کا راستہ بڑا مختصر ہے بھی بنانی چاہیئے اور ان کی جو تنصیبات ہیں ان میں بہت تبدیلیاں اور ایمپرومنٹ کی

سری نگر، اکھوڑا اور پھر کابل یا واپس۔ امریکن پریس میں یہ بات بڑی پھیلی ہوئی تھی کہ ضرورت ہے۔ پھر وہ سیاسی پہلو جو اس کا ہے اس میں سب سے پہلے جو ہمارے

جیگوار سکواڈرن بالکل غائب ہو گیا ختم ہو گیا۔ اس کا کیا ہوا اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا: کہ ہونا چاہیئے قومی یک جہتی جو کہ ایٹم بم سے بھی طاقتور ہے اگر وہ ہم پیدا کر سکیں

جا سکتا لیکن انہوں نے کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن جب انہیں پتہ چل گیا کہ ہماری ایٹمی ہماری بدقسمتی ہے کہ نا اہل اور خود غرض سیاست دان صرف اپنی خود غرضی کی وجہ سے

تنصیبات کا نظام اتنا فول پروف ہے کہ فوراً اطلاع ملتے ہی فوراً ہوا میں چلے گئے اس ملک کے ساتھ تجربے کرتے رہے ہیں اور مارشل لاء کا جہاں تک تعلق ہے میں

کے علاوہ زمینی جو دفاع تھا ہمارا اس کے بارے میں روس نے ان کو رائے دی کہ خبردار ایک فوجی کی حیثیت سے ایمانداری سے کہتا ہوں کہ ہمارا مارشل لاء سے کوئی تعلق نہیں

ہونا چاہیئے ہمارے سپاہ فوج کی ڈیوٹی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ پانچ جولائی کو عارضی طور جہاں کہیں کوئی تکلیف ہوئی وہاں تھوڑی دیر کے لیے گئے اور واپس آگئے لیکن ہم کو بوجہ مجبوری مارشل لاء لگانا پڑتا ہے اور رہنا پڑتا ہے تاکہ ملک میں خانہ جنگی نہ ہو۔ اس سے ہم خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سے ہمارا دھیان جنگی تربیت کی بجائے دوسری طرف ہو جاتا ہے اور بعد میں مضر اثرات ہو سکتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ چاہیئے کہ قومی یکجہتی حاصل کریں اور سیاست دانوں اور موجودہ حکومت کو اللہ تعالیٰ یہ ایسا سبق دے کہ وہ باہمی افہام تفہیم سے اس سیاسی انتشار کو حل کریں کیونکہ ہماری سب سے پہلی ضرورت قوم کی یکجہتی ہے۔

ہماری دفاعی تقاضے

ریٹائرڈ فوجی افسران کی ماہرانہ رائے

مطبوعہ: نومبر ۱۹۸۵ء

سوال۔۔۔۔ ہم اس ایوان میں مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں ہمارا آج کا موضوع ہے ہمارے دفاعی تقاضے"۔۔۔۔

دفاعی تقاضوں کا مقصد جنگی تیاریاں نہیں مگر ہمارے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے جس طرح پاکستان پہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے ملکی سالمیت کا تقاضا ہے ہم خاموش نہ بیٹھیں۔ ایک ملک سے ہم معاہدہ عدم جارحیت اور مسئلہ کشمیر کے حل اور دوسرے سے افہام وتفہیم کے ذریعے افغان مہاجروں کی باعزت واپسی کی امید لگائے بیٹھے ہیں وہ ہماری کسی بات پہ توجہ نہیں دے رہے۔

جس طرح ہم نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اپنا دفاع کیا حق تو یہ ہے کہ حق ادا ہوا ہمارا شمار ہر صورت میں پرچم بلند رکھنے والے جانبازوں میں ہوا۔ ۶ ستمبر ۶۵ء جسے ہم یوم دفاع پاکستان کے نام سے یاد کرتے ہیں ہمیں بہادری اور جاں نثاری کے تاریخ ساز واقعات کی یاد دلاتا ہے دنیا کی عسکری تاریخ ہمیں شاندار اور جاندار الفاظ میں ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں کہا کہ دفاعی تقاضوں کا مقصد یہ ہے کہ ہم وطن کی سالمیت کو ہر چیز پر مقدم رکھیں جیسا کہ حال ہی میں جناب میر علی احمد تالپور وفاقی وزیر دفاع نے بھی کہا ہے کہ ہم جنگ نہیں چاہتے مگر ملک کی سالمیت کے فریضے سے غافل نہ ہوں گے۔۔۔۔

پاکستان دو فرلیقوں بھارت اور روس کے کھوے گئے" دو محاذوں کا
کر رہا ہے مگر حالت یہ ہے کہ ہم اپنے دفاع کے لیے ایک کل پرزہ بناتے ہیں یا
سے خریدتے ہیں تو اس پر ہمیں علاقائی امن کو خطرے میں ڈالنے کا طعنہ دیا جاتا
حالانکہ ایک ملک سپر طاقت ہے دوسرا ملک اسلحے کے انبار لگا رہا ہے مہلک ہ
کی تیاری میں بھی لگا ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں دنیا کی رائے عامہ کی توجہ بار بار اس طرف مبذول کرانی
بھارت اور روس بار بار ہمارے خلاف الزام لگا رہے ہیں کہ پاکستان امریکہ اور چین
مل کر امن عالم کو تباہ کر رہا ہے۔

گزشتہ روز وفاقی وزیر دفاع نے کہا ہے کہ" پاکستان اپنے علاقے پر افغانستان
کی مسلسل بمباری اور گولہ باری کے خلاف مناسب وقت اور مناسب انداز میں
دفاع کے لیے کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

ان سطور کی روشنی میں آپ سب حضرات صاحب الرائے ہیں اظہار خیال
میں ان نکات کو بھی ملحوظ رکھیں۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سرفراز خاں۔ جب ہم دفاع کی بات کرتے ہیں تو
بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ دفاع کس لیے اور کس قسم کا ہو۔
پاکستان کی جو موجودہ صورت حال ہے جغرافیائی اور نظریاتی نقطہ نظر سے یا
مخصوص ماحول کے نقطہ نظر سے جس میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔

دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دفاع اب صرف افواج کا
نہیں ہے بلکہ جدید جنگوں میں یہ ایک ہمہ گیر تصور ہے جس میں پوری قوم پوری
سے حصہ لیتی ہے اور اس کی مثال جیسے کہ آپ نے اپنے مختصر اقتباس میں دی
کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس کا مظاہرہ ہو چکا ہے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس
جو خطرات منڈلا رہے ہیں وہ محض ایک اختراع ہیں ایک موہوم سا خطرہ
جس کی حقیقت اتنی نہیں ہے جتنی بڑھا چڑھا کر بیان کی جا رہی ہے۔ میں

نظریے سے اتفاق نہیں کرتا جو لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ خطرات کو بڑھا چڑھا
کر پیش کیا جا رہا ہے میرے خیال میں وہ خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں اور حقیقت
سے گریز کر رہے ہیں۔ ہم اپنی مشرقی اور مغربی دونوں سرحدوں کی طرف جب نگاہ
کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق میں بھارت اور یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ
کہنا پڑتی ہے۔ کہ جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے بھارت ہم سے
الجھتا رہا اور ہمیشہ پاکستان کی حق تلفی ہوتی رہی۔ سب سے پہلے تقسیم کا مسئلہ اس میں
ڈنڈی ماری گئی پھر کشمیر کا مسئلہ یہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب سے پاکستان بنا
ہے اور اب تک حل نہیں ہو سکا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند میں ایک
شق ایسی رکھی گئی جس میں کہا گیا کہ آئندہ تمام متنازعہ مسئلے فریقین افہام و تفہیم سے طے کریں
گے اور یہ پہلی بار کشمیر کے مسئلہ کو کولڈ سٹوریج میں ڈالنے کی کوشش تھی۔ اس کا جو رد عمل
پاکستان میں ہوا وہ سب کے سامنے ہے قوم نے اس کو سراسر مسترد کر دیا اور مرحوم صدر
ایوب خاں کے خلاف جو تحریک چلی اس میں ایک بہت بڑا عنصر معاہدہ تاشقند تھا اس
کے بعد معاہدہ شملہ آتا ہے اس میں بھی زیادہ صاف الفاظ میں یہی کوشش کی گئی کہ
کشمیر کے مسئلہ کو یا دوسرے مسائل کو جو دونوں ملکوں کے درمیان ہیں ان کو باہمی
افہام و تفہیم سے حل کیا جائے اس کے خلاف بھی قوم نے احتجاج کیا لیکن جو بعد کے
واقعات ہیں ان میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر پاکستان کی طرف سے بھی کشمیر کا مسئلہ
بین الاقوامی سطح پر اور دوسری سطح پہ شاذ و نادر اٹھا ہوگا جب ایک دو مرتبہ ذکر
ہوا تو بھارت نے اس کی شدید مذمت کی اور پاکستان خاموش ہو گیا۔ اور اس کے
کلائمیکس کا وقت تھا جب کہ غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس ہوئی۔ ہمارے صدر
صاحب اس میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور انہوں نے وہاں جو
خطاب کیا اس میں کشمیر کا سرسری ذکر تھا جو بھارتی حکومت کو پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا
لیکن اس کے رد عمل کے طور پر مسز اندرا گاندھی نے جو اس میٹنگ کی صدر تھیں جب
صدر تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو واک آوٹ کر گئیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ

نے لاٹھی بھی تھام رکھی تھی جس کے سہارے وہ چل رہا تھا۔

اندر آتے ہی اس نے کشور کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیسی ہو بیٹی!"

کشور نے اس کے سر سے گٹھڑی اتاری۔

"ٹھیک ہوں بابو!"

غفور کو لاکر اس نے پلنگ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ماں کا کیا حال ہے بابو! اس کو بھی ساتھ لے آتے؟"

"گھر پر بھی تو کسی کو رہنا چاہیئے تھا۔"

"کیوں! ظفر، بشیر اور شبیر تو ہیں۔"

"وہ تو بیٹی! ——— غفور رُک گیا۔ شاید بات کو دبانا چاہتا تھا

کشور فکرمند ہو گئی۔

"کہاں ہیں وہ؟"

غفور غمگین سے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو بابو! بولو نا" کشور نے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔"

"کیوں نہ پوچھوں بابو!"

"وہ مفرور ہیں آج کل۔"

کشور بجھ سی گئی۔

"مفرور ہیں، پر کیوں؟"

"انہوں چودھری حاکم کے بیس آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ وہ چودھری حاکم اور اس کے بیٹوں کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے مگر وہ تینوں بچ گئے۔ چودھری کے آدمیوں نے ظفر کا ہل روکا تھا۔ بس اسی پر بات بڑھ گئی۔"

رو دینے والی سی آواز میں کشور نے پوچھا۔

"کہاں ہیں وہ ان دنوں؟"

"بس جگہ جگہ چھپتے پھرتے ہیں۔ پر تم اس بات کا ذکر سلیم سے نہ کرنا وہ خواہ مخواہ ہی فکرمند رہے گا۔ میں جب چلا جاؤں تو میرے بعد بیشک بتا دینا۔ پھر اسے گاؤں کی طرف نہ آنے دینا۔ میں جانتا ہوں کس حال میں گاؤں کے اندر میں رہ رہا ہوں۔ چودھری کے آدمی ابھی تک اس لیے نہیں بول رہے کہ مظفر۔ بشیر اور شبیر زندہ ہیں اور وہ کسی وقت بھی ان کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔"

"اپنی زمین کا کیا ہوا؟"

"ابھی تک تو ویسے ہی پڑی ہے۔ کسی کو حصے پر دینے کی بات کرونگا۔"

"اور ہمارے بیل بابو!"

"انہیں بیچ دوں گا بیٹی! جی تو نہیں کرتا کہ جو پیشہ ہمارے آباؤ اجداد برسہا برس سے کرتے آئے ہیں اسے چھوڑ دیں۔ پر کیا کروں تقدیر نے ہمیں ایسا آن لپیٹا ہے کہ ہر کام ہماری مرضی کے خلاف ہی ہو رہا ہے۔

کشور کا سر جھک گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھی آگئے تھے۔

جس مسئلہ کا بہت کم ذکر کیا جاتا ہے وہ بھارتی مسلمانوں کا مسئلہ ہے جو
کم ازکم میں شدت سے محسوس کرتا ہوں جس وقت پاکستان کی تحریک چلی میں ا
وقت بریگیڈ میجر تھا اور میں نے یوپی علی گڑھ بہار اڑیسہ میں چلائی گئی پاکستان
تحریک کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ان لوگوں نے پاکستا
بنانے کے لیے بہت قربانیاں دیں اور یہ جانتے ہوئے قربانیاں دیں کہ ان کا ا
میں کوئی حصہ نہیں ہوگا کم ازکم یوپی کے لوگ جانتے تھے کہ وہ پاکستان نہیں جائیں
لیکن پھر بھی انہوں نے قربانیاں دیں اور اب ان پر جو مظالم ڈھائے جارہے
وہ آپ کے سامنے ہیں ہم اپنے فرض کو بھول گئے ہیں ان کے ہمارے پر حقوق ہیں
جب ان پر مظالم ہوتے ہیں تو کیا ہم نحیف سی آواز بھی نہیں بلند کرسکتے۔

اگر ہم احتجاج کرتے ہیں تو بین الاقوامی نقطہ نظر سے یہ گناہ نہیں ہے۔۔۔ یہ
انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے اور ہر ملک اس کو تسلیم کرتا ہے پھر سب سے بڑی بات
یہ ہے کہ لیاقت نہرو پیکٹ میں ایک شق موجود ہے کہ دونوں ممالک میں کسی اقلیت
کے ساتھ اگر کوئی ناانصافی یا ظلم ہوتا ہے تو دوسری حکومت اس پر احتجاج کرے
ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم کوئی آواز نہیں اٹھاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت
افسوس کا مقام ہے۔

اب آخری مسئلہ نو وار پیکٹ (جنگ نہ کرنے کا معاہدہ) کا ہے۔ میر
شروع سے ہی یہی موقف رہا ہے کہ بھارت کبھی بھی اسی کو تسلیم نہیں کرے گا
وہ کسی نہ کسی بہانے اسے نظرانداز کرکے چھیڑ خانی کرتا رہے گا اور انکار اس لیے
نہیں کرتا کہ بین الاقوامی طور پر اسے مذمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اس لیے
نہیں کرے گا کہ ہم نے تو جو اسلحہ باہر سے لینا ہے خواہ امریکہ سے لیں یا روس سے
اس لیے لے رہے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہم
تو نہیں چاہتے لیکن ہم کمزور بھی نہیں رہنا چاہتے۔

اگر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوتا ہے تو اندرا گاندھی کو جو ایک موقع

ہے کہ اس چیز کو سامنے رکھ کر وہ ہر وقت پاکستان پر اعتراض کرتی رہتی ہے وہ چیز
باقی رہے گی اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس معاہدے کے باوجود اگر کوئی ملک حملہ
کرنا چاہتا ہے تو یہ کاغذ کا پرزہ حائل نہیں ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں یہ
معاہدہ نہیں ہوگا اور اس نے اپنے عمل سے واضح بھی کردیا ہے۔

اب ہماری طرف سے بار بار جنگ نہ کرنے کا معاہدہ پیش کیا جارہا ہے اور
ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی چیز اپنے قومی وقار کے خلاف نہیں کی جائے گی۔ مجھے
نہیں معلوم کہ قومی وقار سے اور کس طرح کھیلا جائے گا۔ کہ ہم بار بار جھولی پھیلا کر معاہدے
کی بھیک مانگ رہے ہیں اور وہ ٹھکراتے جاتے ہیں تو اس سے زیادہ قوم کے وقار
کے منافی بات کیا ہوگی۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت بھارت پر روس کا دباؤ ہے
جسے بھارت کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا اور روس کے مفاد میں یہ جنگ
نہ کرنے کا معاہدہ نہیں جاتا۔ اس لیے کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ پاکستان اس وقت دونوں
سرحدوں پر پھنسا ہوا ہے اس صورت حال میں وہ افغانستان پر کوئی ایسا سخت
اقدام نہیں کرسکتا جو روس کی مرضی کے خلاف ہو اور روس یہ بھی جانتا ہے کہ اگر
پاکستان پر زیادہ دباؤ ڈالا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت سر تسلیم خم کرے بھارت
کے ساتھ مسائل ایسی سنگین صورت اختیار کرتے جارہے ہیں جن کا حل "تلاش کرنے
سے بھی نہیں مل رہا اور ہم بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہتے کہ ہم بھارت
سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو اس چیز کو بڑے متوازی طریقے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت افغانستان میں اپنے قدم مضبوط بنانے کی کوشش میں ہے اور
میرا خیال ہے کہ روس اس موقع پر پاکستان میں کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھائے گا۔
اب اس کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ افغانستان میں پہنچ کر اس نے کیا حاصل کیا اور
جو مقصد اس کے ذہن میں تھا وہ پورا ہوگیا اور اسے واپس جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے
کہ صرف افغانستان میں پہنچنے سے روس کے مسائل حل نہیں ہوجاتے وہ رسائی

چاہتا ہے بحر ہند اور بحر عرب کے پانیوں تک اور اس لیے نہیں کہ اسے گرم پا[نیوں] کی ضرورت ہے یعنی اس کے جہاز سردی سے کانپ رہے ہیں اور ان کو گرم کر[نا] بات تو یہ ہے کہ مغربی دنیا اور مشرق وسطیٰ کے جو اہم ترین مقامات ہیں وہ ان گرم پانیوں کے سمندروں کے ساحلوں پر واقع ہیں اور روس کی نظر ان پر ہے اگر وہ ان کو حاصل نہیں کر سکتا تو وہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کی دسترس سے باہر میرا تجزیہ تو یہ ہے کہ روس افغانستان سے اگر نکلا بھی تو بہت دیر سے بلکہ بعد نکلے گا۔

ہم جب بھارت اور روس کے ساتھ پرخاش کی بات کرتے ہیں اور کشمیر مسائل کی بات کرتے ہیں کہ جنگ چھڑنے کا باعث یہ باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن میری نظر جو خطرہ ہے جنگ چھڑنے کا وہ یہ ہے کہ پاکستان کی جو ایٹمی قوت میں ترقی ہے اور پاکستان سے ایٹم بم بنانے کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں خیالات ہیں۔ بھارت حتیٰ کہ امریکہ کے ذہن میں وہ بہت خطرناک صورت حال ہے۔ اگر بھارت نے پاکستان کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے پاکستان بم بنانے کی کوشش کرے یا اس قابل ہو وہ کوشش کرے گا کہ پاکستان کو اس پہلے تالو کرے اور روس کی اس میں شہ ہو گی۔ روس خود شاید پاکستان پر حملہ نہ کرے لیکن وہ یہ کر سکتا ہے کہ مغربی سرحدوں پر دباؤ قائم رکھتے ہوئے ہندوستان کو دے کہ وہ جو چاہے کرے اور یہ بہت بڑی بات ہو گی۔۔ ایک اور چیز جو جنگ کا باعث ہو سکتی ہے وہ شاہراہ ریشم ہے یہ روس کے دل میں بھی کھٹک رہی ہے بھارت کے بھی۔ وہاں سے چھیڑ خانی بھی ہوتی رہتی ہے جس گلیشیر کا ذکر کیا جا ہے وہ گلیشیر تقریباً دو سو مربع میل پر پھیلا ہوا تھا اور اب وہ بھارت کے قبضے ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیئے اور ہمیں کیا کرنا چاہ[یئے] اس میں ایسی باتیں آتی ہیں جن کو میں اپنے نقطۂ نظر سے چار حصوں میں تقسیم کرتا پہلے ہمیں اپنی نظریاتی سرحدوں کا تعین کرنا چاہیئے۔

دوسری بات داخلی مسائل ہیں۔ اندرونی طور پر ہمارے مسائل حل ہونے چاہئیں اور ملک کے اندر مکمل یکجہتی اور یگانگت ہونی چاہیئے۔ تیسری بات ہے ہماری خارجہ پالیسی۔۔۔۔ خارجہ پالیسی اور دفاع کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر خارجہ پالیسی کمزور ہے تو دفاع قدرتی طور پر کمزور ہو گا۔ ہم دوستوں سے کٹ جائیں گے اسلحہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمارے اقتصادی حالات میں بھی تبدیلی ہو گی اس لیے خارجہ پالیسی بہت مضبوط ہونی چاہیئے۔ چوتھی چیز خود فوج ہے فوج کی صلاحیتیں خواہ وہ اسلحہ کے نقطۂ نظر سے ہوں خواہ وہ ان کی نفری کے نقطۂ نظر سے ہوں یا ان کے مورال کے نقطۂ نظر سے ہو۔ یہ سب چیزیں مل کر ہمارے دفاع کے لیے بہت ضروری ہیں اگر ان میں ہم آہنگی اور رابطہ ہے تو پھر ہم یقینی طور پر اپنے ملک کا دفاع کر سکتے ہیں۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ ہم چھوٹے ہیں اور بھارت بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ جغرافیائی اعتبار سے بھی بڑا ہے اور آبادی کے لحاظ سے بھی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جب پانچ کروڑ قوموں کی زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے تو بڑائی ختم ہو جاتی ہے اس لیے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہم بھی بڑی طاقت ہیں اور اگر ہم آپس میں یگانگت اور محبت سے اتحاد پیدا کریں تو کوئی طاقت ہمیں چیلنج نہیں کر سکتی۔

سوال۔۔۔:۔۔ جنرل انصاری صاحب جنرل سرفراز صاحب نے بڑی تفصیل سے جن خطرات و خدشات کی نشاندہی کی ہے ان کی روشنی میں ہمارے دفاعی تقاضے کیا ہونے چاہئیں۔؟

میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم ایچ انصاری۔۔۔ پاکستان کے دفاعی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے دفاعی نقطۂ نظر سے جو موجودہ ملکی حالات ہیں ان کا ہم احاطہ کریں۔۔۔ جنرل سرفراز صاحب نے بڑی تفصیل سے ان کا احاطہ کیا ہے میں ان کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطرات کا تعین ہو جائے تو بچاؤ کا منصوبہ اور تدبیر آتی ہے۔ تسلسل نہیں رہتی کیونکہ بچاؤ کا انحصار خطرے کی نوعیت پر ہے۔ مشرق میں ہمیں ایسی قوم سے پالا پڑ گیا ہے جس نے پاکستان کے وجود کو نہ کبھی

پلکیں پھر بھیگ رہی تھیں۔
سلیم نے نہ جانے کیا سوچا اور چائے پینے لگا۔

(۱۳)

کھانا کھانے کے بعد سلیم اور کشور اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔
کشور نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔
"رات کے اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"
سلیم اُٹھ کھڑا ہوا۔
"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔"
کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ پتہ نہیں کون ہے۔ پہلے اچھی طرح

اطمینان کر کے پھر دروازہ کھولیں گے۔"
دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر سلیم نے پوچھا۔
"کون ہے؟"
باہر سے رازدارانہ سی آواز آئی۔
"دروازہ کھولو سلیم!"
سلیم آواز پہچان گیا تھا۔ اس کے بڑے بھائی ظفر کی آواز تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ظفر اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے سلیم سے بُری طرح لپٹ گیا۔
اس نے اپنے آپ کو ایک بھاری کمبل چھپا رکھا تھا۔ سلیم سے علیحدہ ہو کر اس نے کشور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں کے ساتھ اندر آکر بیٹھ گیا۔
سلیم اُسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔
"کیسے ہو تم دونوں۔" ظفر نے پوچھا۔
سلیم کے بجائے کشور بولی۔
"بس ٹھیک ہیں بھائی جان!"
سلیم نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"یہ آپ لوگوں نے کیا کر لیا بھائی جان!"
"بس جو ہونا تھا ہو گیا۔"
"چودھری کے آدمیوں نے تمہارا ہل روکا تھا۔"

قومی یکجہتی میں دراڑ پیدا ہو گئی تھی اور اسی دراڑ کا نتیجہ ملک کے دو لخت ہونے کی صورت میں نکلا۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پوری قوم کو اپنی یکجہتی کا دفاع کرنا ہوگا اور بات سوچ لینی چاہیئے کہ فروعی اختلافات اتنے شدید نہ ہو جائیں کہ ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔ ہمارے آپس کے اختلافات خواہ کتنے ہی شدید ہوں لیکن کی سالمیت کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیئے۔

میری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ جتنے بالغ مرد ہیں ان کے لیے فوجی ٹریننگ لازمی قرار دی جانی چاہیئے کیونکہ فوج تو سرحدوں پر یا سرحد کے پار لڑا کرتی ہے اور اندر کے جتنے کام ہونے ہیں وہ شہریوں کو کرنے ہوتے ہیں اس لیے شہریوں کو ٹریننگ ضرور دینی چاہیئے۔ اس وقت کالجوں میں اس کا انتظام ہے لیکن میرے خیال میں یہ خانہ پری ہے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں ہوتا۔

افواج پاکستان اور عوام کا آپس میں مالک اور چوکیدار کا رشتہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یک جان دو قالب کا رشتہ ہونا چاہیئے۔ اسی سے یکجہتی پیدا ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ فوج کو تنخواہ دی جاتی ہے اس کا کام ہے لڑنا اور باقی کسی کی ذمہ داری نہیں ہے ۔ ۔ ۔ یہ سوچ غلط ہے یہ رشتہ تو ایسا ہونا چاہیئے کہ ایک گھر کو بچانے کے لیے گھر کے تمام افراد اجتماعی کوشش کریں۔ کوئی چوکیداری کرے کوئی لڑائی کرے کوئی کھانے پینے کا انتظام کرے وغیرہ وغیرہ اسی طرح کا رشتہ قائم ہونا چاہیے اور پھر مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب جہاد کا اعلان کر دیا جاتا ہے تو ہر بالغ شخص پر وہ جہاد فرض ہو جاتا ہے اس میں مرد و عورت کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیئے دشمن کی جو قوت ہے اس کے مطابق ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور یہ اصول اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے وضع فرمایا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تم اپنی قوت تیار رکھو قوت سے مراد افرادی قوت ہے اور اسلحہ سے لیس ہو کر اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمن کا مقابلہ کیا جائے اب ہم پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ پاکستان اپنی ضرورت سے زیادہ اسلحہ جمع کر رہا ہے بات وہی آ جاتی

ہے کہ اسلحہ کا جمع کرنا اور جنگی تیاری کرنا تو خطرہ کے صوابدید پر ہے کہ خطرہ کس قسم کا ہے ہمیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں جب ہمیں ایک خطرے کے متعلق پتہ چل چکا ہے تو پھر اس کو سامنے رکھتے ہوئے اسلحہ جمع کرنا چاہیئے اور جنگی تیاری کرنی چاہیئے اور اس کے لیے ہمیں قربانی بھی دینی پڑے گی اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمان کا کام جارحیت کی ابتداء کرنا نہیں لیکن اپنا دفاع بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جو ہم نے جنگ نہ کرنے کی پیش کش معاہدے کے سلسلے میں کی ہے اس پر میں جنرل سرفراز صاحب سے بڑے ادب سے اختلاف کروں گا کہ یہ اس ذمہ داری کے نتیجہ میں ہے کہ ہم پہل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اپنے دفاع کی ضروریات سے غافل نہیں ہیں۔ ہمیں مکمل تیاری کرنی چاہیئے جو کمی ہے اسے دور کر لینا چاہیئے اور بھارت کو یہ بتا دینا چاہیئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو مسائل موجود ہیں ان کا افہام و تفہیم سے حل کیا جانا چاہیئے ہم خواہ مخواہ تو جنگ نہیں لڑنا چاہتے۔ کوئی عقل مند قوم طاقت ور کیوں نہ ہو جنگ نہیں لڑنا چاہتی کیونکہ جنگ ایک بہت بڑا مہنگا سودا ہے اس میں جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ اس سے مالی نقصان ہوتا ہے اور ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ برسہا برس تک قوم ایک شکل میں گرفتار رہتی ہے جن قوموں نے طویل جنگیں لڑی ہیں وہ پناہ مانگتی ہیں۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں اور خلوص نیت سے اس کا اظہار کر رہے ہیں ہم اپنی خودداری اور غیرت سمیت زندہ رہنا چاہتے ہیں ہم کسی کی دھونس برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم اصولوں کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم ہر مسئلہ کا امن سے طے کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی اس کا عملی ثبوت دے تو ہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کو تیار ہیں۔

جنگ صرف میدان جنگ میں ہی نہیں لڑی جاتی بلکہ سیاسی محاذ پر بھی لڑی جاتی ہے۔ کسی ملک کی خارجہ پالیسی کا ایک یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ کسی صورت بھی ایسے سیاسی حالات پیدا نہ ہونے دے جس سے جنگ ناگزیر ہو جائے۔ اس وقت میں کہوں گا کہ ہماری خارجہ پالیسی کامیاب ہے۔ ہمارے گرد و پیش ایسے واقعات پیش آئے

کہ ایسا معلوم ہوتا تھا اب جنگ ناگزیر ہے لیکن کامیاب خارجہ پالیسی کی وجہ سے جنگ ٹل گئی اور اس کو ٹالنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی دفاع کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں دوست بھی بنانے چاہئیں۔ دوستوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جتنے زیادہ دوست ہوں گے اتنی ہی اخلاقی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا حریف پر سیاسی دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہمیں اسلحہ بھی دشمن کی قوت کے مطابق جمع کرنا چاہیئے۔ ہمیں ایک مشکل درپیش ہے کہ ہمارے وسائل تھوڑے ہیں اور ہماری ضروریات زیادہ ہیں۔ اس وقت ہم مہنگا اسلحہ باہر سے لیتے ہیں لیکن جب باہر کسی بھی ملک سے اسلحہ لیا جائے تو اس کی مالی قیمت کے علاوہ سیاسی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے اور دونوں جنگوں میں ہم نے دیکھا کہ ضرورت کے وقت وہ ممالک جو اسلحہ دیتے ہیں وہ ہاتھ کھینچ لیتے ہیں اور اس وقت ہمیں تکلیف پہنچتی جاتی ہے اس کا ایک حل یہ ہے کہ ہمیں خود اسلحہ سازی کی طرف دھیان دینا چاہیئے منصوبہ بندی کی جائے پاکستان ان چند ممالک میں سے ایک ہے جن میں صلاحیت موجود ہے ٹیکنالوجی اور اسلحہ سازی میں کافی مہارت حاصل ہے۔ ہمارے پاس معیار بھی ہے اس میں ترقی بھی ہوئی ہے اگر ہم اس طرف توجہ کریں تو بہت بہتر ہوگا اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سرمائے کا ضیاع نہیں ہوگا اور ہمیں اس کی سیاسی قیمت بھی دینی نہیں پڑے گی۔

سوال۔۔۔ کرنل محمد نقی خان صاحب آپ اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں۔

کرنل محمد نقی خان۔۔۔ میں اس موضوع پر کشمیر کے حوالے سے گفتگو کروں گا میرے خیال میں دفاعی تقاضوں کے لحاظ سے ہماری قومی پالیسی ۱۹۴۷ء سے آج تک مرتب نہیں کی گئی قوم کو یہ نہیں معلوم کہ ہمارے قومی ہدف کیا ہیں اگر ایک قومی پالیسی ہو تو حکومتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن پالیسی وہی رہتی ہے اس کو آگے بڑھایا جاتا ہے کیونکہ پالیسی کا تعلق ملک کے ساتھ ہوتا ہے حکومت کے ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ چیز نہ ہونے کی

وجہ سے ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی جو تحریک تھی اس میں بہت تھوڑا التعاون تھا اور اگر اس وقت پاکستان کی طرف سے اسے تھوڑی سی مدد ملتی تو میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر کا مسئلہ اسی وقت حل ہو جاتا پھر اگر ۱۹۶۲ء میں ہماری قومی پالیسی مرتب ہوئی ہوتی جس وقت بھارت نے چین پر حملہ کیا تھا اس وقت حالات ایسے تھے کہ ہم بغیر لمبی چوڑی جدوجہد کے کشمیر کو حاصل کر سکتے تھے کشمیر کو حاصل کرنے کا مقصد ہے پاکستان کو مکمل کرنا جن لوگوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان کشمیر کے بغیر مکمل ہے یا ایک سچائی ہے یہ تو ایک عارضی ڈھانچہ ہے آپ کے سامنے موجود ہے۔

جو ڈاکٹروں کی مدد سے قائم ہے اور بھارت پوری کوشش کر رہا ہے کہ اس کو مزید کمزور کر دے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ذکر ہوا میں پھر یہی کہوں گا کہ اگر قومی پالیسی متعین ہوتی تو جنرل موسیٰ، یحییٰ خاں، ایوب خاں کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکتا تھا چانس نہیں لے سکتا تھا کہ جس وقت پاکستان ائیر فورس نے ہماری فوج کو مکمل ہوائی تحفظ دے دیا تھا یعنی ہوائی فوج کی اتنی زیادہ مدد بہم پہنچ گئی کہ ہماری پیدل فوج کی مشکل آسان ہو گئی مگر اس وقت جنگ ختم ہو گئی اور جنگ اس وقت ختم ہوئی جس وقت پوری قوم اور فوج کا مورال بلند تھا مگر اس وقت جنگ ختم ہو گئی میں اس وقت کسیم کرن میں تھا اور جو لوگ فرنٹ لائن پر تھے انہیں بے حد دکھ ہوا انہوں نے کہا کہ اس وقت جنگ بندی ہوئی ہے جب ہم بہت آگے بڑھ سکتے تھے بنیادی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ قومی پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس صورتحال سے دوچار ہوئے تو میرے نقطہ نظر سے پاکستان کے دفاع کی بنیادی شرط یہ ہے کہ نیشنل پالیسی مرتب کی جائے اس میں پہلے نمبر پر آپ اپنے دشمن کی پہچان کریں دوسرے نمبر پر آپ اپنی سرحدوں کا تعین کریں جن کی ہم ہر حال میں حفاظت کریں گے جب یہ باتیں واضح ہو جائیں گی تو ان کو سامنے رکھ کر آپ اپنی فوج کو منظم کریں گے اس کو سامنے رکھ کر اپنے دفاعی تقاضے متعین کریں گے پھر اسی صورت میں آپ کو کامیابی ہو گی۔

ماں! مجھے تمہاری ہی قسم! میں پچھلے سارے ادھار چکا دوں گا۔

گلشن نے اس کو غصے میں جھڑک دیا۔

"چپ رہو سلیم! تم نہیں جاؤ گے"۔

کشور نے بھی بڑی بیچارگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے رو دینے والی آواز میں کہا۔

"بیٹھیں نا"۔

سلیم اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف لپکا۔

آج چودھری حاکم اور اس کے داماد سے میں ضرور بات کروں گا ماں!

سلیم ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ گلشن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ایک بھرپور طمانچہ سلیم کے منہ پر مارتے ہوئے وہ زور سے چلائی۔

میری چار انگلیاں تو پہلے ہی کاٹ دی گئی ہیں۔ اب تم بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہونا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں ماں کا کوئی احساس نہیں۔

بیوی کے بے سہارا ہونے کی پرواہ نہیں۔

بوڑھے باپو کی در بدر ٹھوکریں کھانے کی کوئی فکر نہیں۔

تو ——— تو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا پسند نہ کروں گی۔ میں سمجھوں گی میری پانچوں انگلیاں کٹ گئی ہیں۔ میں جانوں گی میرے ہاں کسی سلیم نے جنم ہی نہ لیا تھا۔ جاؤ نکل جاؤ میرے

آنکھوں سے۔ جاؤ لڑتے پھر لوگوں سے۔

گلشن صحن میں آم کے درخت کا سہارا لے کر چلا چلا کر رونے لگی۔

ذرا فاصلے پر کشور بھی کھڑی پھکو پھک رو رہی تھی۔ بوڑھے غفور نے اپنے پگڑی کا پلو لے کر منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو لکڑی کے تخت پوش پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

سلیم بت کی طرح کھڑا ہو کر کچھ دیر تک غفور کی طرف دیکھتا پھر اس کی نظریں گلشن پر جم کر رہ گئی تھیں۔

گلشن!

جو اس کی ماں تھی۔

جس نے اسے جنم دیا تھا۔

ماں رو رہی تھی۔

ساری دنیا رو رہی تھی۔

اس کی جنت رو رہی تھی۔

اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ بھاگ کر وہ آگے بڑھا اور گلشن کے پاؤں پر منہ رکھتے ہوئے وہ دکھ بھرے انداز میں بولا۔

معاف کر دو ماں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں کوئی کام بھی تمہاری مرضی کے بغیر نہ کروں گا۔ میں تمہارا سہارا رہوں گا۔

تم نے مجھے جنم دیا ہے۔

میں تمہارا بیٹا ہوں۔

کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گھر پر خیریت ہے نا بابو!"

غفور شاید کسی بات کو ٹال رہا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی چادر کا پلو کھولنے لگا

دیکھو تو بیٹا! میں تمہارے لیے ڈھیر سے انڈے لایا ہوں اور یہ گھی بھی۔ اس نے گھی کا سفید ڈبہ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلیم نے پھر پوچھا

امی کیسی ہے بابو!

غفور اور اداس ہو گیا۔

اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں بیٹا! میں کشور کو لینے آیا ہوں۔

سلیم فکر مند ہو گیا۔

کیا ہوا ماں کو؟

غفور پھر ٹال گیا۔

کوئی خاص بات نہیں بیٹا! تم فکر نہ کرو۔

بھائی کیسے ہیں۔ ان سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔

وہ تو ——— غفور فوراً رک گیا۔

رک کیوں جاتے ہو بابو! کیا ہوا انہیں۔

غفور کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ رو پڑا۔

وہ ——— وہ قتل ہو گئے۔

سلیم اور کشور کے منہ سے ایک ساتھ نکل گیا۔

قتل ہو گئے۔

ہاں قتل ہو گئے۔ انتظامیہ نے ان کو پکڑنے کا انعام بیس ہزار روپیہ مقرر کر رکھا تھا۔ مرالہ کے بدمعاش برکت نے جس کے ہاں وہ ٹھیرے ہوئے تھے۔ رات سوتے میں ان تینوں کے سر قلم کر کے انتظامیہ کو پیش کر دیئے اور انعام کی رقم وصول کر لی۔ سنا ہے اس کا دھندا ہی یہی ہے۔

وہ بدمعاشوں کو اپنے ہاں ٹھہراتا ہے۔ ان سے خوب قتل کراتا ہے اور جب وہ اشتہاری مجرم ہو جاتے ہیں تو انہیں قتل کر کے رقم وصول کر لیتا ہے۔

سلیم غصے میں کھڑا ہو گیا۔

میں اس بھیڑیے سے اپنے بھائیوں کے قتل کا انتقام ضرور لونگا۔

غفور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔

بیٹھ جاؤ بیٹا! ان تینوں کے قتل سے تمہاری ماں پہلے ہی اپنے حواسوں میں نہیں رہی۔ اب تم بھی اسی راہ پر چل نکلے تو ہم جیتے جی ہی مر جائیں گے۔ تمہاری ماں نے مجھے کہلا کر بھیجا تھا کہ سلیم کو گاؤں نہ آنے دینا۔ صرف کشور میرے ساتھ جائے گی۔ اس کے وہاں ہوتے ہوئے وہ سنبھل جائے گی اور پھر میں اسے واپس چھوڑ جاؤں گا۔

میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں جاؤں گا بابو! سلیم کی آواز میں ابھی تک غصہ تھا۔

غفور نے پھر اسے سمجھایا۔

مثلاً خالصتان کا یہ مسئلہ بڑا نازک ہے۔ پتہ نہیں اس کو چھیڑنا چاہیئے یا نہیں لیکن اس کو چھوڑ دیکھیں کہ ہزاروں مسلمان ہندوستان میں جلا دیئے جاتے ہیں پاکستان کے چار شہری بھی سڑک پر نکل کر اندرا گاندھی کے خلاف نعرے نہیں لگا سکتے۔ یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے پاکستان کے قومی مفاد کی حمایت میں اور اس وقت جس غیر جمہوری طریق کار سے اندرا گاندھی حکومت چلا رہی ہے ان دونوں معاملات کو ہم بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اس لیے بانگ دہل بیان نہیں کرتے کہ ہم اپنے آپ کو بعض پہلوؤں سے کمزور محسوس کرتے ہیں۔ . .

مثلاً جنرل ضیاء الحق صاحب کا انٹرویو پچھلے دنوں کراچی کے ایک جریدے میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اسی قسم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ بین الاقوامی سطح پر ہمارا موقف تھوڑا سا کمزور ہے ہمیں بعض دفعہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ میں نہیں مانتا یہاں یہ جائے گا وہ ہو جائے گا ایسی کوئی بات نہیں بین الاقوامی سطح پر میں مانتا ہوں کہ کہیں کہیں کچھ مشکلات ہیں۔ . . کہیں کہیں نہیں بلکہ بہت زیادہ مشکلات ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جس کمزوری کی طرف آپ نے اشارہ کیا اس کی بنیادی وجہ موجودہ حکومت کی بعض بنیادی مجبوریاں ہیں سیاسی کمزوریاں ہیں جن کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہے اور ہمارا مطالبہ ہے کہ آپ جلد از جلد ایسی صورت حال پیدا کریں کہ آپ دنیا کے سامنے اپنی حکومت کی قانونی حیثیت ثابت کر سکیں۔

اب معلوم نہیں کہ پہلے اس موضوع پر بات ہوئی ہے یا نہیں پاکستان کے دفاع کے حوالے سے امریکہ کے ساتھ اور روس کے ساتھ جو ہمارے تعلقات ہیں اور افغانستان کی جو صورت حال ہے اس پر گفتگو ہونی چاہیئے۔ ہمارے یہاں بڑے سینیئر فوجی جرنیل موجود ہیں وہ بھی ان مسائل پر یقیناً سوچتے ہیں۔ . . میں بالکل بے تکلف بات کرنے لگا ہوں،

الفاظ کا کوئی بکھیڑا نہیں . . . لوگ سنجیدگی سے اس نقطہ نظر سے سوچ

گئے ہیں کہ ادھر ہندوستان ہمارا مذاق اڑا رہا ہے . . . ادھر افغانستان روز آدمی مار جاتا ہے . . . ہوائی جہاز ہائی جیک ہو کر آ رہے ہیں . . . اس پر بھی پریشان ہیں کہ کوئی سازش نہ ہو . . .

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان خطرات میں گھرا ہونے کے باوجود اپنے دفاع کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا سوائے باتیں کرنے کے تو پھر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں کیا ہمیں امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر لینا چاہیئے یا پاکستان کی سرزمین پر امریکہ کو فوجی اڈے دے دینے چاہئیں جنرل سرفراز صاحب آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ کیا یہ بات درست ہے اور اس میں کہاں تک حقیقت ہے کہ امریکہ پاکستان سے فوجی اڈے مانگ رہا ہے۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) سرفراز خان جہاں تک امریکہ کا پاکستان میں اڈے حاصل کرنے کا سوال ہے۔ میری معلومات کے مطابق فی الحال امریکہ کا ایسا کوئی مطالبہ نہیں۔ . . ایک تحریک سابقہ وزیر خارجہ نے چلائی تھی۔ ان کا پلان یہ تھا کہ مراکش سے لے کر مصر کو شامل کر کے مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کو شامل کر کے پاکستان میں ایک ایسا اتحاد قائم کیا جائے جو کہ نیٹو سے ملتا جلتا ہو اور جو سینٹو کی بنیادوں کے مطابق قائم کیا جائے لیکن اس تجویز کو نہ تو عرب ممالک نے تسلیم کیا جس میں وہ ممالک بھی شامل تھے جو امریکہ کے قریب تھے مثلاً اردن نے دبے الفاظ میں انکار کیا تو سعودی عرب نے بھی ایسا ہی کیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ایران میں امریکہ کو شکست ہو چکی تھی وہاں کے حالات امریکہ کے نقطہ نظر سے ابتر ہو گئے تھے اور امریکن حکومت نے محسوس کیا کہ اپنے عالمی مفاد کے تحفظ کے لیے ایک ایسے منصوبے کی ضرورت ہے جس کا نام انہوں نے متعلقہ ملکوں کی سلامتی کا معاہدہ رکھا جہاں تک اڈوں کا سوال ہے اگر یہ مل جاتے ہیں تو امریکہ اس کے متعلق انکار نہیں کرے گا لیکن اس وقت جو پاکستان کی مدد کر رہا ہے اس میں اڈوں کی ضرورت شامل نہیں ہے اس میں بات صرف اتنی ہے کہ کاش آپ پہلے گفتگو سنتے تو آپ کو احساس ہو جاتا . . . بہت لمبی چوڑی باتیں ہوئی ہیں . .

روسس کا جو عزم ہے اس طرف افغانستان میں اس نے اڈے جمائے ہو
نگاہ میں رہ: اس کا حتمی نصب العین نہیں اور نہ ہی ہو سکتا ہے اس لیے کہ افغانستان
گھرا ہوا ملک ہے اس کی سمندروں تک رسائی نہیں اور دوسرے ممالک سے براہِ
رسائی نہیں۔ لیکن وہ ایک قدم اٹھا کر افغانستان میں داخل ہو گیا ہے اور راستے ہم
کرنے کی کوشش کر رہا ہے دوسرا قدم اٹھانے سے پیشتر دوسرا قدم وہ اس وقت ا
گا جب دنیا کی نبض کو اچھی طرح معلوم کرے گا۔ جیسا کہ اس نے ایران کی صورتحال پر
میں سمجھتا ہوں کہ . . . ایران میں جو حالات پیدا ہوئے اگر وہ نہ ہوتے
روس افغانستان کی طرف قدم نہ اٹھاتا اس کو اس چیز میں یہ تقویت حاصل ہوئی وہ ا
خارجہ پالیسی کی کمزوری اور دیگر عوامل ان کو دیکھ کر اس نے قدم اٹھایا اب آئندہ جو قد
اٹھائے گا وہ سب چیزوں کو مدنظر رکھ کر اٹھائے گا۔

پروفیسر وارث میر . . . میں نے دانستہ طور پر آپ سے یہ سوال کیا کیونکہ
بہت کچھ جانتے ہیں اور وسیع علم رکھتے ہیں۔ اور میری کچھ امریکی حلقوں . . . سے با
ہوئی انہوں نے کہا کہ امریکہ نے پاکستان سے کبھی اڈوں کی طلب نہیں کی اور نہ ہی کر
گے اور اس کے وزنین دلائل دیئے۔

انہوں نے یہ کہا کہ ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے موجودہ حالت میں جو امریکہ کے
ساتھ اتنا ملوث مشہور ہو کہ بدنامی کی حد تک اس کی عالمی شہرت یہ بن جائے کہ یہ
کا کاسہ لیس ہے امریکہ کا ان حلقوں میں موقف ہے کہ اس کی اپنی کوئی پالیسی نہیں ہے
کا نقصان ہمیں بین الاقوامی سیاست میں یہ پہنچتا ہے کہ ہم پاکستان کا جو ایک مخصوص
تصور ہے نان الائینس کا ممبر ہے اس کی آزادانہ حیثیت کو ہم بین الاقوامی سطح پر او
مختلف عالمی اداروں میں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اگر ہم اس سے جنگی معا
کر لیں تو پھر پاکستان کی وہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور ہماری ڈپلومیسی کے لیے کم
جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایسا پاکستان ہی چاہیئے جیسا یہ ہے اور ہم نے کبھی اس بات کی
نہیں کی کہ ہم اس ملک کو جنگی اڈہ بنا لیں اور اس کی سیاسی اور سفارتی حیثیت کو ز

دوسری بات انہوں نے یہ کی کہ جیسا آپ سب فرماتے ہیں کہ ہمارا اولین دشمن ہندوستان
ہے اور وہ اس لیے کہ اس نے اب تک پاکستان کو آزاد مملکت تسلیم ہی نہیں کیا لیکن
ہم جانتے ہیں امریکہ ایک بڑا ملک ہونے کی حیثیت سے کبھی بھی پاکستان کو ہندوستان
پر اس قسم کی برتری دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے سارے مفادات صرف پاکستان
سے ہونے سے وابستہ ہو جائیں اور اس علاقے کی بہت بڑی طاقت کو اپنا مستقل طور پر
دشمن بنا لے۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ بحر ہند میں ڈیگو گارشیا وغیرہ میں ہماری
پہلے سے ہی اتنی طاقت ہے کہ ہمیں پاکستان میں اڈوں کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ
وہ زمانہ نہیں کہ سامنے ہی حریف ہو تو حملہ کیا جائے۔

امریکہ کے بعض سرکاری اور ذمہ دار حلقوں کے ساتھ اس موضوع پہ بات ہو تو عام
طور پر ان کا موقف بھی جنرل صاحب کے موقف کی تائید کرتا ہے۔

ریپبلکن پارٹی اپنے منشور میں پاکستان کی سلامتی کے ساتھ کو منڈے ہے جب کہ ڈیمو
کریٹک پارٹی پاکستان اور افغانستان کے مجاہدین کا ذکر دو نقروں میں کرتی ہے۔ اس سے
ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ آئندہ انتخابات میں اگر ڈیموکریٹک پارٹی جیت
جاتی ہے تو پھر پاکستان کے موجودہ موقف کے ساتھ امریکی حکومت کی کومٹ منٹ کی کیفیت
کیا ہوتی ہے۔

ایک سوال اور آخری۔ جنرل سرفراز صاحب! آپ کا شمار ہمارے ملک کے نہایت
سینئر فوجی افسروں بلکہ سفارت کاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے جنگ میں بھی حصہ لیا ہے
اور سفارتی ذمہ داریاں بھی نبھائی ہیں۔ ان دنوں پاکستان کی افغانستان اور بھارت سے
ملحقہ سرحدوں پر جس قسم کے خطرات منڈلا رہے ہیں، ان کے پیش نظر قوم کو آپ کے تجربات
سے استفادہ کرنے اور رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ روس اور بھارت
دونوں سرحدوں پر منصوبے کے تحت اشتعال انگیزی سے باز نہیں آ رہے۔ یہ دباؤ
بھی ہو سکتا ہے اور پاکستان کو جنگ میں ملوث کرنے کی سازش بھی ہو سکتی ہے ہم جانتے
ہیں کہ افغانستان کے مسئلہ پر ہمارا موقف اس صورت حال کا ذمہ دار ہے۔ اس موقف

ہیں ہم کسی اصولی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں اور روس کے ساتھ ساتھ امریکہ کی طرف سے بھی ہماری حکومت پر یقیناً دباؤ ہوگا۔ پاکستان کی سلامتی میں دلچسپی رکھنے والوں کو خدشہ رہتا ہے کہ اس تعطل اور بے یقینی کی صورت حال میں اب کوئی نہ کوئی مثبت تبدیلی ضرور آنی چاہیے ورنہ آئندہ دو تین سال میں پاکستان کو کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آسکتا ہے۔ روس، افغانستان، اور بھارت کے حوالے سے پاکستان کے مسائل کے بارے میں آپ بھی سوچتے ہوں گے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ پاکستان کو کسی نئی اپروچ اور اپنے دوستوں مثلاً امریکہ وغیرہ کی حمایت اور رضا سے ایک قدم آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیتے ہیں یا نہیں۔

جنرل سرفراز: اکثر انٹیلیکچوئلز، پاکستان کے دفاع پر بات کرتے ہوئے روس کا ہوا بہت کھڑا کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ روس کی طرف سے بول رہے ہیں۔

کرنل نفی بٹ: خاص طور پر یونیورسٹیوں کے "انٹیلیکچوئلز" اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

وارث میر: میں نے تو محض سوال کیا ہے آپ سے کچھ سیکھنے اور رہنمائی لینے کے لیے... میرا سوال روس یا امریکہ کی بجائے، پاکستان کی طرف سے تھا اور پاکستان کے دفاع اور تحفظ میں تھا۔

جنرل سرفراز: بہر حال... پاکستان دفاعی لحاظ سے اب بہت بہتر حالت میں ہے اور ایران میں امریکی اثر و رسوخ کے خاتمے کے بعد تو پاکستان کو جارحیت سے محفوظ رکھنا، امریکہ کی مجبوری بھی بن چکی ہے۔ پاکستان پر کسی بھی قسم کے بیرونی حملے کی صورت میں، دشمن کو منہ کی کھانی پڑے گی۔

میری یونٹ نے سرنڈر نہیں کیا!

بریگیڈیر ریٹائرڈ لیاقت اسرار بخاری (ستارہ جرأت) سے خصوصی ملاقات

سوال... بریگیڈیر صاحب... آپ ۷۱ء میں غالباً کرنل تھے؟

جواب... جی ہاں میں آر سی ای پی بٹالین کا کرنل کمانڈنٹ ایسٹرن زون تھا۔

سوال... ۷۱ء کی جنگ پر سیاسی مصلحتوں کا پردہ پڑا ہوا ہے کوئی واضح رپورٹ سامنے نہ آنے کی وجہ سے عوام میں یہ تاثر رواج پا چکا ہے کہ ۹۰ ہزار پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور بس... آپ کا ایک دلیرانہ کردار اس جنگ میں بہر حال ہے۔ اس ضمن میں آپ کچھ فرمائیے۔

جواب... میں اس پوزیشن میں نہیں کہ اس سوال کا کوئی حتمی جواب دے سکوں۔ میں تو ۷۱ء میں ای پی بٹالین کا کمانڈر تھا۔ اس لحاظ سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ جس دلیری اور بے جگری سے ہمارے جوان مشرقی محاذ پر لڑے وہ بات ادھر مغربی محاذ پر بالکل دیکھنے میں نہیں آئی۔ مشرقی پاکستان کا حدود اربعہ اتنا لمبا ہے کہ وہاں موجود فوج کی پوزیشن بالکل محصور فوج کی سی تھی وہ لوگ کسی طرف بھی تو نہیں جا سکتے تھے۔ ہماری جتنی کچھ مٹھی بھر فوج تھی وہ تو ساری سرحدوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

کہنے کو تو آپ ۹۰ ہزار یا ۸۰ ہزار فوج کہہ لیں لیکن حقیقت کا علم ساری دنیا کو ہے وہاں ریگولر فوج بمشکل ۲۰ یا ۲۵ ہزار تھی۔ وہ بھی اس طرح سرحدوں پر پھیلی ہوئی تھی کہ ایک جگہ بمشکل ہی سو یا دو سو فوجی اکٹھے ہو سکتے تھے۔

ہماری رسد و رسائل کا دارومدار مکمل طور پر ریلوے کی پٹڑی پر تھا۔ آپ کو علم ہے کہ

بھارت کے پاس زبردست اور مضبوط فضائی بیڑہ موجود تھا۔ اس نے ہمیں سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مقامی آبادی ہماری دشمنی تھی یعنی عالم یہ تھا کہ ہمارا ایک آدمی دوسرے آدمی تک اکیلا نہیں جا سکتا تھا۔ جنگ میں وائرلیس کوئی قابل اعتبار ذریعہ نہیں ہوتا جب باقاعدہ لڑائی شروع ہوئی تو ہم پہلے ہی بڑی لمبی جنگ لڑ چکے تھے۔

سوال ..... سنا ہے بھارت نے "آل آؤٹ" حملہ تو دسمبر سے پہلے ہی کر دیا تھا؟

جواب ..... جی ہاں آپ بجا فرماتے ہیں۔ جس روز ہمارے چار جہاز جو بھارت کے حملہ آور جہازوں کا مقابلہ کرنے گئے تھے جن میں سے تین بھارت نے گرا لئے تھے۔

سوال ..... یہ کب کا واقعہ ہے؟

جواب ..... غالباً ۱۶ نومبر کا اس دن سے حقیقت میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تھی بھارتی آرٹلری نے ہم پر زبردست گولہ باری شروع کر دی تھی۔ ان کی فوجیں ہماری سرحدوں میں گھس آئی تھیں۔ پھر پوری جنگ ۴۔ دسمبر کو مغربی محاذ پر شروع ہوئی تھی مشرقی محاذ پر بہت پہلے سے بھارت حملہ آور ہو چکا تھا۔

۴۔ دسمبر ہی کو ہماری ائیر فورس ایک دن کی لڑائی کے بعد تباہ ہوئی تھی۔ ۵ دسمبر کو بھارتی فضائیہ نے ہارا ڈھاکے کا رن وے تباہ کر دیا تھا۔ لیکن بخدا ہماری ائیر فورس جس جرأت اور دلیری سے وہاں لڑی ہے انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے آپ ہالی وڈ کی کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ ہمارے لڑکوں نے سیبر جیسے پرانے اور سست رفتار جہازوں سے دشمن کے جدید ترین ایس یو ۷ ، نیٹ کینبرا وغیرہ تباہ کئے۔ یہ نظارا میں نے اپنی آنکھوں سے ڈھاکہ ائیر پورٹ پر دیکھا۔ میرا خیال نہیں کہ دنیا کی کوئی بھی ائیر فورس ایسی لڑائی کی مثال پیش کر سکے۔ میں اپنے ساتھ ان معرکوں کی فلمیں بھی لایا تھا۔ جو میں نے متعلقہ اتھارٹیز کو دے دی تھیں کسی کو اعتبار نہ آئے تو وہ فلمیں دیکھ لے جہاں تک آرمی ایوی ایشن کا تعلق ہے مجھے اس بات پر فخر ہے کہ تمام پاکستان

آرمی کی وہ واحد یونٹ تھی جس نے سرنڈر نہیں کیا۔ ہم نے جس روز سرنڈر ہوا اپنے تمام جہاز اور ہیلی کاپٹر مشرقی پاکستان سے نکال لیے تھے۔

جس روز ہم مشرقی پاکستان سے فرار ہوئے ہیں ۲۹ عورتیں اور بچے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

سوال ..... اس جنگ میں آرمی ایوی ایشن کا کیا کردار تھا۔

جواب ..... جس روز لڑائی شروع ہوئی فوج کے پاس رابطہ کا واحد ذریعہ ہیلی کاپٹر تھے۔ ہمارے پاس ایک سے دوسری پوسٹ تک جانے یا کچھ پہنچانے کا اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کمیونیکیشن ہماری بالکل قابل اعتبار نہیں تھی کیونکہ بنگالی تمام خفیہ باتیں سن لیتے تھے۔ جو "خفیہ پیغامات" یا کمانڈر جانے تھے صرف ہیلی کاپٹروں کے ذریعے جاتے تھے۔

ہم دن کو تو اڑنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ جو کچھ بھی آپریشن ہوتے صرف رات کی تاریکی میں ہو سکتے تھے۔ اب آپ دیکھیے کہ مشرقی پاکستان ندی نالوں، اونچے اونچے گھنے درختوں اور پہاڑیوں کا دیس ہے۔ بغیر روشنی جلائے ٹیک آف کر کے جانا اور پھر اس جگہ لینڈ کرنا کہ جہاں یہ علم بھی نہیں نیچے کیا ہے۔ درخت ہیں، پانی ہے یا دلدلی علاقہ ہے۔ اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہاں بنگالی ہماری گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ان حالات میں ہم وہاں آپریشن کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود میرے پائلٹ جس دلیری سے لڑے الفاظ وہ بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

سوال ... بریگیڈیئر صاحب ... اس جنگ میں ہماری انفنٹری (پیدل فوج) کا کردار کیسا رہا؟

جواب ... ہماری انفنٹری کو بہت مشکل حالات کا سامنا تھا۔ یہ لوگ سو سو پچاس پچاس اور بیس بیس کے گروپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جو خندقیں انہوں نے کھودی تھیں وہ پانی سے بھری پڑی تھیں۔ یقین کیجئے ہماری انفنٹری کے اکثر جوانوں کی ٹانگیں مسلسل پانی میں رہنے کی وجہ سے گل چکی تھیں۔ جلدی بیماریاں تو اکثر کو لاحق تھیں

مرد اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی خیریت معلوم کرنے لگے ۔ ان کا
نواب کے ساتھ ایسے ہی تھا جیسے کسی محبوب لیڈر کے ساتھ اس
شیدائی رعایا کا ۔

نواب نے ان سب سے سلیم کا بھی تعارف کرایا ۔ وہ سلیم
بھی جھک جھک کر سلام کرنے لگے تھے ۔

خانہ بدوشوں کی اس بستی سے نکل کر دونوں بھٹے کی اینٹو
بنی ہوئی چمنی کے پاس آئے ۔ وہاں جگہ جگہ کوئلہ ڈالنے کے لیے سو
بنے ہوئے تھے اور ہر سوراخ پر لوہے کا ڈھکن تھا ۔

نواب نے ایسے ہی ایک سوراخ کا ڈھکن اٹھایا ۔ وہاں آگ
نہیں جل رہی تھی ۔ سلیم کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا کہہ کر نواب اس سو
میں اتر گیا ۔ نیچے جا کر وہ زمین پر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ دائیں جان
رینگنے لگا ۔

سلیم بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا ۔ کوئی دو گز کا فاصلہ انہو
نے رینگ کر طے کیا اور پھر دونوں کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گ

اب ان کے سامنے ایک کمرہ تھا ۔ جس کا لکڑی کا دروازہ
تھا ۔ دونوں اس کمرے میں داخل ہو گئے ۔ نواب نے مسکراتے ہو
کہا ۔ " یہ ہے اپنی پناہ گاہ ۔

سلیم نے بھی تعریف کی ۔

بہت محفوظ جگہ ہے ۔

نواب سلیم کو ساتھ لے کر پھر سوراخ کے منہ میں آیا اور دھوئیں کی
نی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔

اس چمنی کے ساتھ لگی ہوئی تمہیں کوئی نمایاں چیز دکھائی دیتی ہے ۔

سلیم فوراً بول پڑا ۔

ہاں کپڑے کی ایک ہری جھنڈی لگی ہوئی ہے ۔

بہت عقلمند ہو ۔ جب اس چمنی کے ساتھ ہری جھنڈی ہے، تو
ر باہر نکلنے میں کوئی خطرہ نہیں اور جب چمنی کے ساتھ سرخ جھنڈی ہو
ت خطرہ ہوتا ہے لہذا باہر نہیں نکلنا چاہیئے ۔ اور جب زیادہ ہی
رہ ہو اور پولیس بھٹے کے علاقے میں ہی ہماری تلاش میں ہو تو اس وقت
ٹے پر کام کرنے والے مزدور اپنے دوسرے ساتھیوں کو زور زور سے
نے لگیں گے ۔

کوئلہ ڈالو کوئلہ ۔ ایسی صورت میں خطرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس
راخ میں بھی نہیں آنا چاہیئے ۔ نہ ہی اس کا ڈھکن کھلا رکھنا چاہیئے ۔
ہاں تہ خانے میں بند ہو جانا چاہیئے ۔ بھٹے کا مالک میرا اپنا آدمی ہے
لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں ۔

دونوں پھر تہ خانے میں آ گئے ۔ فرش پر ایک چٹائی پر بستر لگا ہوا
ایک کونے میں جلی ہوئی لکڑی کے کچھ کوئلے بھی بکھرے پڑے تھے
م نے کمرے کی دیواروں اور چھت کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ۔

یہ لوگ قابل اعتماد ہیں ۔

جو ہمارے معاشرے کی گندگی ہیں -

یہی لوگ ہیں جو غریب کسانوں کے جسم پر خون پینے والی گند

جونکیں ہیں -

یہ شیطان ' یہ بھیڑیے -

یہ پاپی ' یہ گناہ گار -

ہم ان کے دراز ہاتھ کاٹ دیں گے - ہم غریب کسانوں کو بیدار

گے اور اس کے ساتھ ہی ان کے کھیت بھی جاگ اٹھیں گے - کوئی ان

تم مجھے جس طرف بھی اشارہ کرو گے اسی طرف ہی میں بڑھوں گا -

نواب نے اس کا گھٹنا پکڑ لیا -

نہیں ہرگز نہیں - تم مجھ سے طاقت ور ہو ' مجھ سے زور آور

ہو - قافلہ ' قبیلہ یا کارواں خواہ دو آدمیوں پر مشتمل ہو یا ہزاروں افراد پر مشتمل

ہو ' سردار وہی ہوگا جو شاہ زور ہوگا -

تم مجھ سے عمر میں بھی تو بڑے ہو -

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا -

کے مکے کی شکل میں دشمن کے سینے میں مار سکتا ہوں۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ مکا فضا ہی میں لہرا کر رہ گیا!

جواب..... پلاننگ ظاہر ہے اونچی سطح پر کی جاتی ہے اس ضمن میں ناقص رائے صرف اتنی ہے کہ ایسا مشرقی پاکستان میں ممکن نہیں تھا وہاں جو بیٹھ گیا وہاں سے واپس نہیں آسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ جنگ کے آخری دن جوان جہاں تھے وہیں رہے۔

سوال..... کیا یہ اعلیٰ کمان کی غیر معیاری کارکردگی کا ثبوت نہیں!

جواب.... دیکھئے جب جی ایچ کیو نے یہاں ایسٹرن کمانڈر بھیجے تو سمجھ کر بھیجے تھے کہ وہ اس صورت حال پر قابو پا سکیں گے اور انہیں انفرادی فیصلے صورت حال کے مطابق کرنے کا بھی مکمل اختیار دیا گیا تھا!

سوال..... جنرل نیازی کیا انفرادی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے؟ اگر جی ایچ کیو کا کوئی حکم سرنڈر ہونے کے متعلق تھا تو انکار کر دیتے۔

جواب... میں اندرون خانہ تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اہم ترین فیصلے آپس میں صلاح مشورے کے بعد کئے جاتے ہیں فوج بہر حال ایک منظم ادارہ ہے۔

سوال... ڈھاکہ آپ کب سے کب تک رہے۔؟

جواب.... میں ڈھاکہ دسمبر ۷ سے سرنڈر تک رہا ہوں۔

سوال..... آپ کا کیا خیال ہے مشرقی پاکستان میں نیوی زیادہ موثر ہو سکتی تھی!

جواب..... نہیں..... اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری نیوی بڑی مختصر سی تھی دوسری بات یہ کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہے نیوی میں زیادہ تر بنگالی تھے جن سے کوئی امید رکھنا ہی حماقت ہوتا مقابلہ بھی بھارت کی پیدل فوج ہی سے براہ راست ہوتا اس کے باوجود نیوی

اس جنگ میں بھرپور اور موثر کردار ادا کیا۔ ایڈمرل شریف جو وہاں ان دنوں نیوی کے کمانڈر تھے بہت ٹھنڈی طبیعت کے اور انتہائی دلیر افسر تھے انہوں نے مشرقی کمانڈ کے ہیڈکوارٹر میں مختلف میٹنگوں میں بہت اہم اور دلیرانہ رول ادا کیا ان کے فیصلے بڑے جرأت مندانہ ہوتے تھے۔

سوال.... مثلاً؟

جواب.... جب ہم سرنڈر کر رہے تھے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ آرمی ایوی ایشن کی عورتوں اور بچوں سمیت نکل جانے کا موقع فراہم کیا جائے یہ بڑا دلیرانہ فیصلہ تھا۔ جس میں اہم رول ایڈمرل شریف نے ادا کیا ایک موقع ایسا بھی آیا جب ہم نے تجویز دی کہ ہیلی کاپٹروں میں پانچ پانچ سو پاؤنڈ کے بم رکھ کر دشمن فوج پر گرائے جائیں اس دلیرانہ فیصلے میں بھی ایڈمرل شریف نے اہم رول ادا کیا تھا۔

سوال... بریگیڈیئر صاحب! جنگ کے آخری ایام میں کیا یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی دور دور تک مثلاً جیسور، سلہٹ وغیرہ میں بکھری افواج کو ڈھاکہ میں اکٹھا کر سکتے؟

جواب.... جی نہیں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لوگ لاتعداد ندی نالوں جنگلوں اور اپنی گھات میں گئے بنگالیوں اور بھارتیوں سے لڑتے بھڑتے واپس پہنچ سکیں۔

سوال.... جنرل نیازی نے پھر یہ کیسے تصور کر لیا تھا کہ وہ ان پھیلی ہوئی اکائیوں کو اکٹھا کر لیں گے۔

جواب... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جنرل صاحب خود زیادہ بہتر جانتے ہوں گے لیکن بظاہر یہ ممکن نہیں تھا۔

سوال... ڈھاکہ میں آخری دنوں میں ہماری کتنی فوج تھی؟

جواب.... میرے خیال سے مغربی پاکستان سے گئے ہوئے پندرہ بیس ہزار فوجی تو ہوں گے۔

سوال.... کیا اتنی فوج سے ہم جنگ کو طول دے سکتے تھے کہ اس دوران ایسے حالات پیدا ہو جاتے جو ہمیں رسوائی سے بچا لیتے۔؟

جواب...... یہ بالکل ممکن تھا کیونکہ ڈھاکہ میں تو حقیقت ہے کہ لڑائی بالکل ہوئی ہمارے جو ٹروپس ڈھاکہ میں تھے ان تک لڑائی کی نوبت نہیں پہنچی اگر سرنڈر نہ ہوتا تو ہم کافی عرصہ تک لڑ سکتے تھے دن نہیں مہینوں لڑ سکتے تھے۔

سوال...... بریگیڈیئر صاحب! کیا اس بیس تیس ہزار فوج کے سامنے یہ پلان نہیں تھا کہ ہم ڈھاکہ کو "مرکز" بنا کر اس کے باہر پھیلی دشمن فوج کو مسلسل زک پہنچاتے رہتے۔ خصوصاً شارٹ کو حملہ آور پارٹیاں بھیج کر اس طرح ہم کتنا وقت گذار سکتے اس دوران کوئی کمک پہنچ جاتی؟ یا یو این او کے ذریعے معاملہ حل ہو جاتا۔

جواب...... جہاں تک تو لڑائی کا سوال ہے وہ تو ہم بیٹھ کر لڑ سکتے تھے مہینہ دو مہینے بلکہ اس سے بھی زیادہ جہاں تک کمک آنے والی بات ہے تو اس کا ہی پیدا نہیں ہوتا تھا

ایک مرحلے پر واقعی ہمیں کہا گیا کہ امریکن اور چینی ہماری مدد کو آ رہے ہیں لیکن افواہ تھی آج کل دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ دوسرا ملک اپنی فوجیں لے کر آپ کی مدد کو جائے اپنی جنگ تو خود ہی لڑنی پڑتی ہے۔

سوال...... "کمک" کی افواہ کیا آپ کا مورال بڑھانے کے لیے پھیلائی گئی؟ یا ایسے موانع تھے؟

جواب...... دیکھیے مورال کا تو یہ عالم تھا کہ لڑکے لڑنے مرنے پر تیار تھے اور وہ آخری گولی تک لڑنا چاہتے تھے اس لیے یہ تو سمجھ نہیں آ سکی کہ آخر یہ افواہ کیوں پھیلائی گئی لیکن یہ آپ ضرور جان لیں کہ یہ افواہ جی ایچ کیو سے آئی تھی دا... سے نہیں۔

سوال...... بریگیڈیئر صاحب! جیسے کمانڈر جنگوں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں موافق حالات ہیں اور...... لمبی جنگ کی حکمت عملی اور ہوتی ہے اور مختصر کی اور...... ہماری فوج کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ دشمن کی قوت سے دب جانے والی تھی تو میں تو تسلیم نہیں کرتا کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ ہماری پلاننگ ناقص تھی؟ جوانوں

کے جذبے کا صحیح استعمال نہیں کیا گیا۔

جواب...... میں اس سلسلے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جنگ ابھی کافی دیر تک لڑی جا سکتی تھی۔

سوال...... بریگیڈیئر صاحب! ہمیں ۱۶ دسمبر کے اپنے دلیرانہ فرار کی کہانی سنائیے کہ ایسی کہانیاں زندہ قوموں کی آخری دم تک رہنے والی زندہ نشانیاں ہوتی ہیں ایک نسل بڑے فخر سے یہ واقعات اگلی نسل کو منتقل کرتی ہے! اس اپریشن کی تفصیلات؟

جواب...... میں نے ۱۴ دسمبر کو یہ پلاننگ کی تھی کہ ہم لوگ اپنے ہیلی کاپٹر ڈھاکہ سے نکال کر لے جا سکتے ہیں ۱۶ دسمبر کی شام تقریباً ساڑھے سات بجے جنرل نیازی نے مجھے طلب کیا اور میرے منصوبے پر صاد کر دیا ان دنوں مشرقی پاکستان میں ائرفورس کے کمانڈر بعد میں ہونے والے ائر مارشل انعام الحق تھے ان سے مشورہ کیا گیا انہوں نے بتایا کہ بڑے ہیلی کاپٹر تو ڈھاکہ سے اکیاب (برما) تک پہنچ جائیں گے لیکن چھوٹے ہیلی کاپٹروں کے لیے یہ ممکن نہیں۔

میں نے یہ تجویز دی کہ ہم چھوٹے ہیلی کاپٹروں میں پٹرول کے جیری کین رکھ لیں گے اور راستے میں کسی بھی محفوظ جگہ اتر کر "ری فیولنگ" بھی کر لیں گے۔

سوال...... بڑا دلیرانہ فیصلہ تھا؟

جواب...... میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ اپنے ہیلی کاپٹر صحیح سلامت دشمن کو سونپ دوں خیر! جنرل نیازی نے ساڑھے سات بجے ہمیں اجازت دیدی ان احکامات کے ساتھ ہی ہم عورتوں اور بچوں کے علاوہ آرمی کی ۶ نرسوں اور جنرل رحیم کو جو سخت زخمی تھے اپنے ساتھ لے جائیں ہم نے ٹیک آف کے لیے رات ڈھائی بجے کا وقت منتخب کیا انڈین آرمی نے اس دوران یہ وارننگ ہم تک پہنچا دی تھی کہ اگر کسی نے بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے مار گرائیں گے۔

ہم نے اپنے ہیلی کاپٹروں پر سے آرمی کے نشانات پر تارکول پھیر دی ہم نے

سی ایم ایچ والوں سے کہہ دیا کہ وہ دو بجے تک نرسوں کو وہاں پہنچا دیں جب ہم
۲ بجے مقررہ مقام پر پہنچے تو نرسیں ابھی تک نہیں پہنچی تھیں شاید تیاری میں دیر ہو
گئی ہیلی کاپٹروں میں لوگ بری طرح ٹھسے ہوئے تھے ہمارے لاکھ سمجھانے کے
باوجود کوئی بھی اترنے کو تیار نہیں تھا ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ اتنے وزن کے ساتھ
ہم اسے اڑا ہی نہیں سکتے لیکن وہ لوگ بضد تھے مشکل یہ تھی کہ عورتوں کے ساتھ
مرد بھی چلے آئے تھے کئی لوگ یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ وہ بیویوں کو پکڑ کر ہی یہ
جائیں گے۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اگر تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی تو خطرہ تھا کہ
مشرقی پاکستان ہی میں سورج طلوع ہو جاتا اور روشنی ہماری موت کا پیغام ہوتی
ہمیں انڈین ائر فورس مار گراتی۔

ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ ہم اپنی سرحد کو اندھیرے ہی میں عبور کریں ہم نے اللہ کا
نام لیا اور ایک ایک ہیلی کاپٹر میں ۱۶ کے بجائے ۲۹ اور ۲۵ مرد عورتوں کو لے کر
اڑنے کے لیے تیار ہو گئے ابھی تک نرسیں نہیں پہنچی تھیں ہمارے لیے مزید انتظار
ممکن نہیں تھا اللہ کا نام لے کر ہم نے ٹیک آف کیا۔

میں سب سے پہلے اڑا اس کے بعد وقفے وقفے سے باقی ہیلی کاپٹر اڑتے
رہے جب ہم اڑے تو بنگالیوں نے یہی سمجھا کہ یہ بھارتی جہاز ہیں انہوں نے
ایک ائر سٹریپ بنائی ہوئی تھی اور اس پر خوب لائٹیں وغیرہ جلا کر نعرے لگا
رہے برما کی سرحد سے کچھ وقت پہلے ہی ان لوگوں کو شک ہوا اور انہوں نے ہم پر
فائرنگ شروع کر دی ہم اونچے نہیں اڑ سکتے تھے اس طرح ان کی فائرنگ سے بچ
جاتے تو بھارتی ریڈار کی زد میں آ جاتے ہم لوگ سمندری ساحل کے بالکل ساتھ ہو
کر پرواز کر رہے تھے۔ سمندر پر پہنچ کر ہم نے اپنی وردیاں اور زائد کلیں سمندر میں پھینک دیں
ہم اللہ کے فضل سے بخیر و عافیت اکیاب پہنچ گئے ہم سے پہلے جو پانچ جہاز
"ولیور" اڑے تھے انہوں نے برما سے فیول لے کر چین جانا تھا وہ بھی اللہ کے فضل سے

اپنی منزل تک پہنچ گئے۔

ہم ایک دوسرے کے تعاقب میں ۸ ہیلی کاپٹر یہاں لینڈ کر گئے ہم نے یہ پروگرام
بنایا تھا کہ اکیاب میں خود کو سویلین بتائیں گے تاکہ مشکلات پیدا نہ ہوں یہاں ہم اترے تو
ابھی تھوڑی تھوڑی روشنی ہی ہوئی تھی ابھی تک کسی نے ہمیں دیکھا نہیں تھا۔

جب ایک دوسرے کے بعد وہاں ہیلی کاپٹر اترنے لگے تو ائیرپورٹ سے ایک
آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے پوچھا کہ ہم لوگ کون ہیں۔

میں نے اسے بتایا میں چیف پائلٹ پلانٹ پروٹیکشن ہوں آپ کو علم ہے
کہ لڑائی ہو رہی ہے ہم لوگ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کر آئے ہیں اس شخص کو ہیلی
کاپٹر دیکھ کر شک ہوا اور اس نے اپنی اتھارٹیز کو مطلع کیا جس پر ایک افسر نے ہمیں حکم
دیا کہ واپس ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ جاؤ میں نے اسے کہا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں اس نے کہا
اچھا تمہارے کونسلر سے تمہاری بات کرواتا ہوں۔

اس نے کونسلر سے رابطہ کروایا تو میں نے اردو میں اسے بتایا کہ ہم سویلین ہیں
اور میرے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں۔ کونسلر نے کہا انگریزی میں بات کرو مجھے شک گزرا
کہ یہ بنگالی ہے میں نے کہا کہ تم پاکستانی ہو اور اردو نہیں جانتے جس پر وہ گڑبڑا گیا اور
کہا کہ وہ ہماری سیکرٹری سے بات کرواتا ہے اس دوران جنرل رحیم کے گھٹنوں سے خون
بہنے لگا تھا میں کسی طرح انہیں فون تک لے آیا انہوں نے کونسلر کو دھمکی دی کہ وہ سیکرٹری
ٹو گورنمنٹ ہیں کونسلر نے فون بند کیا اور اپنی فیملی سمیت کاکس بازار کے راستے فرار ہو گیا
اسکا نائب گجرات کا رہنے والا ایک محب وطن پاکستانی تھا وہ صورتحال سمجھ گیا اور چائے
کے دو جام اور سنگترے لے کر وہاں پہنچ گیا ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھوک پیاس
سے بلک رہے تھے وہ سنگتروں اور چائے پر ٹوٹ پڑے اس دوران صبح کے
دس بج چکے تھے۔

اس دوران جنرل رحیم کی بات رنگون میں ملٹری اٹیچی کے ساتھ ہو گئی دوپہر
کے بعد ملٹری اٹیچی رنگون سے پہنچ گیا اس نے ہمیں ایک ریسٹ ہاؤس وہاں

لے دیا ہمارے پاس دو زخمی جرنیل تھے ایک تو جنرل رحیم اور دوسرے کرنل
کے میجر پیر داد تین دن ہم لوگ وہاں رہے اس دوران بھارتی حکومت نے برما
حکومت پر ہر طرح دباؤ ڈالا کہ ہیلی کاپٹر اور مسافر واپس کئے جائیں ان لوگوں
برما حکومت کو میری اہلیت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن برمی حکومت نے انسانیت
کا پاس کیا اور اللہ کے کرم سے وہ وقت بھی آیا جب ہم لوگ اپنے ہیلی کاپٹر
سمیت پاکستان پہنچ گئے۔

سوال... اس شکست کے اثرات فوج پر آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب.... فوج ہی کے مورال پر نہیں عوام کے مورال پر بری طرح اثر پڑا
فوجی افسران شدت غم و غصہ سے بے حال ہو رہے تھے درحقیقت جنرل نیازی
نے ۱۴ دسمبر ہی کو ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا احکامات البتہ ۱۶ دسمبر کو جاری ہوئے

سوال.... مطلب؟

جواب.... یہ سگنل ۱۴ دسمبر کو جی ایچ کیو سے گیا تھا اور بالکل اوپن تھا جب
میجر نے موصول کیا اس نے پڑھ کر سب کو سنایا ہمیں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا
میجر بھی یہی سمجھا کہ یہ کسی بنگالی کی شرارت ہے لیکن چیک اپ کرنے پر علم ہوا کہ یہ
حقیقت ہے۔

سوال.... جو حکم جی ایچ کیو سے بھیجا جائے اس کی زبان ہمارے خیال میں
ذو معنی سی ہوتی دو ٹوک ہوتی ہے کیا جی ایچ کیو کے سگنل میں یہ واضح طور پر لکھا تھا
کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں؟

جواب.... نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی فیصلہ ایسٹرن کمانڈ کی صوابدید
پر چھوڑا گیا تھا کہ وہ حالات کے مطابق جو فیصلہ بہتر سمجھیں کریں۔

سوال.... اتنا اہم فیصلہ جنرل نیازی نے اپنے ساتھیوں کے صلاح مشورے سے
جواب.... جی نہیں اتنا اہم فیصلہ بہت اعلیٰ سطح پر کیا جاتا ہے۔

ون یونٹ ہی بہتر تھا

ماضی کے اپوزیشن رہنما میر عبدالباقی بلوچ سے ایک ملاقات

مطبوعہ: ۱۹ فروری ۱۹۸۹ء

سوال... باقی بلوچ صاحب! یادش بخیر ماضی کے حوالے سے آمریت کے
دور میں آپ کی جدوجہد اور آواز حق بلند کرنے کی پاداش میں گوناگوں مشکلات
کا سامنا جس میں آپ پر قاتلانہ حملہ بھی شامل ہے یقیناً آپ ہی کا حصہ تھا۔ سب سے
پہلے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنا کچھ تعارف کروا دیجئے۔

عبدالباقی بلوچ..... شکریہ میرا تعلق مکران سے ہے۔ ہمارے ہاں چار
ریاستیں تھیں اور وہاں سکول صرف مستونگ میں تھا جو پنجاب یونیورسٹی سے منسلک
تھا۔ تربت میں صرف ایک پرائمری سکول تھا۔ دسویں کے لیے مجھے مستونگ آنا پڑا۔
اس زمانے میں جو کوئی مستونگ پڑھنے آتا تھا اسے ریاست قلات ۱۰ روپے وظیفہ
دیتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں میٹرک کیا۔ پارول... پاسنوں میں فرسٹ آیا تھا۔ وہاں سب کو
سکالر شپ ملتا تھا کہ پڑھائی جاری رکھے۔ پہلے مجھے کہا گیا کراچی جا کر کامرس پڑھو۔
شیخ صاحب کامرس کالج کے پرنسپل تھے۔ میں ایک روز لیٹ تھا۔ ۲۱۱ میل کا
فاصلہ میں ۴ دن میں طے کر کے وہاں پہنچا۔ انہوں نے پوچھا کون ہو؟ میں نے کہا مکرانی
ہوں۔ انہوں نے میرے ساتھ خاصا تضحیک آمیز رویہ اختیار کیا۔ میرا ذہن شاید

شروع ہی سے باغیانہ رہا۔ میں واپس آیا اور کہہ دیا کہ کراچی میں نہیں پڑھ رہا
واپس کر دیا۔ اس کے بعد لاہور آیا اور یہاں اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ پڑ
ہی میں کالج میگزین کریسنٹ کا ایڈیٹر بن گیا۔ ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر
بنتا رہا۔ مجھے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اور شیر محمد اختر جیسے عظیم لوگوں کی رہنمائی میسر رہی
بہرحال سیلف کوآرڈینیشن کی۔ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنا چاہا پولیٹیکل پیپر
تھیسس تھا پولیٹیکل ہسٹری آف بلوچستان سٹیٹس یونین ان دنوں ایمرجنسی رہا
تھی اسمبلی انہوں نے توڑ دی۔ مواد صرف ملتا تھا ہسٹری آف سٹیٹس اینڈ
ریکن میں جن کے گورمانی صاحب منسٹر تھے۔ گورمانی صاحب سے بھی ان دنوں
یاد اللہ ہوئی تھی۔ وہ یوں کہ جب یہاں "بنیادی اصولی کمیٹی" کی رپورٹ پر خواجہ
ناظم الدین کی کیبنٹ لوگوں کی رائے معلوم کرنے آئی تو انہوں نے مختلف وفود
تھے۔ ایک طلبہ کا بھی وفد تھا جس میں اسلامیہ کالج کے ہم دو لڑکے تھے اور دوسرا
کابینہ بیٹھی تھی۔ وہاں بولنے والے تو ایک دو ہی ہوتے ہیں۔ میں
زیادہ تر سوالات پسماندہ علاقوں سے متعلق کئے کچھ جوابات خواجہ ناظم الدین
خود دیتے تھے اور کچھ گورمانی صاحب۔ میٹنگ کے خاتمے پر گورمانی صاحب
مجھے الگ بلا کر ملے پوچھا کہاں کے ہو؟

میں نے کہا مکران سے۔ بڑے حیران ہوئے کہنے لگے مجھ سے تم روز ملو
ملنا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہو چکا تھا ہم نے ان دنوں تاثیر نمبر نکالا
چنانچہ ملاقات پر میں وہ نمبر اور دو تین اور پرچے کریسنٹ کیلئے گیا تھا۔ انہوں نے
میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے کہا کہ میں چھٹیوں میں کراچی آؤں۔ میری مدد کریں گے
اور سہولیات بہم پہنچانے کا وعدہ بھی کیا۔ اس طرح ان سے رابطہ ہوا۔ مجھے وہ کراچی
سے اپنے ساتھ کوئٹہ لے گئے اس طرح گورمانی صاحب کے ذریعے میرا وہاں کے اعلیٰ
حلقوں میں تعارف ہوا۔ میرا خصوصی پاس گورمانی صاحب کی طرف سے بنا ہوا تھا اور
میں گورنر ہاؤس میں بے دھڑک آتا جاتا تھا۔ اتنے تعلقات کے باوجود چونکہ

تھی اس لیے مجھے کوئی فائل نہیں دکھائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ میں فائنل کا امتحان نہ
دے سکا۔ ۵۶ء میں جام صاحب کا میں نے گورمانی صاحب سے تعارف کروایا تھا۔

سوال۔۔۔ تب آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا؟

عبدالباقی۔۔۔ جی ہاں۔ باقاعدہ نہیں لیکن سیاست میں دلچسپی شروع تھی۔
میں ان دنوں اصل میں لاء پڑھنے کے چکر میں تھا۔ جام صاحب نے امید دلائی کہ وہ میرا
خرچ اٹھائیں گے۔ میں تو بہت غریب آدمی تھا۔ ان دنوں الیکشن ہو گئے میں نے منتخب
ممبران کو جام صاحب سے متعارف کروانا شروع کیا۔ ان دنوں ری پبلکن کی اکثریت
تھی۔ میں لاہور آیا یہاں ان دنوں ڈاکٹر خان کی وہ منسٹری تھی جو ایک ووٹ سے
جیتی تھی۔ ڈاکٹر خان بلوچستان سے منسٹر لینے میں خاصی ہچکچاہٹ دکھا رہے تھے۔ غالباً وہ
یہ چاہتے تھے کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو وہاں سے کسی پٹھان کو لے لیں بعد میں
انہوں نے صالح محمد سندر خیل کو ڈپٹی منسٹر بنایا تھا۔ اس وقت قانونی پوزیشن یہ تھی کہ
جب تک وزیر اعلیٰ منظوری نہ دے۔ گورنر اس کو منسٹر نہیں بنا سکتا تھا۔ گورمانی صاحب
نے ڈاکٹر خان سے کہا وہ فوراً جام صاحب کو منسٹر لیں ورنہ وہ لوگ اپوزیشن میں چلے
جائیں گے اب ڈاکٹر خان ایک ووٹ سے جیتا ہوا آدمی تھا وہ انکار کیسے کرتا بلوچستان
کے آٹھ دس لوگ اگر اپوزیشن میں چلے جاتے تو اس کی پوزیشن کیا رہ جاتی۔ چنانچہ خان صاحب
کو منسٹر بنانا پڑا اور جام صاحب منسٹر بن گئے۔

سوال۔۔۔ آپ نے پھر باقاعدہ سیاستدان بننے کا فیصلہ کب کیا؟

عبدالباقی: میں پھر ۵۷ء میں مکران گیا۔ یوں تو میں وہاں آتا جاتا رہتا تھا
لیکن اب یہ پروگرام بنا کر گیا کہ مجھے یہاں سے بطور سیاستدان ابھرنا ہے اور میرا خیال
تھا کہ اس عمل میں مجھے ۱۰ سال لگیں گے۔ میں نے دیکھا یہاں لوگ جانوروں سے بدتر زندگی
بسر کرتے تھے۔ ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے نگور سے آغاز کیا۔ لوگوں
کے مسائل آگے پہنچانے شروع کئے ان کے لیے یہ بڑی بات تھی۔ میں نے صدق دل سے
لوگوں کی خدمت کی ان دنوں نگور میں بارش بھی نہ ہوئی۔ خاصی قحط سالی ہوئی لیکن سرکار

اپنا حصہ کہاں چھوڑنی تھی اسے لوگوں کے مسائل سے کیا۔ میں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ نیا نیا مارشل لاء لگا تھا میں نے کہا کہ اس علاقے کو "آفت زدہ" قرار دے کر معاف کیا جائے میری کوششیں بار آور ہوئیں اور انہیں محصول اس سال کا معاف اس سے اللہ نے میری عزت بنائی۔ انہی دنوں یہ بی ڈی الیکشن آئے۔ میرا ان میں لینے کا قطعاً کوئی پروگرام نہیں تھا میں تو اسمبلی کا ذہن میں رکھ کر بیٹھا تھا لیکن لوگوں نے کیا۔ میں نے کہا ایک صورت سے کھڑا ہوتا ہوں میں اکیلا تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ تم دوسرے وارڈوں میں بھی میرے آدمی لاؤ تو آؤں گا۔ چنانچہ سوائے دو ممبران کے تمام ہمارے ہی لوگ کامیاب ہوئے۔ میں بلامقابلہ ممبر اور بلامقابلہ لیبر یونین کونسل کا چیئرمین منتخب ہو گیا۔

سوال ..... گورنر کالاباغ سے آپ کا تعارف کب ہوا؟

عبدالباقی ..... انہی دنوں تعارف ہوا۔ وہاں انہوں نے ملاقات میں بی ڈی کنونشن بلوایا۔ میں تب ہی تھا۔ گورنر امیر خاں بھی وہاں آئے تھے وہاں ڈپٹی کمشنر ملک وارث تھا۔ اس سال بھی بارش نہ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ قحط سالی کا ریزولیشن پاس کروا کر لوگوں کی مشکلات کا ازالہ کروں۔ وہاں کسی کو اس کا علم ہی نہیں تھا۔ میں نے وہاں ریزولیشن ڈسٹرکٹ کونسل میں پاس کروالیا کہ فلاں فلاں علاقوں کو آفت زدہ قرار دیا جائے۔ جس سے ان کے ٹیکس وغیرہ معاف ہو گئے۔ اب یہ ملک وارث مجھ سے سودا بازی کرنے لگا۔ جو دوست آفر لایا تھا میں اس پر بگڑا لیکن اس نے کہا مصلحت اختیار کرو ورنہ یہ تمہارے فنڈز کم کر دے گا۔ میں نے گول بات کر دی۔ فنڈز آئے تو میں نے بند وغیرہ بنوا دیئے۔ ۱۵ اروپے فی بل لوگوں کو دیئے اور ہیرا پھیری کا کوئی چانس چھوڑا نہیں۔ ملک وارث نے کہا کہ تمہارا علاقہ تو آؤٹ آف دی وے ہے وہاں کون جائے گا۔ آدھا کھاؤ، آدھے مجھے دو۔ اگر کوئی آیا بھی تو ہم کہہ دیں گے کہ بارشوں نے بہا دیا وہ بھنا گیا میرا دشمن ہو گیا۔ ایک سیشن وہاں مرآپسی تعاون پر تھا کہ بی ڈی ممبران اور سرکاری افسر آپس میں تعاون کریں۔ اس پر میں کھڑا ہو گیا وہ سامنے بیٹھا تھا میں نے کہا آپ کتنے ہیں تعاون کرو۔

آدھے آدھے پر تو ہم تعاون کرنے سے رہے اور وہاں ساری بات بتادی۔ وہاں تو جناب ہنگامہ ہو گیا۔ ملک امیر خاں وہاں بیٹھے تھے کہنے لگے آپ فکر نہ کریں میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔ میں ہنڈو آدم ایک سلسلے میں چلا گیا۔ پندرہ روز بعد مکران واپس آیا تو ملک وارث نے تحصیل دار سے کہا اسے پکڑو۔ وہاں میں گھبرا گیا اس نے کہا کہ لکھ کر دو۔ اسی چکر میں ملک وارث کی ٹرانسفر ہو گئی میری عزت اور بڑھ گئی۔ میرا واحد یونین کونسل تھا جہاں سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی گئی تھی۔

نواب مکران کے بیٹے نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ یہ تاریخی واقعہ تھا۔ کہ وہ ہار گیا تھا۔ اس وقت عطاء اللہ مینگل کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ بزنجو کو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ یہ سردار بڑے عزت والے انہوں نے وہاں پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ باقی ہمارے ساتھ ہے۔ کیونکہ قومی اسمبلی کے حلقہ انتخاب میں میرا علاقہ شامل تھا۔ مکران میں تھوڑی اپنی سرداری تھی۔ ہر جگہ مشہور کر دیا کہ میں اور وہ ایک ہیں۔ اسکے ساتھ ہی پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ باقی تو ہماری جیب میں ہے جب چاہیں لے آئیں گے۔ میرے لوگوں نے اس پراپیگنڈہ کے زیر اثر انہیں قومی اسمبلی کی سیٹ پر کامیاب کروا دیا۔ انہوں نے کہا جناب احمد نواز بگٹی کو وزیر بنایا جائے اور تمام بلوچستان والے ایک ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا مجھے کوئی دلچسپی نہیں کسی کو وزیر بنانے یا نہ بنانے سے۔ میں اپنا کام کروں گا اب اس میں دو گروپ ہو گئے ایک طرف نبی بخش زہری اور رسالبو رفیق تھے۔ ہم انہیں سردار ول سے ذرا کم ہی سمجھتے تھے سرمایہ دار پیسہ دیتا ہے کسی کی جان کم ہی لیتا ہے۔ سردار لوگ گورانی صاحب کے پاس گئے اور میری شکایت کی۔ وہ بڑے سمجھدار آدمی تھے سب کچھ جانتے تھے۔ مجھے انہوں نے بعد میں بتایا۔ گورانی نے انہیں کہا سردار تم لوگ اب آسمان سے اترو۔ باقی پڑھا لکھا لڑکا ہے اسے بلوچستان کا لیڈر بناؤ۔ انہوں نے کہا کہ جی نبی بخش نہیں مانے گا انہوں نے کہا میں نبی بخش سے بات کرتا ہوں تم لوگ تیار ہو۔ انہوں نے کہا ہم تیار ہیں۔ نبی بخش سے پوچھا انہوں نے کہا ہم تو تیار ہیں۔ اب گورانی صاحب نے مجھے کہا اگر یہ خود تم سے درخواست کریں تو قبول کر دینا۔ اگر انہوں

چل دی۔

رات عشاء سے ذرا پہلے ہی جب کہ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ سلیم اور نواب بلقیس کے گھر داخل ہوئے۔ بیرونی دروازے کے باہر ہی وہ رک گئے۔ اندر صحن سے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز دے رہی تھی۔ وہ بار بار پکار رہا تھا۔

امی! امی! امی لاؤ۔

اچانک بڑے بچے کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

منے چپ ہو جاؤ ورنہ میں بھی رو پڑوں گا۔

چھوٹا بچہ چپ چپ نہ ہوا تو بڑا بھی رونے لگ گیا۔ عجیب آہ و زاری سے رو رہے تھے بچارے۔ اردگرد کے مکانوں والے لوگ جاگ رہے تھے مگر کوئی بھی انہیں پوچھنے نہ آ رہا تھا۔

سلیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نواب بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دونوں چارپائیاں صحن میں بچھی ہوئی تھیں اور ان دونوں کے درمیان دونوں بچے زمین پر بیٹھے رو رہے تھے۔

سلیم کو دیکھتے ہی بڑا بچہ اٹھ کر بھاگا اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ماموں! خدا کے لیے میری امی کو بچاؤ۔ اس کی عزت لٹ گئی تو ہم مر جائیں گے۔

سلیم نے بڑے پیار سے اسے اوپر اٹھایا۔

کیا ہوا بیٹے! کہاں ہے تمہاری امی۔

اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

ماموں! وہ دن کے وقت جن دو بدمعاشوں سے تم نے میری امی کو بچایا تھا وہ ابھی ابھی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ گاؤں کے کسی آدمی نے ہماری مدد نہیں کی۔ دیکھو تو ماموں! سب ہی لوگ اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے ہیں۔ پر کسی نے انہیں منع نہیں کیا۔ میں نے ان معاشوں کو روکا تو انہوں نے مجھے بھی مارا اور امی کو اٹھا کر لے گئے۔

اس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

یہ دیکھو ماموں! وہ مار کر میرا ایک دانت بھی نکال گئے ہیں۔

سلیم نے دیکھا اس کے منہ سے خون بھی بہہ رہا تھا اور اس کا سامنے والا ایک دانت نہیں تھا۔ سلیم خلاؤں میں کھو گیا۔

بچہ پھر بولا۔

آج میں اگر جوان ہوتا تو خدا کی قسم وہ میری امی کو اٹھانے کی کبھی جرات نہ کر پاتے۔ میں ایک ایک کے ستر زخم لگاتا۔

سلیم خاموش تھا اور ابھی تک خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ نواب کی پلکیں بھی تر تھیں۔ بچے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

ماموں! کیا تم ہماری مدد نہ کرو گے۔

سلیم چونک گیا۔

ضرور —— میں تمہاری مدد کروں گا بیٹے! میں تمہاری امی

ایک اور آواز ابھری۔

آج بچ کر جانے نہ پائیں۔

سلیم سب کچھ سن رہا تھا۔

ایک اور مدھم آواز ابھری

صرف ایک آدمی دروازہ کھولو اور باقی دونوں دروازوں کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی اندر داخل ہوتے ہیں مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا۔

وہ سارے کھڑے ہو گئے اور صحن میں چلتے ہوئے جب دروازے کے پاس آئے تو دفعتہً ہی سلیم نے دو ہوائی فائر کیے اور ساتھ ہی پوری قوت سے چلایا۔

یہیں کھڑے رہو بدمعاشو! اور ہتھیار ڈال دو۔ کسی نے بھی اگر ہلنے کی کوشش کی تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ چھلنی ہو جائے گا۔

وہ سب اپنے قدموں پر جم کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک ادھر ادھر جھانکتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلیم نے تاک کر دو گولیاں اس کے پاؤں کے قریب ماریں اور پھر چلا کر کہا۔

بھاگنے کی کوشش بیکار ہے۔ سیدھی طرح کھڑے رہو۔ ادھر ادھر مت جھانکو۔

سب نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ اور ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں نواب نے لگاتار رائفل کے دو بٹ دروازے

پر مارے اور اسے توڑ کر اندر آ گیا۔ سب سے پہلے اس نے ایک ایک کی تلاشی لی۔ پھر سارے ہتھیار اٹھا کر وہ ناند کے پاس رکھ آیا۔ پھر دوستوں کی طرف گیا اور بلقیس کی رسیاں کاٹ دیں۔

دوبارہ وہ ناند کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنی رائفل کا رخ ان سب کی طرف کر لیا تھا۔ اب سلیم ناند سے نکلا۔ رائفل اور ریوالور اس نے وہیں رکھ دیئے اور ٹوکا ہاتھ میں لیے ہوا تھا۔ ان کے قریب آ کر اس نے ٹوکا ہوا میں لہرایا۔

سب ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔

انہوں نے فوراً ایک لائن بنا لی۔

سلیم نے بلقیس سے پوچھا۔

کون کون تمہیں اٹھانے گیا تھا بہن!

روہانسی سی آواز میں اس نے جواب دیا۔

یہ سب گئے تھے

سلیم نے پھر ٹوکا لہرایا اور زہریلی آواز میں کہا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ تم سب کی گردنیں اڑا دی جاتیں۔ مگر میں تم پر ترس کھاتا ہوں۔ صرف سب کا ایک ایک ہاتھ اور وہ بھی بایاں ہاتھ کاٹوں گا۔ تاکہ تمہیں بھی نصیحت ہو اور دوسرے بھی عبرت پکڑیں۔ سب اپنا اپنا بایاں ہاتھ آگے کر لو۔

سلیم جونہی سب سے پہلے آدمی کے قریب گیا۔ اس نے

سندھ جل رہا ہے اور ...

مطبوعہ: ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء

۳۰ ستمبر کو حیدرآباد اور پھر کراچی میں بے گناہ پاکستانیوں پر ٹوٹنے والی قیامت نے خیبر سے کراچی تک ہر درد دل رکھنے والے پاکستانی کو متاثر کیا۔ بر صغیر کی تاریخ میں بے گناہ انسانوں کے قتل عام کی جلیانوالہ باغ کے بعد یہ واحد مثال ہے لیکن اس لحاظ سے بہر حال منفرد ہے کہ یہاں مرنے والوں کو اپنے گناہ کا علم نہیں تھا کہ کس بے گناہی کی سزا دی جا رہی ہے۔ پہلے روز حیدرآباد کے بھرے پڑے بازاروں میں بچوں، عورتوں، مردوں کا جو بہیمانہ قتل عام کیا گیا اور بلا تخصیص رنگ و نسل جو انسانوں پر موت کے دروازے کھولے گئے اس سے ایک بات تو اظہر من الشمس ہے کہ یہ غیروں کا فعل قبیح تھا اپنوں کی کارستانی نہیں تھی۔ پاکستان کا کوئی شخص یہ ماننے کو تیار نہیں کہ کوئی پاکستانی خواہ وہ لسانی یا صوبائی حوالے سے کتنا ہی انتہا پسند ہو اس طرح اندھا دھند اپنے ہم وطنوں کا قتل عام نہیں کر سکتا جس بے رحمی و شقاوت دلی سے حملہ آوروں نے کیا۔

یہ افسوسناک واقعات بدقسمتی سے اس وقت پیش آ رہے ہیں جب ملک میں جمہوریت کا دور دورہ ہونے کی نوید سنی جا رہی ہے انتخابات کی آمد آمد ہے اور گیارہ سال کے طویل آمرانہ تجربے کے بعد اب عوام سیاست دانوں سے سنجیدگی کی توقع کئے بیٹھے ہیں۔

اس صورت حال پر ملک کے تقریباً تمام طبقوں نے دلی رنج و غم کا اظہار

آیئے اس ضمن میں سیاسی پارٹیوں کے کردار کا جائزہ بھی لے لیں۔

مسلم لیگ (جے) گروپ کے جناب محمد خان جونیجو نے ۳۰ ستمبر کو اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کے دوران صرف یہی کہنے پر اکتفا فرمایا کہ حکومت کراچی اور حیدرآباد کے شہریوں کے جان و مال کے تحفظ کے لئے مؤثر اقدامات کرے جبکہ پاکستان جمہوری پارٹی کے صدر نوابزادہ نصراللہ خان نے کہا کہ کراچی اور حیدرآباد میں خونریزی کرنے والے ملک کے دشمن ہیں اور انہیں عبرتناک سزا دی جائے اس کے ساتھ ساتھ لسانی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے اور عدالتوں میں لایا جائے انہوں نے ان واقعات کو نگران حکومتوں کی کمزوری قرار دیا اور مطالبہ کر دیا کہ نگران حکومتیں فوراً مستعفی ہو جائیں۔

جمعیت علمائے پاکستان کے نائب صدر شاہ فرید الحق کا کہنا تھا کہ حکومت حیدرآباد میں خونریزی کرنے والے افراد کو بے نقاب کرے ان کا کہنا تھا کہ اس خونریزی میں سندھ کی ایک اقلیت بھی وابستہ ہے اور شاہ احمد نورانی نے بہت پہلے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ پاکستانی سرحدوں پر بلند آبادی پاکستان کے لیے مسائل پیدا کر رہی ہے لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

پیپلز پارٹی کی شریک چیئرمین مس بے نظیر بھٹو نے کہا کہ اس سانحے کی عدالتی تحقیقات کروائی جائے اور عوام کے جان و مال کی حفاظت حکومت کا فرض تھا لیکن حکومت اپنے دیگر فرائض کی ادائیگی کی طرح اس میں بھی ناکام رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکمران اپنی کرسیاں کو بچانے کے لیے عوام کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں اور بیگم نصرت بھٹو نے تو واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ان واقعات میں حکومت خود ملوث ہے۔

دوسرے سیاست دانوں نے بھی ملتے جلتے بیانات دیئے اور تقریباً تمام اپوزیشن پارٹیوں کی طرف سے ان ہولناک واقعات کو حکومت کی ناکامی کا سبب گردانتے ہوئے نگران حکومتوں سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔

یہی نمائندہ ردعمل جو سیاسی جماعتوں کی طرف سے سامنے آیا جبکہ عوام کی توقعات ان سے بہت مختلف تھیں۔ ہمارے محترم سیاست دانوں نے شاید اس سانحے کو بھی

معمول کی کارروائی سمجھ لیا تھا اور جس طرح وہ ملک میں مسلسل ہونے والے دھماکوں یا سماوی و آفاقی نوعیت کے حادثات پر معمول کے مطابق بیانات جاری فرماتے رہے یہاں بھی سب کے معمول کے بیانات داغ کر یہ جان لیا کہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے۔

یہ معمول کی بات اس طرح ہوئی کہ عوام الناس جاننے لگے ہیں ملک میں کوئی حادثہ ہو جائے بر الپوزیشن اس کا الزام برسر اقتدار پارٹی کو دے گی اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ شہریوں کے جان و مال کی ذمہ داری بہر حال حکومت کا فرض ہے اور یہ ان کے فرائض میں کوتاہی کے سبب ہی عوام کی جانیں اور ان کے مال کو خطرات لاحق ہوں گے اگر انتظامیہ حالات پر کڑی نگاہ رکھے اور اپنے معاملات میں کوتاہی نہ کرے تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ دشمن فائدہ اٹھا لے ہیں کامیاب آخر ملکی نظم و نسق چلانے کے لیے حکومتیں ادارے تشکیل دیتی ہیں اور ان کے درمیان فرائض کی تقسیم کی جاتی ہے تو مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا فرض ادا کرے اور اس بات کی تنخواہ بھی وہ حکومت سے وصول کرتے ہیں. لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ہی تمام معاملات کی ذمہ دار ہے۔

ملک میں موجود دیگر طبقات ہائے زندگی صرف اپنے حقوق کے لیے ہی شور برپا کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے فرائض کا ادراک نہیں ہے۔؟

ایک ایسی سیاسی جماعت جو ملکی فلاح و بہبود کی ضامن ہے جس کا منشور ملک کو ایک فلاحی مملکت بنانے کا آئینہ دار ہو۔ جسے اپنے کارکنوں کی تربیت پہ ناز ہو جو ملک گیر بنیادوں پر مضبوط مستحکم اور مربوط ہونے کی دعویٰ دار بھی ہو کیا اس جماعت کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ جب تک اسے اقتدار نہ مل جائے وہ ریاست کے کسی فلاحی کام میں حصہ نہیں لے گی. کیا ہمارے ہاں سیاسی جماعتوں کی ملکی خدمت ان بنیادوں پہ ہونے لگی ہے. اگر خدانخواستہ رویہ یہی ہے تو یہ سوچ جان لیوا اور خطرناک ہے۔

پنجاب میں سیلاب آیا اور یہاں سیاسی جماعتوں نے سیلاب زدگان کی امداد کے لیے کیمپ لگائے۔ ان کا یہ جذبہ قابل تحسین اور باعث برکت ہے لیکن افسوس ناک تو یہ ہے کہ جب انہی سیاسی جماعتوں کے کارکن سیلاب سے تباہ حال بستیوں میں امداد کی ادائیگی کرنے جاتے تو عوام سے ان کا رویہ کچھ ایسا ہوتا تھا کہ لوگوں کو یہی گمان گزرتا گویا ان سے امداد کے کام پہ ووٹ طلب کئے جا رہے ہیں۔ یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے پریشان حال عوام میں یہ نظریہ جڑ پکڑنے لگے کہ یہ لوگ خدمت کے جذبے سے نہیں بلکہ الیکشن میں ووٹوں کے حصول کے لئے ہمارے پاس آئے ہیں۔

ممکن ہے کچھ سیاسی کارکنوں کی طرف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہو گویا ان کی یہ امدادی مہم بھی الیکشن مہم ہی ہے لیکن ایک خوش فہم اور تصویر کے مثبت رخ پر نگاہ رکھنے والے انسان کی حیثیت سے ہم یہی سوچیں گے کہ ان کا جذبہ خدمت کسی الیکشن مہم سے مشروط نہیں تھا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ بعینہ حیدرآباد اور کراچی کے سانحے پر سیاسی راہنماؤں کا ردعمل کیا ہوا ہے اور انہوں نے خونریزی کی مذمت میں بیانات دے کر اور حکومت پہ ملبہ ڈال کر یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام معاملات سے بری الذمہ ہو گئے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ سیلاب زدہ علاقوں میں کم از کم ان صاحبان نے پانی اترنے کے بعد ہی سہی دورہ کرنے کی زحمت تو گوارا کر لی اور عوام کے مسائل بھی سن لئے لیکن یہاں تو ایسی بھی کوئی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی. کراچی اور حیدرآباد میں جو قیامت ۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر کو ٹوٹی ہے وہ کوئی آناً فاناً نہیں ٹوٹ پڑی بلکہ اس کی توقع بہت پہلے سے کی جا رہی تھی۔ اور تقریباً ہر باشعور شخص کی زبان پر ان خدشات کا ذکر رہتا تھا جو ایک عرصے سے ملکی سرحدوں پہ منڈلا رہے اور عوام الناس کے اذہان کو آسیب کی طرح ڈس رہے تھے. ٹھیک ہے اس معاملے میں انتظامیہ کی نااہلی کو بھی دخل حاصل رہا ہوگا. لیکن یہاں ہم یہ بات بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہماری انتظامیہ بھی ہم ہی سے ہے اور موجودہ معاشرتی اقدار میں کسی مثالی حکومت کی توقع کرنا احمقوں کی جنت

میں رہنے کے مترادف۔ اس لئے سارا الزام حکومت پر دھر کر مطمئن ہو کر بیٹھ
کیسے ممکن ہے۔

ایک عام پاکستانی جو بے وسائل ہے صرف احتجاج کر سکتا ہے۔ اس
اس سلوک کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت پر تنقید کر کے یہ سمجھے کہ اس
اپنا فرض ادا کر دیا لیکن سیاسی جماعتوں کا اپنا ملقہ اثر ہوتا ہے۔ ایک تنظیم ہوتی
خدا کا شکر ہے ہمارے ہاں سیاسی لحاظ سے بڑی بڑی قد آور شخصیتیں موجود ہیں
اگر انہوں نے ان ہنگاموں میں اپنے کردار کا تعین کیا ہوتا اور یہ احساس بھی کیا ہوتا
ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام سیاسی مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اپنا کردار
کریں گی تو ممکن ہے ہمیں یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی شہر میں جہاں ملک کے کونے کونے سے
حصول روزگار کے لیے جایا کرتے تھے آج زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ نفرت اور
تعصب کی گھنگھور گھٹائیں ہر طرف منڈلا رہی ہیں۔ اندھیرا ایسا کہ کسی کو کچھ نہیں سوجھ
کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ حیدرآباد اور کراچی میں مسلسل کرفیو کے بعد یہ عالم ہے کہ بیشتر
گھرانوں میں لوگ فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ
نہیں۔ اشیائے صرف کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں اور دوسری طرف روزگار کے
دروازے بند ہیں۔ کئی جگہ تو سرکاری ملازمین کو بھی تنخواہ نہیں مل سکی۔

تجارتی ادارے، دفاتر، بنک، مارکیٹیں سب کرفیو کی زد میں آئی ہوئی ہیں۔
ان لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں جو آنے والے وقت کے لئے
ضرورت سٹور کر کے رکھتے ہیں۔

دونوں بڑے شہروں کی بیشتر آبادی سفید پوش اور تنخواہ دار طبقے پر مشتمل ہے
اور ان لوگوں کی زندگیاں ماہوار بجٹ کی محتاج ہوا کرتی ہیں۔ وہاں تو وہی کھایا جاتا
ہے جو کمایا جائے۔ شنید ہے کہ بیشتر سفید پوش لوگوں کے پاس کھانے پینے کی اشیاء
خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں رہے۔ وہ کرفیو کے وقفے میں بھیک نہیں مانگ سکتے

اور کسی سیاسی، سماجی تنظیم کو شاید یہ توفیق نصیب ہوئی ہو کہ وہ ان بدقسمت لوگوں کی
خبرگیری کرے۔

ان حالات میں جب عوام خصوصاً سندھ کے عوام سیاسی جماعتوں اور ان
کے لیڈران کرام سے بیانات سے بہت آگے کی توقعات باندھے ہوئے ہیں۔ افسوس
تو اس بات کا ہے کہ سیاسی جماعتیں اور سیاسی گروہ خواہ وہ زبان کے حوالے سے
معرض وجود میں آئے ہیں یا پھر کسی اور خود ساختہ حوالے سے رنجشیں بھلا کر اور
کدورتیں دور کر کے (خواہ کچھ عرصے ہی کے لئے سہی) ایک دوسرے کے ساتھ
تعاون کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر الزام تراشی میں مصروف ہیں۔ ایک گروہ دوسرے
گروہ پر ان واقعات کی ذمہ داری ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دینے میں مصروف
ہے بلکہ یہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ اگر ہمارے ساتھ فلاں شہر میں یہ سلوک ہوا تو
ہم اس کا بدلہ لیں گے اور کچھ جماعتوں کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ہمیں کام کرنے
کا موقعہ نہیں دیا جا رہا یا ہمارے کام میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔

یہ مجموعی صورت حال انتہائی افسوسناک اور ملکی سالمیت کے لئے تباہ کن
ثابت ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں سیاسی اور انتخابی عمل کی تاریخ یوں بھی بہت شاندار نہیں ہے
اور حالات ایسے ہی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جن میں عوام کا اعتماد سیاسی جماعتوں سے
اٹھتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں سیاسی جماعتوں کو اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے
بھی میدان عمل میں آنا پڑے گا اور انتخابی تقاضوں سے قطع نظر صورت احوال
کی اصلاح کے لیے صرف بیانات پر اکتفا کرنے کی بجائے عملی تقاضے پورے کرنا
ہوں گے۔

شہر کراچی میں ہونے والے نسلی و لسانی فسادات اور ہنگاموں پر اگرچہ بہت
کچھ لکھا جاتا ہے لیکن یہ موضوع اس وقت تک پرانا نہیں ہو سکتا جب تک یہ ہنگامے
سرد نہ ہو جائیں۔ فی الحال ان فسادات کے خاتمے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اگر شہر

کے ساتھ گلی کی سمت گولیاں برسانے لگا۔

گلی میں چودھری اور اس کے آدمی دیواروں کی اوٹ میں بیٹھ

ہوا۔ وہ جھکا ہوا نشان پڑ بڑھتے ہوئے پرچھتی کی آڑ میں منڈیر کی طرف

رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

منڈیر پر آکر نواب نے چھت کے جنگلے کے ایک سوراخ میں

علاقے کے باسیوں کے تاثرات معلوم کئے۔ کرفیو کے نفاذ سے ان کے تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ کرفیو سے معمولات زندگی کس طرح متاثر ہوتے ہیں؟ کیا مسائل پیدا ہوئے ہیں، بار بار کرفیو سے انہیں علاقے کی صورتحال میں بہتری کے کچھ آثار نظر آتے ہیں؟ اور علاقے میں کرفیو کے دوران قانون نافذ کرنے والے اداروں کا رویہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔؟ ان تمام سوالات کے جواب کرفیو زدہ علاقوں کے مکینوں نے اس طرح دیئے۔

مسز شریف یزدانی (خاتون خانہ)۔۔۔۔ کرفیو کا اچانک نفاذ بیک وقت اطمینان اور پریشانی کا باعث ہوتا ہے اطمینان اس لیے کہ گھر کے اردگرد گولیوں کی "ٹھائیں ٹھائیں" سے نجات مل جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے لیے اس خوف سے نجات مل جاتی ہے کہ کیا خبر کسی وقت کسی دہشت گرد کی گولی کا نشانہ بن جائیں اس طرح کرفیو سے وقتی طور پر ہنگامے سے تو نجات مل جاتی ہے لیکن کرفیو سے بھی بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں خاتون خانہ کو بہت سے مسائل سے نپٹنا پڑتا ہے۔ گھر میں اشیائے خوردونوش موجود نہیں ہوتیں۔ سخت کرفیو کی صورت میں وقفہ بہت کم ہوتا ہے اس دوران اگر کچھ سامان خریدنے جائیں تو دوگنا، تین گنا دام پر ملتا ہے۔

دوکاندار کہتے ہیں ہم نے بھی تو اپنی روزی اسی وقفے میں کمانی ہے۔ اگر کوئی بیمار ہو جائے تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا مسئلہ بن جاتا ہے۔ گھر میں اگر چھوٹے بچے ہوں تو پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔ مسز یزدانی نے کہا بار بار کرفیو کے نفاذ سے ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب شہر میں کسی پر بھی فائرنگ ہو ہم اپنے علاقے میں کرفیو کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کرفیو کے نفاذ سے مجھے تو صورتحال میں بہتری کی کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ اب تو یہ ایک معمول بن گیا ہے کچھ دنوں بعد دوبارہ ہنگامہ ہو جاتا ہے لوگ مار دیئے جاتے ہیں اور پھر کرفیو لگ جاتا ہے میرے خیال میں ہنگاموں کی اصل وجوہات تلاش کر کے ان کا سدباب کرنا ضروری ہے۔ ہم مختلف قومیتوں کے لوگ اس جگہ مل جل کر رہتے تھے معلوم نہیں اب یہ تعصب کی آگ کیسے بھڑک اٹھی ہے اسے

ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاستدانوں سمیت ہر فرد کا یہ فرض بن گیا ہے جہاں تک قانون نافذ کرنے والے افراد کا تعلق ہے کرفیو کے دوران فوج اور رینجرز وغیرہ کا رویہ لوگوں کے ساتھ کافی سخت ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو گھر سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔

طلعت یاسمین (طالبہ جامعہ کراچی)۔۔۔۔ کرفیو کے نفاذ سے زندگی کی رفتار ایک دم رکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جب بھی کرفیو لگتا ہے سخت کوفت ہوتی ہے تمام معمولات زندگی متاثر ہو جاتے ہیں، پڑھائی کا سخت حرج ہوتا ہے کرفیو کی وجہ سے کبھی امتحانات ملتوی ہو جاتے ہیں اور کبھی کورس ہی مکمل نہیں ہوتا۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہماری زندگی کا شیڈول ہی کرفیو کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے۔

بار بار کرفیو لگنے کے باوجود صورتحال میں بہتری کے آثار نظر نہیں آتے انتظامیہ پر شدید غصہ آتا ہے جس کی ذمہ داری امن وامان کی صورتحال برقرار رکھنا ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے انتظامیہ کی ذمہ داری صرف کرفیو کا نفاذ ہی رہ گئی ہے۔ وہ ایسی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ ہنگامے، فساد برپا نہ ہوں تاکہ کرفیو لگانے کا موقع نہ ملے۔ بعض اوقات تو ان حالات سے اتنا جی گھبراتا ہے کہ کراچی چھوڑ دینے کو دل چاہتا ہے کرفیو نافذ کرنے والوں کا رویہ خواتین کے ساتھ عموماً نرم ہوتا ہے۔

ظفر اقبال (انجینئر لیفتھانسا ائیر لائنز)۔۔۔۔ کرفیو کے نفاذ سے ہم خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں اگرچہ یہ پابندی یا قید جیسی حیثیت رکھتا ہے لیکن کراچی کے حالات اور انتظامیہ کی نااہلی دیکھتے ہوئے تو یہی دل چاہتا ہے کہ یہاں مستقل کرفیو لگا دیا جائے تاکہ قتل وغارت سے تو نجات ملے۔ کرفیو کے نفاذ سے بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دفتر جانے میں دشواری، اشیائے ضرورت کی خریداری میں تکلیف، بچوں کی پڑھائی کا حرج الگ ہوتا ہے لیکن یہ ساری پریشانیاں ہم یہ سوچ کر برداشت کر لیتے ہیں کہ اس طرح کم از کم ہماری جانیں

تو محفوظ رہتی ہیں۔

صرف کرفیو کا نفاذ امن عامہ کے مسائل کا حل نہیں حکومت انتظامیہ اور سیاست والوں کو مل بیٹھ کر اس کا کوئی ٹھوس حل نکالنا چاہیئے تاکہ اپنے شہر اور اپنے گھر میں لوگوں کے خود کو غیر محفوظ سمجھنے کے احساس کا خاتمہ ہو۔

آمنہ مظفری (لیڈی ڈاکٹر)۔۔۔۔ جب بھی علاقے میں ہنگامہ ہوتا ہے تو ذہنی طور پر کرفیو کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بار بار کرفیو لگنے سے اب ہم اپنی لمبی سے پروگرام اسے مدنظر رکھ کر بناتے ہیں۔ گھر میں ایسے سامان کا ذخیرہ رکھا جاتا ہے کرفیو کی صورت میں جس کے حصول میں پریشانی ہو سکتی ہے۔ کرفیو سے بہت مسائل پیدا ہو جاتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گھر میں نظر بند کر دیئے گئے ہوں۔ بیرونی دنیا سے رابطہ کا واحد ذریعہ ٹیلیفون رہ جاتا ہے جس سے پیشے کے حوالے سے بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ مریضوں کے ٹیلیفون آتے ہیں لیکن انہیں دیکھنے نہیں جا سکتے۔ مریض دیکھنے کا سارا نظام الاوقات گڑبڑ ہو جاتا ہے کسی تقریب میں نہیں جا سکتے ہر طرح کی سماجی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

کرفیو سے مسائل کے حل کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ بار بار کرفیو کے نفاذ سے لوگوں کے لیے اس کی اہمیت ختم ہو گئی ہے اب تو کرفیو کے باوجود ہنگامہ آرائی ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں تو اس وقت فسادات کے سیاسی حل کی اشد ضرورت ہے۔ قانون نافذ کرنے والے لوگوں کا رویہ عوام کے ساتھ سخت اور پریشان کن ہوتا ہے، کرفیو سے پریشان حال لوگوں کے ساتھ یہ نہایت تکبر سے پیش آتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن (بزنس مین)۔۔۔۔ ہر دفعہ جب کرفیو لگتا ہے تو اس دوران پیش آنے والی مشکلات یاد آنے لگتی ہیں۔ کرفیو سے نہ صرف ہم جیسے کاروباری آدمی بلکہ ملازمت پیشہ جھابڑی فروش، گھریلو خواتین، بچے، طالب علم، بوڑھے، بیمار سب متاثر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے معمولات زندگی منجمد ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جب گھروں میں بیٹھے رہیں گے تو آمدنی کاروبار ضرور متاثر ہوگا بعض اوقات گھر میں کھانے

پینے کی اشیاء کی کمی ہو جاتی ہے اور کرفیو اتنا شدید ہوتا ہے کہ باہر جھانکنے تک کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہمیں کرفیو کی اس حد تک عادت ہو گئی ہے کہ چند دن کرفیو کے بغیر گزاریں تو عجیب لگتا ہے۔

کرفیو امن عامہ کے مسئلے کا وقتی حل ہے بلکہ یہ حل بھی اب موثر نہیں رہا کیونکہ کرفیو کے دوران بھی ہنگامے جاری رہتے ہیں اس سے بہتر تھا کہ اگر انتظامیہ امن قائم کرنے میں ناکام رہی ہے تو فوج کو مستقل یہاں تعینات کر دیا جائے۔ یہ کرفیو سے زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ جہاں تک کرفیو نافذ کرنے والوں کا تعلق ہے اس کی شکایت کرنا بے جا ہے۔ کیونکہ پولیس رینجرز اور فوج کے سپاہیوں کو آئے روز کرفیو زدہ علاقے میں ڈیوٹی دینی پڑتی ہے نہ صرف ان کی ڈیوٹی مشقت طلب ہوتی ہے۔ بلکہ شرپسند افراد ان سے چھیڑ چھاڑ سے بھی گریز نہیں کرتے اس لیے یہ لوگ بھی سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہوئے نہایت سختی سے پیش آتے ہیں۔

فرحت سعیدہ (سکول ٹیچر)۔۔۔۔ کرفیو کے اچانک نفاذ سے بہت غصہ آتا ہے کیونکہ اس سے اسکول کی پڑھائی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، طالب علموں کا وقت ضائع ہوتا ہے، کورس مقررہ مدت میں مکمل نہیں کروایا جا سکتا، آئے روز ہنگاموں اور کرفیو سے ذہن منتشر ہو کر رہ گیا ہے، ہر وقت یہی سوچ رہتی ہے ہمارے شہر کا کیا بنے گا! یہ فسادات آخر ہمیں کہاں لے جائیں گے اب تو صورتحال یہ ہو گئی ہے کسی بھی وقت کسی جانب سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے اور دن رات انہی آوازوں کو سنتے اور لرزتے گزر جاتے ہیں اگر کرفیو لگ جائے تو کچھ دیر کے لیے ان حالات میں تبدیلی آتی ہے ورنہ پھر وہی معمول ہوتا ہے لیکن کرفیو ہنگاموں کا مستقل حل نہیں۔ اس ضمن میں مثبت سیاسی پیش رفت کی ضرورت ہے۔

قانون نافذ کرنے والے ادارے شہریوں سے تعاون بھی کرتے ہیں لیکن جہاں ضرورت ہو سختی سے بھی پیش آتے ہیں لوگوں کو سزا بھی دیتے ہیں میرے خیال میں موقع کی مناسبت سے ان کا یہ فعل درست ہوتا ہے۔

جتنی رقم تم مانگو میں دوں گا۔

کتنی نقدی ہو گی تمہارے گھر میں۔

پچاس ہزار روپیہ تو ہو گا۔

تو پھر منگا لو یہاں۔

میں خود جاتا ہوں اور جا کر لے آتا ہوں۔

نہیں تم نہیں جا سکتے۔ اپنے کسی بیٹے کو بھیجو وہ جا کر لے آئیگا۔

چودھری نے اپنے بیٹے اختر کی طرف اشارہ کیا اور وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

سلیم نے اسے روکا۔

ٹھہرو! میرا ایک آدمی بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم نے اگر کوئی شرارت کی یا کسی کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے ان سب آدمیوں کو چھلنی کر دوں گا۔ اور آتی دفعہ منشی امین کو بھی ساتھ لے کر آنا۔

اختر اور رشید گاؤں کی طرف چلے گئے۔ چودھری اور اس کے آدمی اسی طرح کھڑے تھے۔

سلیم دوبارہ نواب کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد رشید اور اختر لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ منشی امین بھی تھے۔

رشید نے روپیوں کی گٹھڑی لا کر سلیم کو تھما دی۔

پچاس ہزار روپیہ۔

سلیم نے رومال میں بندھے ہوئے نوٹ اٹھائے اور منشی امین کو تھما دیئے۔

منشی جی! یہ رقم اس چودھری نے غریبوں کا خون چوس چوس کر جمع کی ہے۔ اسے آج ہی مستحق لوگوں میں تقسیم کر دینا۔

منشی امین نے رقم لے لی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

سلیم پھر ان سے مخاطب ہوا۔

چودھری حاکم تم یہاں منشی امین کے پاس آ کر کھڑے ہو جاؤ۔

وہ تو پہلے ہی یہ چاہتا تھا۔ فوراً اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلیم نے نواب کی طرف اشارہ کیا۔ جواب میں نواب نے نگاہوں ہی نگاہوں میں رشید اور اعظم سے کچھ کہا اور پھر وہ چاروں اپنی رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ چودھری حاکم کے دونوں بیٹے اور سب محافظ زمین پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

چودھری پر موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مرنے والوں کی چیخ و پکار جب ختم ہوئی تو سلیم کی آواز پھر سنائی دی۔

منشی جی! آپ گھر چلے جائیں۔

رشید! تم دونوں اٹھا لو چودھری کو۔

حاکم نے اعتراض کیا۔

تم نے وعدہ کیا تھا۔ کہ رقم لے کر مجھے چھوڑ دو گے۔

امام بخش کی باتوں میں تجربے کی سچائی موجود ہے۔ لاہور ہی کی مثال ہر بحث اور ورزش پھر ختم ہو گئی۔ چھوٹے بڑے باغوں اور اکھاڑوں میں روحانی بالیدگی
آج لاہور کے قرب و جوار میں جتنی جدید آبادیاں دکھائی پڑتی ہیں ان کے زیادہ جسمانی توانائی حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد لاہور کے روایتی ناشتوں اور لسی کی
مکین قدیم لاہور کے باشندے ہی ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے! باری آتی تھی۔ آج بھی آپ کو اندرون لاہور ایسے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ آج بھی
آج صورتحال یہ ہے کہ لوگ دیہاتیوں سے شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں دہی سری پائے چنے اور حلوہ پوری کی دکانوں پر بہت رش دکھائی دے گا۔
ہیں اس کا جواز یہی پیش کیا جاتا ہے کہ دیہاتوں میں روزگار نہیں اور شہروں میں لیکن لاہور کی صبحوں کا وہ جوش و خروش اور دم دبہ اب کہاں؟
حاصل کرنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں اور ضروریات زندگی آج اتنی بڑھ گئی ہیں بابا امام بخش کہتے ہیں کہ اس دور میں نوجوان کے لیے کمزوری صحت طعنہ ہوا
دیہات میں رہ کر صرف کھیتی باڑی کے ذریعے گزارہ ممکن نہیں رہا۔ ہمارے ہاں کرتی تھی اب نوجوان خود کو کمزور ظاہر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں
بھی کہی جا سکتی ہے۔ کہ حکومت چونکہ اپنے ترقیاتی منصوبوں کو بڑے شہروں تک ہی جسم کو دبلا پتلا کرنے کے لیے فاقے کرتے ہیں اوّل تو خالص غذا کھانے کو ملتی ہی
محدود رکھتی ہے اور دیہاتی آبادی جو ملک کی ۸۰ فیصد ہے اس سے بہرہ ور نہیں اگر ملتی ہے تو لوگ کھاتے نہیں۔ نوجوان کھانے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اسے
ہو جاتی اس لیے بھی شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی کا رجحان عام ہے۔ بات اہم ہم کیسے کریں گے؟ کیونکہ ورزش وہ کرنا نہیں چاہتے۔ انسان نے محنت سے جی چرانا
سے شہروں کی طرف منتقلی کی ہوتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ اگر شروع کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ نوجوان خود کو سمارٹ رکھنے کے لیے فاقہ کشی کرتے ہیں۔
اب چھوٹے شہروں سے بڑے شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا ہے حالانکہ چھوٹے ہمارے دور میں سورج نکلنے کے بعد بستر پر موجود رہنا کمزوری سمجھا جاتا تھا
شہروں میں روزگار کے مواقع زیادہ ہونے میں ممکن ہے کہیں صورت حال اس کے برعکس اس پر طعنے ملا کرتے تھے اب ماڈرن زندگی نے اندرون شہر کے نوجوانوں کو بھی
برعکس رہی ہو لیکن اگر کوئی شخص جو گوجرانوالہ میں رہتا ہے اور لاہور منتقل ہو جائے دیر گئے تک بستر پر لیٹے رہنے کا عادی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندرون شہر
یا کوئی سکھر کا شہری حیدرآباد اور پھر کراچی منتقل ہونا چاہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو کا ناشتہ دوپہر تک لوگ کھاتے ہیں۔ اس دور میں صبح کا آغاز نوجوان نماز
ہی نہیں ہو سکتی کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ اور ورزش سے کرتے تھے اب سگریٹ سے کرتے ہیں بستر سے اٹھنے کے بعد چائے
اس کے ساتھ ہی پچھلے کچھ عرصے سے ایک نئی بات جو بڑے شہروں میں سگریٹ نوشی لازم سمجھی جانے لگی ہے۔ کبھی گھروں میں بزرگ حقہ پیا کرتے تھے۔
دیکھنے کو مل رہی ہے وہ یہ کہ لوگ پرانے محلوں سے نئی آبادیوں میں منتقل ہو رہے ہیں کسی کو سگریٹ پان کی لت پڑ گئی ہے یہ سگریٹ کی عادت ہے جس نے بہر
کیا ہمارے ثقافتی اور روایتی بندھن کمزور پڑنے لگے ہیں! یا پھر اللہ نے نئے کو جنم دیا اور آج آپ کو شکل دیکھنے پر ہر دوسرا نوجوان کمزور یا بیمار دکھائی دے
اور جدید زندگی کے تقاضوں نے لوگوں کو انداز بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ احترام جو ہماری تہذیب کا جزو لاینفک تھا ہم سے رخصت ہو رہا ہے۔ ملکی حالات
لاہور شہر جہاں کی صبحیں اور شامیں زندگی کی بھرپور رعنائیوں کا مظہر ہوا کرتی تھیں اگر اس نے تمیز اور اخلاق چھین لیا ہے۔ چھوٹے بڑوں کا احترام نہیں کرتے اور بڑے
ماحول تندرست سے بدلا بدلا دکھائی دیتا ہے۔ صبح کا آغاز اذان ہی سے ہوتا ہے دوسروں کو برا لگنا ناپسند نہیں کرتے، ہر آدمی دوسرے سے زیادہ عقل مند بننے کے
لوازم معدوم ہو گئے ہیں جس سے کسی شہر کا تہذیبی پہلو نکلتا تھا اب پہلوانی برا پڑا ہے، ایک دور تھا جب محلے کا ایک بزرگ سارے محلے کے بیٹے

قابل احترام ہوتا تھا اب ہمارے بچے بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مذاق اس لیے کہ وہ خود کو جدید تعلیم یافتہ اور بزرگوں سے بھی بڑھ کر عقل مند سمجھنے لگے ہیں۔ کوئی کسی کی بات سننے کو تیار نہیں۔ ہر شخص دوسرے کے عمل سے شاکی ہے اپنے آپ سے بھی مطمئن نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا تضاد ہم میں کیوں آ گیا؟ کیا اس کا سبب محض بدلتے ہوئے حالات اور جدید تقاضائے زندگی ہیں یا اس کا کچھ اور سبب بھی ہے۔ ہمارے رویوں میں اتنا بڑا انقلاب محض گردشِ وقت کی وجہ نہیں ہے۔ انسانی رویے میں تبدیلی کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں جن میں سرِ فہرست یقیناً انسان کا قناعت پسند نہ رہنا ہے۔ آج کا پاکستانی مسلمان کیا جدید تقاضوں میں ورثہ برقرار رکھ پائے گا؟ یہی ہے وہ سوال جس کا جواب ہم سب کو اس کے حوالے سے تلاش کرنا ہے۔

تحقیقی علاج یا فراڈ

مطبوعہ: ۷ نومبر ۱۹۸۹ء

خدا نہ کرے آپ بیمار ہوں لیکن بادی النظر میں ایسا ممکن نہیں۔ ہم جس فضا میں جن حالات میں، جس آب و ہوا میں اور جن اشیائے خورد و نوش کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں صحت مند رہنے کے مواقع کم اور بیمار ہونے کے زیادہ ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب خالص غذاؤں کے حوالے سے پاکستان خصوصاً پنجاب کو دنیا بھر میں ایک مقام حاصل تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں پنجاب کے علاقے کو دیسی گندم، دیسی گھی خالص دودھ اور دیگر خالص اشیائے خورد و نوش کے حوالے سے یاد کیا جاتا تھا۔ آج ایسا صرف سوچا ہی جا سکتا ہے۔

زرعی ادویات، کھادیں اور دیگر مختلف نوعیت کے سپرے کرنے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ فصل کا خالص پن برقرار رہ سکے۔ زیادہ فصل حاصل کرنے کی دھن میں انسان نے اپنی غذا کو زہر آلود کر لیا ہے۔ کبھی لوگ طاقت حاصل کرنے کے لیے جسمانی اور ذہنی آسودگی کے لیے گھی، دودھ اور دہی کا استعمال کرتے تھے اب ڈاکٹر صاحبان ان سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہیں اور مکھن دودھ دہی کے ساتھ ایسی ایسی بیماریوں کا سلسلہ جوڑا جاتا ہے کہ لوگ ان سے خوف کھانے لگے ہیں۔ جدید دور کے انسان نے جسمانی کسرت سے کنارہ کشی اختیار کر کے غذا میں کمی کے ذریعے صحت برقرار رکھنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں خاص طور سے انسانی استعمال کی اشیاء میں ملاوٹ

ایک عام سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ آپ جو مسالہ
گھی آٹا، دودھ، شہد، تکمن استعمال کر رہے ہیں وہ واقعی وہی کچھ ہے جو آپ کو نظر آ رہا
غذا میں ملاوٹ نے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے آدمی کو مختلف عوارض کا شکار
ہے۔ ذہنی تفکرات اس سے سوا ہیں اور سب سے بڑھ کر ماحول کی خود پیدا کردہ
نے ایسی ایسی پیچیدہ بیماریوں کو جنم دیا ہے کہ جن کا ذکر اس سے پہلے کسی نے سنا کم
اخبارات کے ذریعے لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ شہر میں کوئی وائرس پھیل گیا
اور عوام اس کا شکار ہو جاتے ہیں کبھی وبائی امراض کا وائرس، کبھی آشوب چشم کا وائرس
جس بیماری کی ڈاکٹر صاحبان کو سمجھ نہ آئے میڈیکل سائنس جس کی کوئی توجیہہ پیش نہ
سکے اسے کسی نہ کسی وائرس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔
کینسر ناقابل علاج عارضہ ہے پھر یورپ سے ایڈز کی وبا سننے کو ملی۔ اب شاید
کوئی اور ایسی بیماری کے جراثیم دریافت ہو جائیں جو انسانی فہم و ادراک سے بالا
عموماً ہمارے ہاں یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں علاقے میں ایک پراسرار بیماری کے
اتنے لوگ اب تک ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس بیماری کا کوئی نام نہیں ہوتا اس کی سمجھ
کسی کو کم ہی ہوتی ہے بس یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ایک وائرس ہے آخر یہ وائرس
ہے کیا بلا؟۔
ہمارے ہاں آخر بیماری کی تشخیص مسئلہ کیوں بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک بات
اگر احتیاط نہ کرے اور مرض تھوڑا پرانا ہو جائے تو مریض کے لیے وبال جان کیوں بن
ہے۔ اس سوال کا جواب جاننے سے پہلے آپ تک کچھ مریضوں کے تجربات پہنچا رہا
بشیر احمد کی عمر ۵۲ سال ہے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کو پیٹ
دائیں طرف درد کا احساس ہوا۔ بشیر احمد نے ہمارے ہاں مروجہ طریق علاج کے
پہلے تو خود درد کی ایک گولی کھائی جب افاقہ نہ ہوا تو اپنے ساتھی کے مشورے سے
گولیاں کھالیں۔ لیکن درد میں افاقہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔
اس کے بعد بشیر احمد نے مقامی ڈاکٹر سے رجوع کیا جس نے اسے بتایا

پیٹ کی معمولی خرابی ہے۔ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ اس نے بشیر احمد کو دوائیاں دے کر گھر بھیج دیا معمولی سا افاقہ ہوا لیکن پھر درد کا وہی سلسلہ شروع ہو گیا جس کے بعد بشیر نے ایک حکیم سے رجوع کیا حکیم صاحب کے بعد ہومیو پیتھک ڈاکٹر صاحب کی باری آئی لیکن مرض جوں کا توں برقرار رہا۔

بشیر احمد کو بالآخر کسی نے مشورہ دیا کہ فلاں ماہر امراض معدہ سے رجوع کرو۔ بشیر سپیشلسٹ صاحب کے پاس پہنچا تو معاملہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، والا ہو گیا۔ بیماری سے تنگ آیا بشیر احمد جن دنوں بڑی سنجیدگی سے خودکشی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ان دنوں کسی خدا ترس بندے نے اس کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ فلاں علاقے میں ایک ڈاکٹر صاحب سے رجوع کرے۔ زندگی سے مایوس بشیر احمد وہاں پہنچا اور رپورٹوں کا پلندہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کاغذوں اور نلکوں کے ڈھیر کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا کر اس کی زبانی تمام معاملات سنے اور معمولی دواؤں سے اس کا علاج شروع کر دیا۔ بشیر احمد کو اب خاصا افاقہ ہے اس نے کام پر جانا شروع کر دیا ہے اور اس کی صحت بھی نارمل ہونے لگی ہے۔

اشتیاق حسین کو برص کی بیماری تھی۔ جو پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک ماہر امراض سے مشورہ کیا جنہوں نے اشتیاق کو ایک خاص دوا کھانے کی ہدایت کی۔ اشتیاق نے سپیشلسٹ کی ہدایات کے مطابق دوائی کا استعمال شروع کیا۔ اس کے مرض برص کو قدرے افاقہ ہو گیا لیکن دوائی استعمال کرنے کے ڈیڑھ ماہ بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کو دھچکے لگتے ہوں۔ یہ کیفیت خاص طور سے کھانا کھانے کے بعد پیش آتی۔

اشتیاق نے سپیشلسٹ پروفیسر صاحب کو متعلقہ تکلیف سے آگاہ کیا تو انہوں نے مختلف ٹسٹوں کی ایک لسٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ ٹسٹ رپورٹیں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اشتیاق کو کھانے کے بعد ایک گولی استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ اس دوران اسے افاقہ تو کیا ہوتا اس کا وزن بھی کم پڑنے لگا۔

صورت حال بگڑتی دیکھ کر اشتیاق نے ایک اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا۔

جنہوں نے اسے بتایا کہ اسے غلط گولی استعمال کروائی جا رہی ہے۔ یہ گولی تو دل کے مریض استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت حال نے اشتیاق کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر ای سی جی کروائی تو رپورٹ نارمل تھی۔ ایک لیبارٹری کے بجائے اشتیاق نے الگ الگ لیبارٹریوں سے مختلف اوقات میں آٹھ مرتبہ ای سی جی کروائی لیکن رپورٹ ہر دفعہ نارمل ہی رہی۔

اس کے بعد اشتیاق کا رابطہ مختلف ڈاکٹروں، حکیموں، ہومیوپیتھک ڈاکٹروں سے رہا ہے۔ وہ ۲ سال سے اپنا علاج کروا رہا ہے لیکن اس کے مرض کو افاقہ نہیں ہوا۔ اس دوران اس کا ۴۴ پاؤنڈ وزن کم ہو چکا ہے اور معدے یا دل کی تکلیف جوں کی توں برقرار ہے وہ جس ماہر امراض کے پاس جاتا ہے وہ اپنی فیس وصول کرنے کے بعد ای سی جی معدے کے ایکسرے، خون کے ٹسٹ، پیشاب کا ٹسٹ، جگر، گردے معدے کا الٹراساؤنڈ کروانے کو کہتا ہے اور اشتیاق کا ہر ٹسٹ نارمل آتا ہے۔ جب وہ ایک ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ یہ ٹسٹ میں پہلے بھی کروا چکا ہوں اور ان کے نتائج نارمل ہی ملتے رہے تو ڈاکٹر صاحب اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں رپورٹوں کو چھوڑو اور فلاں لیبارٹری سے ٹسٹ کرواؤ۔ تین سال کی تگ و دو کے بعد اشتیاق کو صرف ایک بات کی سمجھ آئی ہے کہ اسے دل کا نہیں معدے کا کوئی عارضہ لاحق ہے اور اب وہ امراض معدے کے ماہرین سے دوبارہ رجوع کر رہا ہے۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں آپ کو ایسی ہزاروں مثالیں اپنے معاشرے میں مل جائیں گی۔ بیماری کی تشخیص نہ ہونے پر متعلقہ امراض کے ماہرین سے جب مریض رجوع کرتا ہے تو وہاں صرف دو سو روپے پروفیسر صاحب کی فیس ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ٹسٹوں کی ایک فہرست بھی دے دی جاتی ہے اور یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ ٹسٹ فلاں جگہ سے کروائیں جس جگہ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس کے نرخ عام لیبارٹریوں سے دوگنا نہیں تو ایک گنا زیادہ ضرور ہوتے ہیں۔

مریضوں کی طرف سے یہ شکایت عام ہے کہ جن خصوصی لیبارٹریوں سے ٹسٹ

رپورٹیں حاصل کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ وہاں بھی وہی مشینیں نصب ہیں جو دیگر لیبارٹریز میں ہوتی ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں متعلقہ ڈاکٹر صاحب کی کمیشن طے ہوتی ہے اس الزام میں کس حد تک سچائی ہے اور کس حد تک جھوٹ اس میں شامل ہے۔ اس پر بحث کرنا فضول ہے لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ وہ لوگ جو بڑے شہروں کی مارکیٹوں میں لیبارٹریز کا کاروبار کرتے ہیں ان کے اور شہر کے جدید اور ماڈرن علاقوں میں موجود لیبارٹریز کے رزلٹ میں سے کسی کو بھی اس لحاظ سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں کا رزلٹ فلاں سے بہتر ہے کیونکہ حکومت ہر کسی کو لیبارٹری قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی نہ ہی کوئی عام آدمی ٹسٹ نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر یہ بات صحیح تسلیم کر لی جائے کہ فلاں لیبارٹری کے نتائج فلاں کے مقابلے میں ناقص ہیں تو یہ قابل گرفت جرم ہونا چاہیے اگر کوئی لیبارٹری کسی ٹسٹ کی غلط رپورٹ دیتی ہے تو یہ انسانی جان سے کھیلنے والی بات نہیں تو کیا ہے؟ کیونکہ ڈاکٹر نے اسی حاصل کردہ رپورٹ کی بنیاد پر مریض کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ اگر رپورٹ ہی قابل اعتبار نہیں تو وہ لیبارٹری کیوں کر قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔

بات لیبارٹریوں کی چلی ہے تو صرف لاہور شہر میں ہمارے ذاتی سروے کے مطابق ۷۰ تا ۸۰ فیصد ایسی لیبارٹریاں ہیں جنہوں نے بڑے بڑے پروفیسر صاحبان کے صرف نام ہی لکھے ہوئے ہیں جبکہ یہاں کوئی پروفیسر کبھی نہیں بیٹھتا افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ایسی لیبارٹریوں میں خون اور پیشاب کے بڑے حساس ٹسٹ بھی ہوتے ہیں ایسے ٹسٹ جن کی رپورٹ ملنے پر بہت خطرناک بیماریوں سے متعلق نتائج بھی اخذ کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹسٹ بھی عام ٹیکنیشن کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی بھی لیبارٹری میں اگر کوئی پروفیسر صاحب بیٹھیں تو وہ عموماً دو گھنٹے ہی تشریف فرما ہوں گے اور معروف لیبارٹریوں میں فرض کیجئے ایک دن میں اگر خون کے دو سو ٹسٹ بھی آئیں اور ایک مارفالوجی پر ۵ منٹ ہی صرف ہوں تو بھی دو سو رپورٹیں تیار کرنے میں ایک ہزار منٹ صرف

ہوتے ہیں۔ اب آپ ہزار منٹ کو گھنٹوں میں تبدیل کر لیجیے۔ اور اندازہ لگائیے کس کے لیے کتنا وقت درکار ہے۔ اور کیا کوئی ایک ایسا پروفیسر اتنا وقت نکال سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ہمارے ہاں سب سے زیادہ بیماریاں پیٹ کی ہوتی ہیں اگر پیٹ کی بیماری پیچیدہ ہو جائے تو عموماً اس مرض کے ماہرین نے یہ اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کہیں مریض کے معدے یا آنت میں السر تو نہیں۔ یا پھر معدے پر سوجن تو نہیں آ گئی۔ اس ضمن میں مریض کو عموماً الٹرا ساؤنڈ سٹول اور یورین ٹسٹ۔ گیسٹروسکوپی حتیٰ کہ کلونوسکوپی اور بائی آپسی تک کروانا ہوتی ہے گیسٹروسکوپی پر پرائیویٹ علاج میں عموماً ۲ تا ڈھائی ہزار روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ اور اس پر ۳ تا ۵ منٹ لگتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ گیسٹروسکوپی کی ایک مشین ایک تا ڈیڑھ لاکھ روپے میں آ جاتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ مریض بہت امیر ہی ہو بسا اوقات بلکہ اکثر اوقات پیچیدہ بیماریاں غریبوں کو بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اگر یہ تمام ٹسٹ ہوں تو مریض کا خرچ پہلے مرحلے میں تین سے چار ہزار روپے کے درمیان اٹھتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ماہر امراض پروفیسر کے پاس جانا اور عام ڈاکٹر کے پاس جانے میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں مشورہ فیس دو سو روپے ادا کرنی پڑتی ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ فرض کیجیے خدانخواستہ آپ کو عارضہ دل لاحق ہے یا اس بیماری کا شک ہے تو دو سو یا ڈیڑھ سو روپے فیس دینے کے علاوہ آپ کو ای سی جی، بلڈ ٹسٹ، چھاتی کے ایکسرے، ایس جی او ٹی، ایس جی پی ٹی تک کروانے ہوتے ہیں۔ جن پر عموماً ایک تا ڈیڑھ ہزار خرچ اٹھتا ہے۔ اس طرح گردے کی بیماری کے شک میں الٹرا ساؤنڈ، خون کے ٹسٹ، پیشاب ٹسٹ، سادہ ایکسرے اور آئی وی پی پر ابتدائی اخراجات ڈیڑھ ہزار روپے کے قریب اٹھتے ہیں۔

اعصابی امراض لاحق ہوں تو سی ٹی سکین، سی ایس ایف وغیرہ پر جا کر

پانچ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں گائناکالوجسٹ آپ کو پریگنینسی ٹسٹ، الٹراساؤنڈ، بلڈ ٹسٹ، ایچ بی وغیرہ لکھتے ہیں جن پر پانچ تا چھ سو روپے اور ای این ٹی میں آپ کو ڈی این ایس، ٹی ایل سی، ڈی ایل سی اور کلچر وغیرہ پر تین تا چار سو روپے ابتدائی خرچ کرنا ہوتے ہیں۔

کیا ان ٹسٹوں کے بغیر مرض کی تشخیص ممکن نہیں؟

کیا مریض خواہ اس کی بیماری کسی بھی سٹیج پر ہو اس کو ٹسٹ کروانا لازم ہیں؟

ان سوالات کے جوابات تو ماہرین امراض ہی دے سکیں گے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٹسٹوں کے نام پر ہونے والا بزنس کس حد تک صحیح یا غلط ہے ترقی یافتہ ممالک میں کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو ٹسٹ لکھنے سے پہلے متعدد مرتبہ سوچتا ہے کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ ملکی قوانین کے مطابق کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کاش ہم بھی کوئی ایسا ضابطہ اخلاق ترتیب دے سکیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہو جائیں

سگر کے جنا تم ۔

ہاں !

شفیع کے چہرے پر نفرت پھیل گئی ۔

پھر تو ہم دونوں میں سے ایک ہی کو زندہ رہنا ہو گا تم چودہ
حاکم اور اس کے بیٹوں کے قاتل ہو اور میں تمہیں کسی حالت میں بھی زن
نہیں چھوڑ سکتا ۔

سلیم کے مزاج میں بھی غصہ آ گیا تھا ۔

میں بھی یہی سوچ رہا تھا ۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ہی زن
رہنا ہے ۔ تم اس کھوجی کے قاتل ہو جس نے ہمارے گم شدہ بیلوں ک
کھوج لگایا تھا اور تم نے ہمارے بیل بھی چرائے تھے اور میرے باپ
کے منتیں کرنے کے باوجود واپس نہ کیے تھے ۔ میں بھی تمہیں زن
نہیں چھوڑ سکتا ۔

شفیع سنبھل گیا ۔

تو پھر تیار ہو جاؤ موت کا مقابلہ کرنے کے لیے ۔

سلیم بھی مستعد ہو گیا ۔

یہ فیصلہ تو تقدیر کرے گی کہ موت کا سامنا کون کرتا ہے دیکھ
تمہاری آنکھوں میں مجھے تمہاری ہی موت نظر آ رہی ہے میری آنک
میں بھی جھانکو، ان میں بھی تمہاری ہی موت کے سائے ہوں گے ۔

شفیع نے ہتھکڑی کی زنجیر سمیٹ کر سلیم کو مارنا چاہی ۔

ابھی پتہ چل جاتا ہے کہ کون موت کے منہ میں جاتا ہے ۔

سلیم جست مار کر آگے بڑھا اور اسے زنجیر سمیت اپنے
بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔

سؤر کی اولاد تمہارا کوئی حربہ بھی میں کامیاب نہ ہونے دونگا ۔

اتنے میں جنگل کے اندر نواب کی آواز گونجی ۔ وہ زور زور
سے پکار رہا تھا ۔

سلیم ! سلیم ! کہاں ہو تم ؟

سلیم شفیع کو جکڑے ہی جکڑے زور سے چلّایا ۔

نواب !

شفیع زنکر مند ہو گیا تھا ۔ شاید وہ نواب کے پہنچنے سے پہلے
ہی سلیم سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا ۔ اس لیے اپنے بدن کو ایک زور
کا جھٹکا دے کر اس نے سلیم کی گردن پر ہتھکڑی والے ہاتھ کا
ایک گھونسہ دے مارا ۔

سلیم زمین پر گر گیا

شفیع نے جلدی جلدی ہتھکڑی کی زنجیر سمیٹی اور اسے لہراتے ہوئے
سلیم کو دے ماری ۔

سلیم تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا اور زنجیر کا ایک سرا پکڑتے
ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پہلی بار غصے میں خونخوار بھیڑیے کی مانند غرایا
اب دیکھتا ہوں کسے موت پکار رہی ہے ۔

(۲۳)

شام گھمبیر تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ سلیم اور نواب تہ خانے میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف والی دیوار میں ایک کیل سے لٹکتی ہوئی ایک بتی جل رہی تھی۔

ایک کونے میں انسپکٹر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر وہی نواب کی چادر بندھی ہوئی تھی۔ رشید اور اعظم دروازے کے دائیں بائیں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سلیم اور نواب کے اندر داخل ہوتے ہی رشید اور اعظم کھڑے ہوگئے۔ سلیم نے انہیں ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ باہر

نکل گئے۔

نواب نے آگے بڑھ کر پہلے انسپکٹر کے ہاتھ کھولے پھر اس کی آنکھوں سے چادر بھی ہٹا دی۔ انسپکٹر نے آنکھیں ملتے ہوئے گھبراہٹ میں پوچھا۔

کون ہو تم؛

نواب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

جی میں ہوں آپ کا تابعدار نواب۔

انسپکٹر گھبرا گیا۔

اور تم!

میں اکیلا نہیں، میرا دوسرا ساتھی بھی ہے جی۔

کون؛

سلیم! جسے آپ کے ساتھی گرفتار کر کے لے گئے تھے۔

انسپکٹر اور پریشان ہوگیا۔

یہ کیسے آگیا۔

میرا نام نواب ہے انسپکٹر! میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ جس روز میں ایسے حالات سے ہار گیا وہ میرا زندگی کا آخری دن ہوگا۔

ایک روز تمہیں پولیس کے سامنے ضرور ہار ماننا ہوگی۔

اب سلیم نے جواب دیا۔

دی جاتی ہے جب وہ پولیس کی مٹھی گرم کر سکیں۔

ایک آدمی کی ملاقات پر اوسطاً چار تا پانچ سو روپے خرچ ہوتے

یہ بات بہت عجیب لگے لیکن ایسا ہے عموماً ایک آدمی کی ملاقات کے لیے چار
اور عورتیں آتی ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی چیز حوالاتی کے لیے لے کر
اس گارڈ کے لیے بھی جو اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ فی کس اگر سو روپیہ بھی خرچ ہو
چار پانچ پہنچتی ہے جو ایک "دیہاڑی" ان کی مزدوری کی ٹوٹتی ہے
خرچ میں شامل ہے۔

مقدمات کی طوالت اور عدالتی طریق کار اتنا لمبا اور تھکا دینے والا ہے
ملنے تک ملزم اور اس کے لواحقین کی کمر بہت ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔ آوارہ گرد
آور ادویات یا سگریٹ کا استعمال معمولی لڑائی جھگڑا، جیب تراشی اور عام نوعیت
چوریوں کے مقدمات میں ملوث ملزموں کو اپنی قسمت کے فیصلے کیلئے لمبا انتظار
اور چار چار سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ ان مقدمات میں شاید اتنی
سزا بھی نہیں ہے۔

سید سجاد حیدر شاہ کو ہیروئن نوشی کے جرم میں آج سے ۱۱ ماہ پہلے گرفتار
گیا۔ آج تک اس کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اچھے وکیل کی فیس دو
ہزار روپے سے کم نہیں ہے اور وہ یہ پانچ چھ ہزار روپیہ کہاں سے لائے؟
محض ایک اچھا وکیل نہ کرنے کے سبب وہ آج تک حوالاتی ہے۔ سجاد حیدر
گرفتار کیا گیا تو اس کی شادی کو ۲۸ دن گزرے تھے اس کا کہنا ہے کہ اس کی گر
سے اس کے والد کی وفات ہو چکی ہے۔ سجاد حیدر نے اپنی پیٹھ پر تشدد کے
دکھاتے ہوئے کہا کہ اسے جیل میں محض اس لئے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہ
احکامات کو تسلیم نہیں کرتا۔

ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ سجاد حیدر شاہ کی بات کو
ثابت کر سکیں۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو لیکن جیل سے تاریخ پیشی

آنے والے ملزموں نے ... کی شکایتیں کی ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ بخشی خانے
سے جہاں پولیس تاریخ پیشی پر آنے والے مجرموں کو بند کرتی ہے: اس عارضی قید خانے
سے ملزم کو تاریخ بھگت جانے کے بعد جیل لے جایا جاتا ہے۔ جہاں وہ ڈیوڑھی پہنچتا
ہے جس کے بعد ٹینکی پر ہیڈ وارڈن اور پھر مبیٹ سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لیا
جاتا ہے کہ جو ملزم تاریخ بھگت کر آرہا ہے ضرور اس کے لواحقین اس کے لیے بہت
کچھ لے کر آئے تھے جس میں سے ان لوگوں کا حصہ بھی نکالا جائے۔

یہی حال جیل میں ہونے والی ملاقات کا ہوتا ہے جب قیدی یا حوالاتی کی ملاقات
جہاں کہ بھی ڈیوڑھی سے بیرک تک پہنچنے کیلئے راستے میں جا بجا نذرانہ دینا پڑتا ہے اور
اس کا بوجھ لواحقین پر پڑتا ہے۔

ریمانڈ مکمل ہونے سے جیل جانے تک کا فاصلہ بڑا مختصر لیکن بہت اذیت ناک اور
تڑپا دینے والا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس مرحلے پر ملزم اور اس کے لواحقین کا واسطہ براہ راست
پولیس اور عدالت سے ہوتا ہے۔

اس کے بعد جب ملزم جوڈیشل ریمانڈ پر چلا جائے تو پولیس درمیان سے نکل
جاتی ہے پھر عدالتوں کے چکر اور قانونی فیس اور جیل کے اخراجات لواحقین اور ملزم کی جان
نکال دیتے ہیں۔

انصاف کے حصول کے لیے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے والوں کو ہر قدم
پر بے انصافی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ضرورت کے وقت اسٹامپ تک نہیں
ملتا۔ اس وقت پنجاب میں اسٹامپ کی صورتحال بڑی تکلیف دہ ہے، جس کی وجہ سے خواہ مخواہ
بہت سے سائل لوگوں کو گھیرے رکھتے ہیں۔

لاہور ڈسٹرکٹ کورٹ میں گزشتہ ۱۸ سال سے اسٹامپ فروشی کے کاروبار
سے وابستہ محمد عظیم اس صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسٹامپ دراصل سکیورٹی
پرنٹنگ پریس کراچی میں چھپتے ہیں۔ جہاں کرنسی نوٹ چھپتے ہیں سکیورٹی پریس پر مرکزی حکومت
کا کنٹرول ہے۔ جو تمام صوبوں کی اسٹامپ سپلائی کرتی ہے۔ یہ سپلائی بنیادی طور پر تو صوبوں

کی ڈیمانڈ کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن عملاً حکومت کی مرضی سے ہوتی ہے مثلاً
اگر چار روپے والا اسٹامپ درکار ہے تو یہ حکومت کی مرضی ہے کہ وہ چار
روپے کے بجائے چار سو روپے والے اسٹامپ جاری کر دے۔ اس وقت
کی صورتحال اتنی سنگین ہے کہ چار سو روپے سے زائد کا اسٹامپ خزانے میں

اگر آپ کو کاروباری لین دین یا دیگر عدالتی معاملات کے لیے چار سو
سے زائد مالیت کا اسٹامپ درکار ہے تو وہ نہیں مل سکتا۔ ہمیں تو اب یہ محسوس
لگا ہے جیسے مرکز اور صوبے کی چپقلش ہی اس قلت کا باعث ہے۔ آپ کو
تازہ مثال دیتا ہوں کہ حال ہی میں مرکزی حکومت نے پنجاب میں ایک روپے
اسٹامپ پیپر بھیج دیئے ہیں۔ جن کی کسی معاملے میں بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن مشینوں پر یہ اسٹامپ چھپے ہیں ان پر زیادہ
کے اسٹامپ بھی چھپ سکتے تھے آخر یہ بلاوجہ پیسہ ضائع کرنے کی ضرورت کیا تھی
پرنٹنگ کرنی بھی تھی تو ایک سو روپے والا کیوں چھاپا میرے خیال سے تو اس ایک
والے اسٹامپ پیپر پر لاگت بھی ایک روپے سے زیادہ کی آئی ہو گی۔

اب یہاں کیا ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت نے بڑے شہروں میں اسٹامپ
ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف اضلاع سے اسٹامپ اکٹھے کرنے
دیئے ہیں مثلاً لاہور میں اسٹامپ کی قلت ہے تو خزانے والوں نے شیخوپورہ
گوجرانوالہ وغیرہ سے اسٹامپ یہاں جمع کرنے شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا
کی ضرورت تو پوری ہی نہیں ہو سکے گی اور وہاں خواہ مخواہ قلت پیدا ہو جائے
وہاں کے لوگوں کو بھی پھر انہی مسائل کا سامنا کرنا ہو گا۔

ہمارے عدالتی نظام کی مبینہ سست روی کا الزام عدالت کو نہیں
آج بھی پاکستان کے بڑے شہروں میں ڈسٹرکٹ کورٹ سطح پر کسی بھی
کو روزانہ اوسط پچاس تا ستر پیشیاں بھگتانی ہوتی ہیں جو کیس متعلقہ تھانے
کے ہاں لگتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ مقدمات تو وہ ہیں جن کے پولیس نے چالان

ہوتے اور ظاہر ہے کہ ایسے ملزموں کو صرف اگلی تاریخ دی جاتی ہے۔ جن کے چالان
ہوں ان کے گواہوں کو پیش کرنے کا مرحلہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہمارے
پولیس چونکہ عام آدمی کے لیے ہوا بنی ہوئی ہے اس لیے کوئی شریف آدمی گواہی دینے
عدالت میں نہیں آتا۔ گواہوں کے عدالت تک نہ پہنچنے کی وجوہات خواہ کچھ بھی
ہوں۔ لیکن ملزم کے لیے یہ وبال جان بن جاتی ہیں۔ گواہیاں مکمل ہونے کا عرصہ
طویل ہو جاتا ہے کہ ملزم اور اس کے لواحقین چیخ اٹھتے ہیں۔ بہت کم گواہ ایسے ہیں کہ جو
عدالت کے صرف ایک مرتبہ طلب کرنے پر آ جائیں عموماً گواہ تب ہی پیش ہوتا ہے جب
ان کے وارنٹ عدالت کی طرف سے جاری ہو جائیں۔

انصاف کے نام پر انصاف کے حصول کی خاطر ہونے والی ایسی کوتاہیوں کا خاتمہ
ناگزیر ہو گیا ہے۔ آوارہ گردی جیسے جرم کے مرتکب کو سالوں یا مہینوں قید رکھنا قرین انصاف
اس ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت "مصالحتی عدالتوں" کے کردار کو موثر بنائے اور
نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ نچلی سطح پر ہی ہو جایا کرے۔ اس طرح ممکن ہے عدالتوں
مقدمات کا بوجھ کم پڑنے اور طویل اور تھکا دینے والے اعصاب شکن انتظار سے پہلے
انصاف میسر آ جائے۔

تحریکِ آزادیٔ کشمیر

توڑ اُس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا۔!

(علامہ اقبالؒ)

قائد اعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شاہ رگ قرار دیا تھا اور بسترِ مرگ پر جب علم ہوا کہ دشمن نے اس وادیٔ جنت نظیر میں اپنی فوجیں داخل کر دی ہیں تو قائد اعظمؒ نے حکم دیا تھا کہ دشمن کو بموں اور گولیوں کی زبان میں جواب دو۔"

افسوس قائد اعظمؒ کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مقصد کے لیے پیدا فرمایا تھا اُس کی تکمیل کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس واپس بلا لیا اور قائد اعظمؒ کے جانشین کھوٹے سکے ثابت ہوئے جنہوں نے کشمیر کو دشمن کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلانے کے لیے کسی ٹھوس اقدام کے بجائے صرف زبانی کلامی بیانات تک محدود کر کے رکھا۔

کشمیر کا مسئلہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی دانست میں دفن کر دیا تھا۔ خصوصاً شملہ معاہدے کے بعد سے اس کی کاغذی اہمیت بھی دم توڑنے لگی تھی لیکن اچانک ہی ۱۹۸۹ء میں کشمیری مجاہدین نے بھارتی انتخابات کا بائیکاٹ کر کے تحریکِ آزادی کا نئے جوش ولولے عزم اور تازہ خون کے ساتھ آغاز کیا جس کے بعد سے آج سری نگر کی گلیاں بازار شہیدوں کے خون میں نہا رہے ہیں۔

میر واعظ مولوی محمد فاروق کی شہادت کے بعد سے تو گویا تحریک نے پھر سے زندگی پائی ہے اور حریت پسند مجاہدینِ آزادی بڑھ چڑھ کر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں اور تاریخ شاہد ہے جب کسی قوم نے مرنے کی راہ اپنائی تو آزادی اُس کا نصیب بن گئی۔

مقبوضہ کشمیر میں جدوجہدِ آزادی اور موجودہ صورتِ حال پر کچھ مضامین

بیٹی ہے - وہ بدمعاش آج سے دو ماہ قبل سب لوگوں کے سامنے میری
لڑکی کو میرے گھر سے دن دہاڑے اُٹھا کر لے گیا - میں بہت روئی
پیٹی، پر میری کسی نے نہ سُنی -

علاقے کے سارے بڑے بڑے چودھریوں اور معتبروں کے میں نے پاؤں تک پکڑے پر کسی نے مجھے میری بیٹی واپس نہ دلائی -

اس ظالم نے میری پھول سی معصوم بچی کو پورا ایک ماہ اپنے پاس رکھا اور اس کی عزت لوٹتا رہا اور پھر اسے خود بخود میرے گھر چھوڑ گیا - کسی نے میری مدد نہیں کی کہ اس سے باز پرس ہی کرے کہ ہم پر یہ ظلم کیوں کیا - کوئی میرا بیٹا ہوتا تو اس سے ضرور اپنی بہن کا بدلہ لے لیتا -

اب میں تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم دونوں ہمارا انصاف کرو -

بڑھیا نے اپنے سر سے دوپٹہ اُتار کر سلیم کے قدموں پر رکھ دیا -

انکار نہ کرنا بیٹے ! میری طرح تمہاری بھی کوئی بوڑھی ماں ہوگی - میرے دوپٹے کو اس کا دوپٹہ سمجھ کر ہی اس کی شرم رکھ لو -

نواب رو پڑا تھا -

سلیم نے دوپٹہ اُٹھا کر زینب کے سر پر رکھ دیا -

تمہارے اس دوپٹے کی قسم ماں ! میں اس پاپی کو زندہ نہ چھوڑوں گا -

نواب نے بھی غصے میں اُگلتی ہوئی آواز میں کہا -

ہم ——— ہم اس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں ڈال دیں تو نواب اور سلیم نہ کہنا گتے - ہم اسے بتائیں گے کہ دوسر دل

آتی سُنتی نہیں -

اس وقت وہ کہاں مل سکتا ہے ماں -

سلیم نے دریافت کیا -

شہر سے باہر ایک میلہ لگتا ہے شاہ جہانگیر، وہ آج اس میلے میں گیا ہے -

ہم تو اُسے جانتے نہیں پہچانیں گے کیسے ؟

اس کی لمبی لمبی مونچھیں ہیں، رنگ سانولا، ناک پتلی اور لمبی، پیشانی کے بائیں جانب زخم کا ایک نشان، سر پر سفید پگڑی - نیم گلابی رنگ کی ریشمی قمیص اور اسی کپڑے کی چادر باندھے ہوئے ہے -

بس بس ماں ! اب ہم اسے پہچان لیں گے - تم اپنے گھر جاؤ ہم اسے لے کر تمہارے گھر ہی پہنچ جائیں گے اور ہاں تمہارا گھر کس طرف ہے -

مسجد کے عین سامنے تین مکان ہیں - ان میں سے درمیان والا میرا ہے -

دونوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں -

اچھا تم جاؤ -

دوپہر کے قریب وہ میلے میں داخل ہوئے - لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا وہاں - ان گنت دکانیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں موت کے کنوئیں والے - ہوائی جہازوں کے پنگھوڑوں والے، چڑیا گھر

ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ منظور نے ہنستے ہوئے کہا۔

دیکھو! کتنا بڑا جوان ہے اور یہ پتھر نہیں اُٹھا سکا۔

اب نواب بھی منظور کے سامنے آ کھڑا ہوا اور غصہ ملی جلی آواز میں کہا۔ پتھر صرف زور سے نہیں اُٹھتا دوست! یہ ڈھنگ سے اُٹھایا جاتا ہے۔ لو میں تمہیں اُٹھا کر دکھاتا ہوں۔ تم نے دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا ہے اور میں تمہیں ایک ہاتھ سے ہی اُٹھا کر دکھاتا ہوں۔ جہاں تک طاقت کا تعلق ہے تو وہ مجھ سے بھی زور آور ہے۔

نواب نے بسم اللہ کر کے پتھر کو ہاتھ ڈالا۔ پھر اس نے زور کا نعرہ مارا۔ حیدرؓ!

اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر ایک ہاتھ سے اُٹھا کر اپنے سر کے اوپر لہرا دیا۔ اردگرد کھڑے سارے لوگ تالیاں بجانے لگے تھے۔

نواب نے پتھر زمین پر پھینک دیا۔

بس تسلی ہو گئی تمہاری؟

کون ہو تم؟ منظور نے غصے میں پوچھا۔

نواب پیچھے ہٹ گیا۔

اس بات کو چھوڑو تم۔

جونہی نواب پیچھے ہٹا۔ اس کی جگہ سلیم آ کھڑا ہوا۔ دونوں اپنی سوچی سمجھی سکیم کے تحت کام کر رہے تھے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں ہر بات سمجھائی جا رہی تھی۔ نواب جا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا سلیم

نے منظور کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

اسے کیا کہتے ہو مجھ سے بات کرو مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ ذرا میرے ساتھ علیحدگی میں آؤ۔ تمہارا بڑا بھائی برکت میرا دوست تھا۔ اس کے قتل کے سلسلہ میں تم سے میں چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

منظور سوچنے لگ گیا۔

سلیم اس کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کے ہجوم سے باہر لے آیا۔

سوچنے کیا لگ گئے ہو، میری بات تو سنو۔

منظور نے جب اپنے بھائی کے دونوں گھوڑے دیکھے تو وہ چونک پڑا۔

یہ گھوڑے تم لوگوں نے کہاں سے لیے ہیں۔

سلیم اسے اس گھوڑے کے قریب لے آیا جس پر نواب سوار تھا۔

ان کے متعلق ہی تو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

جلدی بتاؤ ورنہ میں ابھی اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کر کے تم سے خود پوچھ لیتا ہوں

اسی لمحہ سلیم اس پر شاہین کی مانند جھپٹا اور اسے اُٹھا کر نواب کے آگے پھینک دیا۔

نواب نے اسے اپنے سامنے ایسے دبوچ لیا جیسے چیل اپنے پنجوں

ناسامد حالات میں جنگ آزادی لڑ رہے ہیں اور سال میں سے سینکڑوں حریت پسند سفاک بھارتی حکام کے غیظ و غضب کا نشانہ بن رہے ہیں تو اہل پاکستان خاموشی سے دیکھ رہے ہیں جبکہ حکومت پاکستان آزادی کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ کیا اہل پاکستان خاص کر پاکستان کے سیاسی لیڈر اور اخبارات کے ایڈیٹران کشمیری حریت پسندوں کے لیے ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے دو بول بھی نہیں بول سکتے؟

دس کروڑ پاکستانیوں میں سے تقریباً دو کروڑ کے آباؤ اجداد انیسویں صدی میں اور اس کے بعد کشمیر سے ہجرت کر کے ان علاقوں میں آباد ہوئے تھے جو اب پاکستان ہے لیکن دو کروڑ پاکستانی بھی اپنے آباؤ اجداد کے مادر وطن اور اس کے مجبور و مقہور باسیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے۔ ان دو کروڑ کشمیری نژاد پاکستانیوں کے اس انتہائی قابل افسوس طرز عمل کے برعکس امریکہ کے آئرش نژاد غیرت مند لوگ جو گذشتہ تقریباً چار صدیوں سے اپنے آبائی وطن آئرلینڈ سے ہزاروں میل دور آباد ہیں جن میں سے نوے فیصد نے اپنے آبائی وطن کو کبھی دیکھا بھی نہیں، اس آبائی وطن کے حصے (شمالی آئرلینڈ) کی آزادی کے لیے مصروف جہد تنظیم آئی۔ آر۔ اے کی بھرپور مالی، سیاسی اور سفارتی مدد کر رہے ہیں اور اس مدد کے بل بوتے پر آئی۔ آر۔ اے برطانوی سامراج کے خلاف گذشتہ نصف صدی سے برسرپیکار ہے۔

کیا اہل پاکستان خاص کر کشمیر دوستی کے دعویداروں اور کشمیری نژاد پاکستانیوں کو کشمیری حریت پسندوں اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں اپنے اخلاقی فرائض کا احساس نہیں؟ اگر ہے تو اس انتہائی قابل افسوس خاموشی کا کیا مطلب؟

وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی بیٹی ڈاکٹر روبیہ سعید کے اغوا کا سپنس اور جذبات سے بھرپور ڈرامہ آخر کار ۱۳ دسمبر کو شام ۶ بجے اس وقت اختتام پر پہنچا جب کشمیر لبریشن فرنٹ کے حریت پسندوں نے ڈاکٹر روبیہ سعید کو سری نگر کے ایک گمنام اندرونی علاقہ میں ڈاکٹر عبدالاحد گورو اور میاں عبدالقیوم کے حوالے کیا جو اسے لے کر جسٹس موتی لال بھٹ کی رہائش گاہ پر آئے۔ یہ جسٹس بھٹ ہی تھے جن کی رات دن کی کوششوں سے ڈاکٹر روبیہ رہا ہوئی اور جن پر کشمیر لبریشن فرنٹ کے نوجوانوں نے اعتماد کیا۔ اگر فاروق عبداللہ کی حکومت جسٹس بھٹ پر پوری طرح اعتماد کرتی تو شاید روبیہ ۴۸ گھنٹے پہلے ہی رہا ہو جاتی لیکن اس حکومت نے جس طرح دوسرے معاملات میں نکمے پن کا ثبوت پیش کیا اسی طرح اس معاملے کو الجھانے اور بگاڑنے میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ بہرحال وہ پانچ جنگجو نوجوان جن کی رہائی کا مطالبہ لبریشن فرنٹ کر رہا تھا ۴ بجے بغیر کسی شرط کے رہا کر دیئے گئے تھے۔

روبیہ سعید کے اغوا کے واقعہ نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا اور سب کی نگاہیں کشمیر کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ دنیا بھر سے اخبار نویس اور رپورٹر سری نگر پہنچ گئے جہاں انہیں اندازہ ہوا کہ مفتی محمد سعید غلط نہیں کہہ رہے۔ کشمیر کا مسئلہ آج پنجاب سے کہیں زیادہ خطرناک رخ اختیار کر چکا ہے۔ کشمیر کی روح زخمی ہے اور جسم لہولہان ہے اور ہر زخم بہت شدید ہے۔ ان میں پیدا ہونے والا احساس بالیسی تمام حدوں کو

[illegible]

اس کے قریب آ گیا اور اپنے ریوالور کی بیرل اس کی پسلیوں پر رکھ دی۔
اُگل دو جو کچھ ہم پوچھتے ہیں ورنہ یاد رکھو۔ تمہارے دوسرے ساتھیوں کو پتہ بھی نہ چلے گا اور ہم تمہیں موت کی نیند سُلا چکے ہوں گے۔ شور بھی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایسا کرکے تم صرف اپنی موت کو پکارو گے وقت ضائع نہ کرو جلدی بتاؤ کس کے مویشی ہیں یہ اور کدھر جا رہے ہیں۔

اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

مرالہ کے چودھری منظور اور مقبول کے ہیں۔

منظور کو تو ہم جانتے ہیں یہ مقبول کون ہے۔

اس کا چھوٹا بھائی ہے۔

انھوں نے اتنے مویشی کہاں سے لیے ہیں۔ سچ سچ کہنا جھوٹ بولا تو وقت سے پہلے ہی موت کی بغل میں چلے جاؤ گے۔

چوری کے ہیں۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ دونوں بھائی تم لوگوں سے چوری کراتے ہوں گے۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سلیم نے غصّے میں پوچھا۔

کیوں کرتے ہو تم لوگ چوری۔

وہ خاموش رہا۔

سلیم نے اُسے ریوالور کی ٹھوکر کرائی۔

شرم اور غیرت تو نہیں آتی تمہیں حرام کھاتے ہوئے۔ تم لوگ رات کی تاریکی میں ان رائفلوں کے بل بوتے پر غریب لوگوں سے ان کے مال مویشی چھین لیتے ہو۔ شرم کرو۔ کچھ غیرت کھاؤ۔ تمہیں پتہ ہے منظور کہاں ہے اس وقت۔

دونوں بھائی میلے پر گئے ہوئے ہیں۔

اس وہم میں نہ رہنا کہ وہ زندہ ہے۔ ہم نے اسے میلے سے اغوا [illegible]

لو —— سلیم نے اس کے سامنے اپنا خون آلود ٹوکا کر دیا۔

اسی ٹوکے سے ہم نے اس پاپی کی گردن کاٹی ہے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اپنے گاؤں کی بوڑھی زینب کی بیٹی کو اغوا کرکے اس کی عزت لوٹی تھی۔

نواب نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

تم اس کو سنبھالو سلیم! اور میں اس دوسرے کو لیتا ہوں۔ جب میں گولی چلاؤں تم بھی اسے ختم کر دینا پھر ہم باقی چاروں سے مل کر نمٹ لیں گے۔

نواب گھوڑا دوڑاتا ہوا دوسرے بدمعاش کے نزدیک گیا اور بڑی ہی عاجزی اور نرمی کے ساتھ اس نے پوچھا۔

اے بھائی! کدھر لے جا رہے ہو یہ مویشی۔

نے اپنی تاریخ میں کبھی ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا مگر آج ان نوجوانوں کو ان ہتھیاروں کا نشہ ہے اور کشمیری نوجوان ان ہتھیار بند نوجوانوں کو دیکھ کر فخر محسوس کر رہے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ کشمیری عوام کو ڈاکٹر روبیہ سعید کے اغوا پر افسوس اور ندامت نہیں تھی۔ آج بھی اگر کسی مسلم لیڈر کو کشمیر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو وہ مفتی محمد سعید ہیں جو آگ بگولہ ہو کر انہیں گالیاں دیتے تھے وہ بھی مفتی صاحب کا نام احترام سے لیتے تھے۔ مگر کشمیر کے جذباتی عوام لبریشن فرنٹ کے اس "کارنامہ" پر افسوس کم اور فخر زیادہ کرتے نظر آئے۔ اس کا اظہار اس وقت ہوا جب ۱۱ دسمبر کو افواہ پھیلی کہ روبیعہ کے بدلے پانچ قیدی نوجوانوں کو سرینگر شہر کے مہورزی کدل علاقہ میں شام ۴ بجے رہا کر دیا جائے گا۔ ان کا استقبال کرنے کے لیے ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے وہاں جمع ہو گئے۔ پٹاخے چھوڑے گئے کھلے عام ان کی حمایت میں نعرے لگائے گئے، کشمیر کی آزادی کی تقریریں کی گئیں۔ آخر کار جب ۱۳ دسمبر کو یہ نوجوان رہا ہوئے تو سرینگر میں سڑکوں پر عوام نے اس طرح جشن منایا جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی فتح حاصل کی ہو۔ پاکستان کے جھنڈے لہرائے گئے لوگ سڑکوں پر ناچے، مٹھائیاں بانٹیں اور پورے ہندوستان کو یہ کھلا پیغام دیا گیا کہ کشمیری عوام کی ہمدردیاں معصوم روبیعہ سے زیادہ ان پانچ نوجوانوں کے ساتھ ہیں جنہیں پولیس کی قید سے رہا کیا گیا ہے۔

جوش اور جذبہ میں عام کشمیری لوگ جنگجو نوجوانوں کو سر آنکھوں پہ بٹھا رہے ہیں۔ اس کے لیے جہاں پچھلے چالیس برس میں کشمیریوں کے ساتھ الیکشن کے نام پر ہونے والا مذاق ذمہ دار ہے وہاں پچھلے ڈھائی برس میں فاروق عبداللہ کی نکمی بے حس بدعنوان حکومت بھی ذمہ دار ہے۔ کشمیر میں صرف ۷۷ء میں آزادانہ اور ایماندارانہ انتخابات ہوئے جس کے لیے آج بھی کشمیری عوام اس وقت کے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ خصوصاً ۸۷ء میں جو انتخابات ہوئے ان میں کھلی دھاندلی اور بے ایمانی کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نوجوان مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کی حمایت میں

ب کر رہے تھے وہ آج مایوس ہو کر ہتھیار اٹھا رہے ہیں۔

سنجیدہ اور تجربہ کار کشمیری لیڈروں نے جن کا نام میں یہاں لینا پسند نہیں کروں گا مجھے بتایا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ کشمیر کے مسائل تشدد اور ہتھیاروں سے حل نہیں ہوں گے۔ کشمیری عوام کا نعرہ چاہے جو بھی ہو دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ آج کے حالات میں کشمیر کے مسائل افہام و تفہیم سے ہی حل ہوں گے، ٹکراؤ کی پالیسی بہت دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔ آج اصل مسئلہ کشمیری عوام کے اعتماد کو بحال کرنے کا ہے۔ ان کے دلوں کو جیتنے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کا ہے۔ جتنا دلی کے ذمہ دار لیڈروں کو بھی ان کے جذبات کا احساس ہے اور دہلی کے با اثر سیاسی و صحافتی حلقوں کو بھی، لیکن مسئلہ پچھلے چالیس برس میں اتنا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ اس کا کوئی فوری اور کارگر حل نظر نہیں آ رہا۔ فی الحال کشمیر میں فاروق حکومت کا بنے رہنا نہ ملک کے مفاد میں ہے نہ کشمیر کے مفاد میں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فاروق حکومت کو ہٹا کر کشمیر میں گورنر راج قائم کیا جائے، تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ بدعنوان افسروں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ کشمیری عوام کی لوٹ کھسوٹ بند کرائی جائے۔ بلا تاخیر کشمیر کی اقتصادی ترقی کے لیے واضح اور ٹھوس پلان بنایا جائے۔ کشمیری عوام خصوصاً نوجوانوں کے روزگار کا انتظام کیا جائے۔ ہر معاملے میں کشمیری عوام کو اعتماد میں لیا جائے اور یہ احساس دلایا جائے کہ وہ اس ملک کا حصہ ہیں اور اس ملک میں اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا کہ ہندوستان کا کوئی دوسرا شہری۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے بھی کشمیری عوام کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ ہندوستان میں فسادات کا خاتمہ ہوگا، ہندوستانی مسلمان مطمئن اور خوشحال نظر آئیں گے تو کشمیری عوام کا ہندوستانی نظام پر اعتماد بھی بحال ہوگا۔ ان اقدامات سے ایسا ماحول بنے گا جس میں آزادانہ و ایماندارانہ انتخابات ممکن ہو سکیں گے۔ ان انتخابات میں تمام جماعتوں کو حصہ لینے کی آزادی ہو اور کسی پر پاکستان نوازی کا ٹھپہ لگا کر جمہوری عمل سے باہر نہ رکھا جائے۔ کشمیری عوام جسے اپنا نمائندہ منتخب کریں اس پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اقتدار ان کے حوالے کیا جائے۔ ساتھ ہی پاکستان سے

بنر تعلقات استوار کرتے ہوئے اس مسئلہ کا مستقل اطمینان بخش حل تلاش کیا جائے۔ یہ کرنے کے لیے بہت ہمت، حوصلے، سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کی ضرورت ہے بندوقوں اور ٹینکوں سے وقتی طور پر تو کشمیر میں حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے مگر وہاں عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے یہ سب اقدامات نہایت ضروری ہیں۔

ہندوستان میں بی جے پی اور شیو سینا جیسی کچھ جماعتیں ہیں جو عام ہندوستانی کے جذبات کشمیریوں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں مسلسل دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ فرقہ پرست لیڈر جانتے ہیں کہ دفعہ ۳۷۰ کشمیر کو ہندوستان سے توڑتی نہیں بلکہ جوڑتی ہے۔ آج بی جے پی، شیو سینا اور بلراج مدھوک جیسے لیڈر مفتی محمد سعید کے وزیر داخلہ بنائے جانے کی صرف اس لیے مخالفت کر رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں یہ جماعتیں مسلسل کشمیری عوام کو کچلنے اور ان کے جمہوری حقوق چھیننے کا نعرہ لگاتی ہیں۔ اپنے ان بیانات سے یہ ملک دوستی نہیں بلکہ ملک دشمنی کا ثبوت دیتی ہیں۔ مرکزی حکومت اگر کشمیری عوام کے تئیں منصفانہ اور ہمدردانہ رویہ اپنانے کی کوشش کرتی ہے تو یہ جماعتیں اس پر پاکستان نوازوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا الزام لگاتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کشمیری عوام کے جمہوری جذبات کو کچلنا پاکستان نوازی ہے۔ ایسا کرنے سے وادی میں پاکستان نوازوں کے ہاتھ مضبوط ہو رہے ہیں۔ پچھلے چالیس برس میں وہاں ایماندارانہ طور پر الیکشن نہ کرا کے اور کشمیری عوام کے بنیادی حقوق چھین کر پاکستان نوازوں کے ہاتھ مضبوط کیے گئے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ آنے والے چند ماہ میں پنجاب سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لیگا۔ اگر ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے سیاست سے بلند ہو کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی تو پھر اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ کانگریس کو بھی اس مسئلہ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کے پر امن اور ایماندارانہ حل کی تلاش میں موجودہ حکومت کی مدد کرنی چاہیئے۔ ورنہ ہم سب کو اس کی قیمت چکانی ہوگی۔ (بھارتی اخبارات سے ترجمہ شدہ)

تاریخ حریت کا لازوال کردار

مطبوعہ: ۲۶ر جنوری ۱۹۹۰ء

یہ ۱۲۔اکتوبر ۸۹ء کی بات ہے کہ دن کے ساڑھے تین بجے لال بازار پولیس چوکی کا ڈویژنل افسر محمد عبداللہ حسب معمول علاقے میں امن و امان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے سکوٹر پر سوار حول چوک کے قریب مزار کامل صاحب کی زیارت کے بالمقابل ایک پٹرول پمپ سے سکوٹر کے لیے پٹرول خریدنے میں مصروف تھا اسی اثنا میں ایک آٹو اس کے سامنے رک گیا لیکن محمد عبداللہ نے اس طرف دھیان نہیں دیا اچانک آٹو میں سے ۴ نوجوان اترے اور انہوں نے محمد عبداللہ کو اپنے گھیرے میں لے لیا محمد عبداللہ ان نوجوانوں کا ارادہ سمجھنے سے قاصر رہا تاہم اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی اور اس نے فوراً اپنے پستول پر گرفت مضبوط کر لی ان چار نوجوانوں میں سے ایک نوجوان جو سبز رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا نے محمد عبداللہ سے اپنی پستول ان کے حوالے کرنے کے لیے کہا لیکن محمد عبداللہ نے پستول دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ نوجوان سیخ پا ہو گئے اور ایک نوجوان نے محمد عبداللہ کا گریبان پکڑ لیا اور اس کا پستول چھیننے کی کوشش کی محمد عبداللہ نے فوراً پستول کو ہاتھ میں لہراتے ہوئے ان نوجوانوں سے خوف زدہ ہونے کی بجائے پستول سے ہوا میں جوابی کارروائی کے طور پر تین راؤنڈ چلائے اسی دوران نوجوانوں میں سے ایک نے محمد عبداللہ سے پستول چھین لی اور محمد عبداللہ دم بخود دیکھتا رہ گیا آس پاس کے لوگ پوری طرح اس واقعے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ محمد عبداللہ اپنی پستول چھین جانے سے سخت مایوس اور افسردہ دکھائی دے رہا تھا چنانچہ اس

عجیب حالت تھی اس کی ۔ تہ خانے کے ایک کونے
سے دوسرے کونے تک وہ اس طرح چکر لگا رہا تھا جیسے جنگل سے کسی
شیر کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو ۔

چلتے چلتے وہ رک گیا اور سامنے دیوار کی طرف دیکھا ۔ سارے
نام کٹے ہوئے تھے ۔ اس نے کوئلہ اٹھایا اور سب سے نیچے مقبول کا
نام لکھ دیا ۔

تہ خانے سے وہ باہر آیا ۔ خوب اندھیرا ہو گیا تھا ۔ باہر رشید

نہیں میں اکیلا ہی جاؤں گا ۔ یہ میرا آخری داؤ ہے اور میری زندگی
موت کا داؤ ہے ۔ تم دونوں کے لیے میری ایک نصیحت ہے ۔

رشید اس کے قریب آیا ۔

کہو ——— !

میں اگر اس مہم میں کام آ گیا تو میری لاش نواب کے پہلو میں
دبا دینا ۔

رشید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سلیم اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ کر

ڈاکٹر کے ایل چودھری کے پاس پہنچا حمید کے جسم سے خون کی بھاری مقدار بہہ جانے سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی چنانچہ جب ڈاکٹر چوہدری نے زخمی حمید کی حالت دیکھی تو اس نے نامعلوم عورت کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً حمید کو صدر ہسپتال پہنچائے عورت نے ہمت اور حوصلے سے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے صدر ہسپتال چلنے کی درخواست کی چنانچہ وہاں سے زخمی حمید کو صدر ہسپتال پہنچایا گیا نامعلوم عورت نے یہاں بھی آہ و فغاں اور سینہ کوبی کرتے ہوئے ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹروں کو اپنی طرف متوجہ کیا عورت نے ان ڈاکٹروں سے کہا کہ اس کا بھائی گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا ہے ڈاکٹروں نے اس کو تسلی دی اور اسے سٹریچر لانے کے لیے کہا اس دوران جب عبداللہ شیخ کو سٹریچر پر ابتدائی طبی جانچ کے لیے ایمرجنسی کے مخصوص کمرے میں لایا گیا تو نامعلوم عورت وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی اس نامعلوم عورت کی شناخت ابھی تک معمہ بنی ہوئی ہے اور شاید ہی یہ معمہ کبھی حل ہو گا بہر حال ڈاکٹر جب طبی جانچ میں مصروف تھے تو عبدالحمید نے انہیں اپنا نام اور اصلیت بتائی جس سے ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لیے ہکا بکا رہ گئے لیکن بعد میں انہوں نے عبدالحمید کو آپریشن تھیٹر منتقل کیا اس وقت خفیہ پولیس کے کسی اہلکار کے کانوں میں یہ بات پہنچ گئی اس نے فوراً نزدیکی پولیس سٹیشن کو مطلع کیا چنانچہ پولیس کی ایک بڑی جمعیت وہاں پہنچی جس نے پورے ہسپتال کا گھیراؤ کیا۔

ڈاکٹروں نے ساڑھے چار گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد عبدالحمید شیخ کے جسم سے گولیاں نکالیں اور اس کی جان بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہسپتال ذرائع سے معلوم ہوا کہ جب عبدالحمید شیخ کو آپریشن تھیٹر سے باہر لایا جا رہا تھا تو چند نوجوانوں نے آپریشن تھیٹر کا گھیراؤ کیا اور ڈاکٹر سے عبدالحمید شیخ کو ان کے حوالے کرنے کے لیے کہا لیکن ایک سینئر ڈاکٹر نے ان کو مشورہ دیا کہ حمید کی حالت تشویشناک ہے اور اگر ایسی حالت میں اس کو دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا تو اس کا بچنا مشکل ہے یہ مشورہ سن کر مذکورہ نوجوان وہاں سے بھاگ گئے جبکہ عبدالحمید کو

آپریشن کے بعد صدر ہسپتال کے ایک خاص کمرے میں رکھا گیا جس کے ارد گرد سی آر پی نے حصار بنا لیا اور کسی کو اس کمرے تک جانے کی اجازت نہیں دی گئی آپریشن کے بعد عبدالحمید شیخ کی حالت میں اگرچہ کسی حد تک سدھار آ گیا لیکن تیز بخار اور سانس لینے میں دشواری محسوس کرنے کی وجہ سے اس کی حالت دوبارہ بگڑ گئی جس کے پیش نظر اس کو صورہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ منتقل کیا گیا عبدالحمید کے دو دیگر زخمی ساتھیوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک مقامی ہسپتال میں مرہم پٹی کرانے کے بعد فرار ہو گئے بتایا جاتا ہے کہ ہسپتال میں پولیس کے کڑا پہرہ ہونے کے باوجود اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ گئے۔

زخمی عبدالحمید شیخ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے ان چار ایریا کمانڈروں میں سے ایک ہے جن کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس نے فی کس ۲۵ ہزار روپے کا انعام رکھا ہے۔ حمید شیخ نے ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں وادی کے باقی نوجوانوں کی طرح سرگرم حصہ لیا اس نے مسلم متحدہ محاذ کے امیدوار مولوی محمد یوسف شاہ کو کامیاب بنانے کے لیے رات دن کوششیں کیں مگر جب انتخابی دھاندلیوں کے ذریعہ وزیر تعلیم محی الدین شاہ کو کامیاب قرار دیا گیا تو حمید شیخ اور اس کے دیگر چار ساتھیوں اشفاق، مجید، جاوید احمد یٰسین ملک کا جمہوریت پر سے اعتماد اٹھ گیا اور وہ سخت بدظن ہو گئے۔ انہوں نے اسلامک سٹوڈنٹس لیگ کے بینر تلے کشمیری عوام کے غصب شدہ حقوق کی حصولیابی کے لیے آواز بلند کی لیکن انتخابی دھاندلیوں کے بل بوتے پر وجود میں آئی ہوئی حکومت کے ارباب و اختیار نے ان کی آواز دبانے کے لیے زندان کے دروازے کھول دیئے حمید شیخ اور اس کے دیگر ساتھی جیلوں میں انصاف کی دہائی دیتے رہے شیر گڑھی تھانے جہاں عبدالحمید کو نظر بند کیا گیا میں اسے سخت اذیتیں دی گئیں حتیٰ کہ ایک اطلاع کے مطابق وزیر تعلیم محی الدین شاہ نے شیر گڑھی تھانے میں خود جا کر عبدالحمید شیخ کی شدید پٹائی کی جس سے اس کے جذبات مزید مجروح ہو گئے۔ جیلوں سے چھوٹنے کے بعد حمید اور اس کے ساتھیوں نے جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی اور

اور کشمیر کی آزادی کے لیے چلائی جا رہی تحریک آزادی میں سرگرم رول ادا کرنے میں مصروف ہو گئے گذشتہ ایک سال سے ان کی کارروائیوں نے پولیس حکام کی آنکھوں کی نیند حرام کر دی اور بے بسی کے عالم میں ان پانچ فٹ تیلے اور چست نوجوانوں کے غیظ و غضب کا شکار رہے۔ کشمیر پولیس نے ان کو پکڑنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی لیکن بے سود اب حال ہی میں جس ڈھنگ سے عبدالحمید شیخ پولیس کی گولی کا شکار ہو گیا اس سے پولیس حکام پر خوشی کی لہر دوڑی ہو گی مگر حمید کے چاہنے والوں اور ساتھیوں کو یقین نہیں آتا ہو گا کہ حمید جیسا مضبوط جسم کا مالک اور پھرتیلا نوجوان اتنی آسانی سے پولیس کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ چنانچہ صورہ انسٹی ٹیوٹ منتقلی سے قبل ایڈووکیٹ امتیاز احمد صوفی اور شبنم غنی لون نے سرکردہ ایڈووکیٹ مسٹر ظفر شاہ کی قیادت میں ہائی کورٹ سے اجازت حاصل کر کے مدرسہ ہسپتال میں اس سے ملاقات کی بتایا جاتا ہے کہ جب یہ وکلا عدالت کا اجازت نامہ لے کر ہسپتال پہنچے تو میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر علی محمد متو نے انہیں ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور تقریباً ایک گھنٹے تک انہیں روکے رکھا جب یہ وہاں سے نہ ہٹے تو انہوں نے پولیس کو مطلع کیا چنانچہ ایس ایس پی اللہ بخش خود وہاں آئے اور دیگر [illegible] کے ہمراہ حمید کے والد اور والدہ بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ حمید کے کمرے میں لے گئے جہاں کمرے کے اندر اور باہر پولیس کا بندوبست تعینات تھے حمید نے اپنی والدہ سے پوچھا کہ اس کے کانوں میں جو بالیاں تھیں وہ کہاں ہیں والدہ رو رہی تھیں البتہ حمید نے اسے خاموش کرایا اور نے والدین سے کہا کہ میرے بارے میں فکر مند نہ ہوا نہیں فکر کرو۔ کشمیر پولیس کے ایک اہلکار محمد عبداللہ کے ہاتھوں شیخ عبدالحمید کے شدید زخمی ہونے پر پوری وادی میں جو زبردست تشدد پھوٹ پڑا اور جس طرح مرد، عورتیں اور بچے حکومت اور پولیس کے خلاف مظاہروں میں شرکت کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اس سے حریت پسندوں کو بڑا حوصلہ ملا اس سے قبل اگرچہ پیپلز لیگ کے رہنما شبیر احمد شاہ کی گرفتاری اور ان کی موت کی افواہ کے موقعہ پر وادی میں بے مثال ہڑتال ہوئی تھی اور حکومت کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے تھے لیکن شبیر احمد شاہ کے متعلق نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت کو بھی بخوبی علم ہے کہ انہوں

نے مسلح جدوجہد میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی وہ اپنے پاس ہتھیار رکھا کرتے تھے چنانچہ گرفتاری کے وقت بھی ان کے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ موجود نہ تھا۔ آپریشن بالاکوٹ کے نقیب اعظم تیولی نے بھی شبیر احمد شاہ کی گرفتاری کے موقعے پر اپنے ایک بیان میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ شبیر احمد شاہ کا مسلح جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ریاست کے ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے سیاسی مشن پر پاکستان جا رہے تھے۔

جہاں تک عبدالحمید شیخ کا تعلق ہے تو وہ اعلانیہ طور پر خود کو مسلح کارروائیوں سے وابستہ کر چکے تھے اور حکومت بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے چنانچہ ۲۱ اکتوبر کی سہ پہر کو گاہی بار چوک میں جڈی بل کے قریب جب وہ سب انسپکٹر محمد عبداللہ کی گولیوں کا نشانہ ہوئے تو وہ خود بھی مسلح تھے اور ان ساتھیوں اور پولیس اہلکاروں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ بھی ہوا تھا جس کے نتیجے میں پولیس اہلکار محمد عبداللہ کے کندھے میں بھی ایک گولی لگ گئی تھی۔

کشمیر لبریشن فرنٹ کے سرگرم رکن عبدالحمید شیخ کے زخمی ہونے کے بعد سے درجنوں کشمیری احتجاجی مظاہروں میں پولیس کی گولیوں سے شہید ہو چکے ہیں ان میں نوجوان ہی نہیں بوڑھے اور کم سن لڑکے بھی شامل ہیں حمید شیخ کی صحت یابی کے لیے دعائیہ مجالس کا انعقاد نذر و نیاز اور بھیڑوں کی قربانی کا سلسلہ برابر جاری ہے بڑبالو واندر رکھاہ میں ان کی رہائش گاہ پر لوگوں کا تانتا بندھا رہا یکم نومبر کو وہاں جو دعائیہ مجلس منعقد ہوئی اس میں ایک اندازے کے مطابق ۴ ہزار لوگوں نے شرکت کی ان میں سیاسی لیڈر بھی تھے اور طالب علم بھی مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اس موقعہ پر حمید کے والد خواجہ عبدالکبیر شیخ نے ایک جذباتی تقریر کی تھی ماحول رقت آمیز ہو گیا انہوں نے کہا میں اپنے لخت جگر کے بارے میں اس حد تک غمگین ہوں کہ اسے درجہ شہادت کیوں عطا نہیں ہوا اور وہ صرف زخمی کیوں ہوا انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے فرزند کو قوم کے لیے وقف کر دیا ہے اور انشاء اللہ جب میرا کمسن بیٹا جوان ہو گا تو اسے بھی قوم کے لیے وقف کر دوں گا عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ اس تقریر پر لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور فضا پرجوش نعروں سے گونج اٹھی

پیپلز کانفرنس کے چیئرمین عبدالغنی لون اور مشتاق احمد ساگر نے بھی اس موقعہ پر
کیس بعد میں درگاہ غوثیہ سرائے پائیں میں بھی ایک بہت بڑی دعائیہ مجلس کا انعقاد
جس میں لوگوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی یہاں مقررین میں لوگوں کی بھاری تعداد
شرکت کی یہاں مقررین نے سید شیخ کو جنرل عبدالحمید شیخ کہہ کر پکارا اور ان کے
کے لیے دعا کی۔

ان واقعات سے ایک بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ لوگ
پر حریت پسندوں کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں
اور اس سلسلے میں اپنی جانوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے گھاسی بار میں عبدالحمید شیخ کے
ہونے ہی وہاں لوگوں کی بے شمار بھیڑ جمع ہو گئی تھی جس نے نہ صرف مجروح
اہلکار محمد عبداللہ کی پٹائی کی بلکہ اس کے سکوٹر کو بھی نذر آتش کر دیا نوجوانوں
عبدالحمید شیخ کو سرکاری ہسپتال لے جانے کے بجائے جس طرح پہلے ان خود مرہم
اور پھر پرائیویٹ نرسنگ ہوم لے جانے کا پر خطر کارنامہ انجام دیا وہ بھی قابل غور
پھر اعلانیہ طور پر دعائیہ مجالس کا انعقاد اور اس سلسلے میں لاؤڈ سپیکروں پر اس کا
اعلان اس بات کی واضح علامت ہے کہ لوگ اس معاملے میں حکومت یا پولیس کو
میں لانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کا کوئی خوف اور ڈر
اس سلسلے میں ان سے باز پرس کی جائے گی۔

۱۹۶۶ء میں جب وادی میں کشمیر لبریشن فرنٹ کی داغ بیل ڈالی گئی
مقبول بٹ زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف رہے تو حالات بالکل مختلف
تھے عام لوگ اس تحریک میں حصہ لینے سے گھبراتے بھی تھے یہاں تک کہ مقبول بٹ
ان کے ساتھیوں اور رنگ زیب، یٰسین اور کالے خان کو پناہ دینے کے لیے لوگ
راضی کرنا کارے دارد تھا اگرچہ چند پڑھے لکھے نوجوان ان کی امداد اور حمایت پر
آمادہ ہو گئے اور انہوں نے عملاً بھی زیر زمین سرگرمیوں میں حصہ لیا لیکن سب
طور طریقے پر ہوتا رہا یہاں تک ان کے گھر والے بھی ان کی سرگرمیوں سے ناواقف

مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو لوگ افسوس کی حد تک اپنے خیالات کا
کرتے رہے سرینگر سنٹرل جیل میں سے ان کے فرار اور پھر وادی میں ان کی واپسی کے
ان کی گرفتاری پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا کشمیر لبریشن فرنٹ کے حامیوں کے
بھارت کے ایک سفارت کار کے قتل کے بعد مرحوم مقبول بٹ کو تہاڑ جیل میں
تختہ دار پر لٹکا یا گیا تو وادی میں کوئی ہمہ گیر احتجاج نہیں ہوا اور نہ ہی اس قسم کے تشدد آمیز
ہوئے جو گذشتہ کچھ عرصے سے وادی میں رونما ہونے لگے ہیں ظاہر ہے موجودہ صورت
حریت پسندوں کے لیے زبردست حوصلہ افزا ہے اور ان کے پاس یہ بات تسلیم
کا جواز موجود ہے کہ لوگ نہ صرف ان کی سرگرمیوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے
بلکہ ان کا بھرپور ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہیں شبیر احمد شاہ کی گرفتاری کے موقعہ پر
مسلسل چار دن تک بے مثال ہڑتال کے بعد عبدالحمید شیخ کے پولیس کی گولی سے
زخمی ہونے کے بعد پوری وادی میں ایک بے مثال ہڑتال اور تشدد آمیز واقعات ان
کے لیے ثبوت فراہم نہیں کرتے بلکہ تقویت کا باعث بھی ہیں لبشیر احمد شاہ کی گرفتاری
پر جو تشدد پھوٹ پڑا تھا۔ اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کم تھی لیکن شیخ
زخمی ہونے کے بعد انہیں حراست میں لینے کے بعد کے واقعات کے دوران لیا
ہونے والوں کی تعداد نہ صرف بڑھ گئی ہے بلکہ تشدد آمیز مظاہروں میں بڑھ چڑھ حصہ
یہاں تک کہ پولیس کو انہیں منتشر کرنے کے لیے زد و کوب کرنا پڑا اسلام آباد میں فوج
طلب کرنے کی ضرورت آپڑی اور سوپور بارہ مولہ اور وادی کے دوسرے قصبوں میں بھی
مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا حریت پسندوں کے تئیں والہانہ عقیدت اور زبردست
حمایت کا یہ مظاہرہ جہاں ان کے لیے باعث شادمانی ہو گا وہاں حکومت کے لیے
مشکلات اور پریشانیوں کا موجب ثابت ہو گا اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مسلح
کارروائیوں سے کشمیر میں ہندوستان کی موجودگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا لیکن حریت
پسند احوال کو بجبر تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں انہوں نے وادی کی تمام سیاسی
عملی طور پر بے کار اور مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے اب یہاں عوامی سطح پر کسی پارٹی

کا وجود باقی نہیں رہا چاروں طرف "مجاہدوں" کا طوطی بول رہا ہے طالبہ و افغان
ظاہر ہے کہ کشمیریوں اور دہلی کے درمیان فاصلے بہت زیادہ بڑھ چکے ہیں جو
سے اشتہاری مجرم قرار دیئے گئے نوجوانوں کے تئیں عوام کی والہانہ عقیدت کا
بغاوت کے مترادف ہے۔

یہی وہ عبدالحمید شیخ ہے جو حریت پسندوں کی طرف سے بھارتی وزیر داخلہ
محمد سعید کی صاحب زادی کی رہائی کے عوض مانگے گئے حریت پسندوں میں سر فہرست
اور جس کی رہائی کے لئے وادی کشمیر شعلہ جوالہ کا روپ دھار گئی تھی عبدالحمید شیخ
ہی انشاءاللہ کشمیر کو بھارت کے پنجہ استبداد سے رہائی دلائیں گے۔ کاش ہم ان جیالوں
دعا سے زیادہ نہیں کچھ کر پاتے۔

کشمیر فریڈم موومنٹ کے عبدالحمید دیوانی کہتے ہیں!

آزادی کی خواہش دہشت گردی نہیں

سوال۔ دیوانی صاحب آپ پر نیشنلزم کی چھاپ کیوں ہے؟ کیا آپ کشمیر کو الگ ملک بنانا چاہتے ہیں؟

جواب۔۔۔۔ میں ہرگز نیشنلسٹ نہیں ہوں یہ لفظ مسلمان کے لیے گالی ہے
نہیں یہ بات مجھ سے جناب راؤ رشید صاحب جو اس وقت پولیس کے سربراہ تھے
نے شاہی قلعے میں کہی تھی اور ساتھ ہی فرمایا تھا کہ تم کشمیر کی سٹ کیوں لگا رہے ہو تم لوگوں
کی حمایت کر کے ہم نے آدھا ملک گنوا دیا ہے۔ ہم کسی کشمیر وشمیر کو نہیں جانتے۔ اس وقت
میری حالت یہ تھی کہ میں زخموں سے چور چور تھا میرے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا
اور مجھے آئی جی پولیس کی موجودگی میں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تو راؤ صاحب نے مجھے
کہا ہم تم جیسے نیشنلسٹوں کے لیے بقیہ پاکستان داؤ پر نہیں لگانا چاہتے میں نے ان سے بھی
کہا تو جناب عالی جہاد اپنی اصل روح کے ساتھ کشمیر میں نافذ ہو چکا ہے۔ میرے پاس کشمیر
اور ہندوستان کے جید علماء کرام کے فتوے موجود ہیں ہر وہ جگہ جہاں مسلمان ابتلا کا شکار
ہے جہاں وہ آزادی کا سانس نہیں لیتا وہاں پہنچ کر جہاد کرنے کو تیار ہوں۔ میں نیشنلسٹ
نہیں مجاہد ہوں اور آزادی کے بعد کشمیر کا الحاق پاکستان سے چاہتا ہوں اور یہی پالیسی
حکومت پاکستان کی ہے مگر میری ایک نہ سنی گئی اور مجھ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔

جب میں کورٹ لکھپت جیل نمبر ۱۲ تک بند تھا تو میں نے کشمیر کی ہسٹری کو ملے سے دلوا دل
پر لکھی۔ میں کوٹھڑی میں بند ہوتا تو دل کا غبار نکالا کرتا تھا ایک شام میرے پاس جیل کا

ایک نمبردار آیا کہ درانی صاحب جلدی کریں آپ کو یہ کوٹھری خالی کرنا ہے میں نے پوچھا اب اور کون سے نرک میں لے جاؤ گے تو اس نے کہا کہ آپ کو نسبتاً بہتر جگہ فراہم کی جا رہی ہے یہاں ایک اور شخص آ رہا ہے اور اگلے ہی دن جناب ذوالفقار علی بھٹو تشریف لے آئے۔ زندگی کی جدید سہولتیں اس کوٹھری میں مہیا کر دی گئیں۔ بھٹو صاحب کو آئے ہوئے تھے کہ ایک جمعدار وکش عیسائی نے جو بھٹو صاحب کے کمرے کی صفائی پر تعینات تھا آہستہ سے میرے کان میں کہا بھٹو صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے وہ جو کچھ آپ نے دیوار پر لکھا تھا بھٹو صاحب انہیں گھورتے رہتے تھے۔ تو میں نے اس جمعدار وکش سے کہا کہ بھٹو صاحب سے کہہ دو جب وہ برسر اقتدار تھے تو انہوں نے میرے لیے کچھ نہ کیا الٹا مجھے بے پناہ غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اب جبکہ وہ میری طرح ایک قیدی ہیں مجھ سے کیا کہنا چاہیں گے۔ ان سے کہہ دو میں اب ان سے نہیں مل سکتا۔ تو اگلے دن اس جمعدار نے بتایا کہ میں نے درانی صاحب آپ کا جواب ان تک پہنچا دیا وہ سن کر بڑے متاثر ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا میں اس شخص سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ میں بہرحال انہیں صدق دل سے معاف کر چکا ہوں کہ تاہم انہوں نے مجھے ہمیشہ سے نیشنلسٹ کی نظر سے دیکھا تھا جبکہ میں تو جہاد کے اعلان کے بعد جہاد کی نیت سے بھارتی طیارہ ۷۲ لے کر پاکستان آیا تھا میں چاہتا تھا کہ عالم اسلام کو اس اہم مسئلہ کی طرف راغب کروں۔ اس سلسلے میں میں نے ہندوستان کے جید علماء سے ملاقاتیں بھی کیں۔ جہاد کشمیر کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان افغانستان کے مسلمانوں کی طرح عالم اسلامی کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ افغانستان کی جدوجہد مسلح ہو کر شروع کی گئی۔ جبکہ میں نے جب بھی اسلحہ بھارت لے جانے کی کوشش کی مجھے یہیں دھر لیا گیا اور تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ صدر ضیاء الحق مرحوم اس مسئلہ کی سنگینی سے واقف تھے۔ انہوں نے مجھے کہلا بھیجا کہ ابھی پاکستان اتنا طاقتور نہیں جتنا تم سمجھتے ہو دعا کرو کہ رب العزت اس کو وہ قوت و ہمت عطا کرے کہ پاکستان بھارت سے کشمیر لے لے۔ سردست تم سے کسی مدد کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ضیاء الحق شہید جب برسر اقتدار آئے تو

اٹک کے قلعے چیلاس میں ایف ایس ایف کی زیر نگرانی ایک زیر زمین اندھیری کوٹھری میں اپنے ساتھیوں سمیت بند تھا سترہ ماہ میں اس اندھیری کوٹھری میں بند رہا مجھے تاریخ اور دن یاد نہیں رہے۔ سورج کی روشنی میں نہ آنے کے سبب ہمارے جسم سے ہماری کھال اترنی شروع ہو گئی تھی ہمیں زندہ رہنے کے لیے ناقص ترین غذا فراہم کی جاتی تھی۔ اور ایف ایس ایف کے افسران جب بھی ملنے آتے ایک جملہ ضرور کہتے کہ بس بھٹو صاحب کا حکم آنے والا ہے تم لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ تو میں کہتا اللہ کے بندو مارو گولی جو سلوک تم لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے موت تو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں اس اذیت سے نجات پا کر اپنے اللہ کے حضور چلا جاؤں گا۔ جہاں انشاء اللہ میرے لیے بے حد انعام و اکرام ہیں۔ جواب میں وہ کہتے کہ پاگل ہو گیا ہے۔ عرض کر رہا تھا کہ جس دن ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی چیلاس کے قلعہ کا نظم و نسق ایف ایس ایف سے لے لیا گیا اور مجھے عزت و احترام سے سورج کی روشنی میں ایک آرام دہ کمرہ نہ صرف رہنے کو ملا بلکہ ایک ہرولی مجھے دیا گیا۔ ایک بریگیڈیئر صاحب نے جنرل صاحب کی جانب سے بندہ بے خیر سگالی کا ایک پیغام مجھے دیا اور بالآخر ایک فوجی عدالت نے مجھے نہ صرف باعزت بری کیا بلکہ جنرل صاحب کی طرف سے انٹیلی جنس کے کچھ افسران بارہا میرے پاس آ کر یہ آتے کہ میں کچھ رقم رہائش کے لیے بنگلہ اور سیالکوٹ میں زرعی زمین قبول کر لوں مگر میں نے جنرل صاحب کو کہلا بھیجا کہ مجھے ان آسائشوں کی ضرورت نہیں میں ایک کروڑ پتی خاندان کا فرد ہوں میرے پاس مقبوضہ کشمیر میں کروڑوں کی جائیداد ہے وہیں رہتا۔ مجھے اسلحہ چاہیے اور پاکستان سے نکلنے کی اجازت جنرل صاحب نے میری اس خواہش کے جواب میں کہلا بھیجا کہ پاکستان ابھی اتنا طاقتور نہیں۔ میں آج بھی دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے الرحمٰن کو اتنا طاقتور بنا دے کہ عالم اسلام کے حقوق کی بات کہہ اور منوا سکے۔

سوال۔۔۔ جہاد کے ضمن میں علماء و مشائخ کے کردار کو آپ کن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں ان کی قیادت مؤثر نتائج برآمد نہ کر سکتی تھی اور پھر کر عالم اسلام کی توجہ اس جانب مبذول کرانے میں قدرے آسانی ہوتی۔؟

جواب۔۔۔ میں اس بات کے حق میں ہوں اور تشدید کے آخری معنوں تک کہ قیادت بہر حال علماء ہی کا حصہ ہے میرے والد صاحب جناب مفتی حسام الدین بڑے عالم دین ہی تھے۔ میں گو کسی دینی ادارے میں علم حاصل نہ کر سکا یہ میری بدقسمتی ہی جان لیجئے مگر میں نے اسلامیات میں ماسٹر ڈگری لی۔ میرے معاملات ہندوستان کے علماء کے ساتھ تھے۔ علماء ہی ہندوستان میں جہاد کو اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کر سکے ابتدا میں ہی۔ جہاد کے خضوع و خشوع سے ایک عام مسلمان بھی واقف ہو سکتا ہے مگر اس کی اصل روح سے نیاز صرف اور صرف علماء کرام ہی کو حاصل ہے۔ جب ہم جہاد کی اصل روح کے ساتھ نفاذ کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب وہ قواعد و ضوابط ہیں جو ہمیں قرآن و حدیث سے ملے ہیں اور تاریخ شاہد ہے جس جہاد کی قیادت علماء کرام کے ہاتھ میں رہی وہ کامیاب و کامران رہا۔ آپ دور نہیں جانا چاہتے تو افغانستان ہی کو لے لیجئے۔ قیادت مکمل طور پر علماء کے ہاتھ میں ہے لہذا جہاد کا نفاذ اس کی اصل روح کے ساتھ ہوا۔ نتائج سامنے ہیں اس سے قبل ۱۸۵۷ء میں اعلان جہاد کیا گیا۔ دینی مدارس کے طلبہ نے تحریک اٹھائی اور بڑی بے جگری سے لڑے مگر جب قیادت میں عام لوگ بھی شامل ہو گئے پھر غیر مسلم بھی شامل ہوئے تو جہاد کے قواعد و ضوابط کو برقرار رکھنا ممکن نہ رہا اور نتیجہ ناکامی۔ یہی حال ریشمی رومال کا ہوا اور کم و بیش تحریک خلافت بھی اسی سانحہ سے دوچار رہی اور ہم خاطر خواہ نتائج حاصل نہ کر سکے۔ افغانستان میں غیر عالم عنصر اسے امریکہ اور روس کی جنگ سمجھ کر میدان سے باہر رہے قیادت علماء اکرام کے ہاتھ رہی تو نتیجہ دنیا کے سامنے ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ نے جو فوجی قواعد و ضوابط سے نا آشنا تھے روس کی باقاعدہ فوج کو مع بھارتی مشیروں اور بہترین اسلحہ کے ناکوں چنے چبوا دیئے کیونکہ اس جہاد کی قیادت علماء کرام کے ہاتھوں رہی لہذا پوری دنیا کے دینی مدارس کے طلبہ نے اس میں حصہ لیا۔ یونیورسٹیوں سے بھی طلبہ اس میدان میں آئے۔ دارالعلوم دیوبند سے بنگلہ دیش سے کویت سعودی عرب سے الجزائر سے لیبیا سے پاکستان سے اور نہ جانے کس کس خطے سے دینی مدارس کے طلبہ نے اس جہاد میں حصہ لیا۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا

مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا احمد علی لاہوری شاہ ولی اللہ اور شہدائے بالاکوٹ آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ آج افغان جہاد میں ہزاروں علماء کرام سربکف ہیں میں بھی لق و دق صحرا میں کھڑا کسی مجاہد عالم کا منتظر ہوں جو کشمیر کے بے بس مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو بھارتی مظالم سے نجات دلائے۔ میں ان کی قیادت میں عام سپاہی کی طرح لڑنا فخر سمجھتا ہوں۔

سوال۔۔۔ آپ افغانستان بھی گئے ہیں وہاں آپ کی ملاقات علماء اکرام سے ہوئی ہے کیا آپ نے اپنا مقصد ان کے سامنے رکھا اگر آپ نے مسئلہ انہیں بتایا تو ان کا موقف اس ضمن میں کیا رہا۔

جواب۔۔۔ جناب قائد عوام اور ان کے جیالوں نے میرے دل میں امید دل کے ہر چراغ کو بجھا دیا تاہم جنرل صاحب نے خاصی امید دلائی میں نے وہ شمع پھر روشن کی میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت سارا وقت پاکستانی ارباب اختیار کو یہ سمجھاتے ہوئے گزار دیا کہ وادی کشمیر کے مظلوم و مجبور اور محکوم مسلمان مرد عورتیں اور بچے پاکستان ہی کو اپنی منزل مقصود تصور کرتے ہیں اور چونکہ آپ بھی عالمی سطح پر اس مسئلہ کو اٹھا چکے ہیں لہذا میری اعانت کی جائے تاکہ میں اپنے عمل سے انہیں اس ذلت سے نجات دلانے کی کوشش کر سکوں مگر میرے ساتھ کیا سلوک ہوا یہ آپ لوگ بارہا پڑھ چکے ہیں۔ اب جبکہ ضیاء الحق نہیں رہے اور اسلامی جمہوری اتحاد اقتدار سے محروم رہا ہے تو پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ لہذا اب میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا میں نے کشمیر کی پوری حالت ممتاز جید عالم باعمل اور مجاہد کبیر حضرت مولانا ارسلان خان رحمانی کے سامنے رکھی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں پہلے اس قدر حالات کا علم نہ تھا۔ آپ بے فکر رہیے پاکستان اس مسئلہ میں پہلو تہی کرے تو کرے ہم نمٹ کریں گے۔ راستہ ہم پاکستان سے لیں گے اور بھارت کے تسلط سے اپنے دینی بھائیوں کو نجات دلا کر رہیں گے۔ اسی طرح کا بیان کم و بیش مولانا کمانڈان جلال الدین حقانی اور نظام الدین حقانی نے بھی دیا ہے اور افغانستان کے علماء نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم فتح پانے ہی اپنے گھر کی تعمیر بعد میں کریں گے پہلے بھارت سے نمٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں

یاد رہے کہ یہ وعدہ کسی سیاسی پلیٹ فارم سے نہیں ہوا کلمۃ اللہ کے لیے خون کا نذرانہ پیش کرنے والے ان مجاہدوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جہاد کشمیر کی خوشبو اب دیگر اسلامی ممالک کی طرف بھی رخ کرے گی پاکستان کی دینی جماعتوں نے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ غلامی میں قوموں کا مورال گر جاتا ہے الله رب العزت کا شکر ہے کہ کشمیری مسلمان آج بھی جہاد کی راہ پر گامزن ہیں۔

سوال.... سارک کانفرنس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

جواب.... سارک کانفرنس کے نتائج میری توقع کے عین مطابق ہیں میں اس سے پہلے بھی زیادہ پرامید نہیں تھا۔ مایوسی توقعات کی بنا پر ہوتی ہے موجودہ قیادت کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی نہیں۔ مجموعی اعتبار سے جائزہ لیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ساؤتھ ایشیا کی اقوام میں چھ ممالک اس تنظیم کے ممبر ہیں۔ بھوٹان بھارت ہی کا حصہ ہے سری لنکا اور مالدیپ بھارت کے مفتوح علاقے ہیں نیپال مشرقی پاکستان بھارت کی آویزش اور شرارتوں کا شکار رہتے ہیں۔ بھارت سے چھوٹے ہیں ان میں سے کوئی نہیں جو بھارت کی مرضی کے خلاف کچھ منوا سکنے کی پوزیشن میں ہو۔ رہی پاکستان کی پوزیشن تو اب بھارت کی منظور نظر حکومت ہے لہذا سوائے مدح سرائی کے یا ایک بھونڈے شو بزنس کے اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سب وقتی باتیں ہیں اللہ تعالیٰ اسلام کے اس قلعہ کو نظر بد سے بچائے اب اور بھی طاقتیں موجود ہیں جو پاکستان کی بقا کی ضامن ثابت ہوں گی۔ نجیب حکومت کا چراغ آخری ہچکی لے چکا ہے ایک کروڑ مسلح افغان پاکستان ہی کی قوت ہیں۔ اس سارک کانفرنس میں تین اہم شقیں منظور کی گئیں یا یہ کہہ لیجئے کہ تین باتوں کو زیادہ اہمیت دی گئی یہ بات تو اچھی طرح جان لیجئے کہ ہندو مت میں کسی بین الاقوامی معاہدے کی کوئی اہمیت نہیں اس کے سات نکسی شاستر ہیں ساتوں اس بات پر متفق ہیں کہ جھوٹ بولنا اور عہد سے پھر جانا اس وقت بہت ضروری ہے جب کسی ملیچھ کو فائدہ اور ہندو مت کو نقصان ہوتا نظر آئے۔ چوری کرنا۔ دھوکہ دینا اور دھوکے میں رکھنا کرشن جی مہاراج کے زریں اصولوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہی اور بہت سی خرابیوں سے کیا لینا دینا؟

صرف دھوکہ دہی اور عہد سے پھر جانے پر بات کریں گے۔ پاکستان کے تخیل کے اصل اور پہلے وارث جناب سید امیر علی نے وادی کشمیر کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا مسلمانو! یہ بات اچھی طرح جان لو کہ کسی مسلمان کے احمق ہونے کے لیے یہ بات بے حد کافی ہے کہ وہ کسی ہندو کے وعدہ یا عہد کا اعتبار کرے۔ لہذا اس عہد کا بدل ہمیشہ سے تیار رکھو جو تم سے وہ ہندو کر گیا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے جو کانگرس نے مسلمانوں سے وعدے کئے چلئے انہیں پارٹی پالیٹکس کہہ کر نظر انداز کر دیجئے ہم ان عہد ناموں اور وعدوں کو زیر بحث لے آتے ہیں جو حکومت ہند نے حکومت پاکستان سے کئے۔ محمد علی جناح اللہ اس کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل کرتا رہے ٹیبل ٹاک میں کسی کانگرسی لیڈر کو ذلیل تر کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گاندھی ٹیبل پر جب ہار جاتا تو اپنے آپ کو بے اختیار ممبر کہہ کر بھاگ کھڑا ہوتا ان سب کا یہی کردار تھا لہذا جناح جو بھی معاہدہ ان کے ساتھ کرتے اس کا توڑ بھی ساتھ سوچ لیتے کہ اگر یہ منحرف ہو جائیں تو پھر مسلم لیگ کون سی حکمت عملی اختیار کرے گی۔ وہ بھی ان ہندوؤں سے ہمیشہ شاکی رہے اور انہیں وعدہ معافی کی صورت ہی دیئے رکھی۔ پاکستان بننے سے پہلے جو معاہدے ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کئے ان کی تفصیل بے حد طوالت کا سبب بنے گی میں بعد از ۱۹۴۷ء کا ذکر کروں گا۔ سب سے پہلا معاہدہ ایک انگریز ایڈمنسٹریٹر کی نگرانی میں ہی طے پایا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت کا حصہ ہوں گے اور ریڈکلف کو نگران مقرر کیا گیا مگر ہوا کیا حیدر آباد دکن جونا گڑھ مناودر اور وادی کشمیر واضح مسلمانوں کے علاقے ہونے کے باوجود بھارت کا اٹوٹ انگ بنا دیئے گئے ریڈکلف کو رشوت دے کر اور ناقابل تحریر طریقے سے لبھا کر معاہدے کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ اس کی ایک شق کہ پاکستان کے حصے کے اثاثے کرنسی پوسٹ سٹیمپ اسلحہ اور دیگر چیزیں پاکستان کو دی جائیں گی کیا وہ دی گئیں؟ مشرقی پنجاب سے امن اور سلامتی کے ساتھ مسلمانوں کے اخراج کا معاہدہ کیا گیا۔ مسلمان کتنے خون کے دریا تھے جنہیں عبور کر کے گوشہ عافیت میں داخل ہوئے۔

سکھوں کے ماسٹر تارا سنگھ جیسے نیم ہندو کے ذریعے سے معاہدہ کیا گیا کہ مسلمان اگر پنجاب میں خون سے نہلا دیئے گئے تو سکھوں کو نہ صرف الگ قومی تصور دیا جائے گا بلکہ بھارتی آئین میں الگ قوم کا درجہ دیا جائے گا اور پنجاب میں داخلی خودمختاری دی جائے گی مگر دیا کیا صرف ایک کروڑ روپیہ وہ بھی صرف تارا سنگھ کو اور جیسے ہم کشمیری پچھتر لاکھ میں بکے۔ اس طرح سکھ قوم ایک کروڑ میں خریدی گئی۔ سکھوں نے حق خدمت ادا کر دیا مگر انہیں ملا کیا۔ ایک ذلت آمیز غلامی۔ پاکستان بھارت کا بڑا دشمن قرار پایا۔ جہاں سکھوں کے تمام مذہبی مقامات پوری طرح نہ صرف حفاظت میں رکھے گئے بلکہ وہ آنے میں اور یاترا کرنے میں بھارت میں ان کے اکال تخت کی بار بار سخت بے حرمتی کی گئی۔ ان کے ساتھ کئے گئے معاہدے کا پھر کیا انجام ہوا۔ کشمیر کے بے بس اور مظلوم جب عقوبت خانوں میں پھڑپھڑائے اور ان کی سلاخیں خون سے سرخ ہو گئیں۔ باہر بھارتی فوج نزاع کے عالم کو جا پہنچی تو نہرو نے از خود استصواب رائے کی عرضداشت یو این او میں داخل کرا دی اس بین الاقوامی معاہدہ جو لیاقت نہرو معاہدہ کہلایا گیا اس پر ہندو نے عمل کیا جو خود اس کی خواہش پر ضابطہ تحریر میں لایا گیا تھا۔ پھر نون نہرو معاہدہ ہوا پھر پانی کی تقسیم پر ایوب خان نے کیا گیا عہد نامہ مگر اس سے روگردانی کر کے بھارت نے سلال ڈیم بنایا۔ اب سری نگر اور بارہ مولا کے درمیان ۱۹ میل چوڑی اور ۶۰ میل لمبی جھیل وولر پر وولر ڈیم بنایا جا رہا ہے۔ تاکہ دریائے جہلم کا پانی پاکستان کو نہ دے کر پنجاب کو سندھ کو بنجر بنایا جا سکے وہاں میری تنظیم نے حکومت مقبوضہ کشمیر کو الٹی میٹم دے دیا کہ اس ڈیم کو اڑا دیا جائے گا ہم پاکستان کے حصے کا پانی جو اللہ نے ہم کشمیریوں کو دیا ہے اپنے پیارے پاکستان کو اس حق سے محروم نہیں ہونے دیں گے۔ نتیجتاً کوئی کشمیری مزدور اس ڈیم کی تعمیر میں حصہ نہیں لے رہا لیبر یوپی اور بہار سے منگوانی پڑی ہے اب سکھوں کے خوف سے کہ ان کے حالیہ سیلاب جو ایک خطرناک منصوبہ کے تحت سکھوں اور پنجاب کو تباہ کرنے کے لیے بھاکڑہ ڈیم سے لایا گیا تھا اس ڈیم کے ایم ڈی کو سکھوں نے گولی مار دی سکھوں نے بھی وولر ڈیم کی بنا پر کھلی دھمکی دے دی لہذا کام وہاں بند پڑا ہے۔ اس کے بعد

شملہ معاہدہ کیا گیا یہ معاہدہ چونکہ سراسر بھارت کے مظالم کا نگہداشت ہے اور اسے قائد عوام نے جو ساری عمر خود کو تیسری دنیا کے ذہین ترین لیڈر منواتے رہے انہوں نے نوے ہزار قیدی سے بلیک میل ہو کر کیا تھا اس معاہدہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال عرض دوں گا تاکہ بات جیالوں کی سمجھ میں آ جائے ایک طاقتور آدمی ایک بچے سے لڑ پڑے اور اسے ایک معاہدہ پر مجبور کر دے کہ آئندہ جب میں تمہیں ماروں گا تم کسی اور کو مدد کے لیے نہیں بلاؤ گے بلکہ ہم خود ہی اس جھگڑے کا فیصلہ کریں گے اب بچہ جو کمزور ہے چھوٹا ہے اس معاہدہ کے تحت بندھ گیا اس سے رونے کا حق چھین لیا گیا ایک معاہدہ قائد عوام کے مشوروں پر تاشقند میں بھی ہوا تھا۔

جنرل ایوب خاں جو ایک اعلیٰ پایہ کے فیلڈ مارشل تو تھے محب وطن بھی تھے مگر سیاسی سوجھ بوجھ سپاہی کا مسلک نہیں ہوا کرتی لہذا یہی قائد عوام تھے جنہوں نے انہیں مشورہ دیا کہ کشمیر میں مجاہدین کی ایک جماعت داخل کر دی جائے بھارت نہایت بااصول لوگوں کا ملک ہے وہ انٹرنیشنل باؤنڈری کراس نہیں کریں گے۔ لہذا مجاہدین داخل ہوئے مجھے اس کی پیشگی اطلاع نہیں دی گئی۔ میں ان دنوں جامع مسجد سری نگر میں میر واعظ کے ہمراہ جو رشتہ میں میرے چچا تھے تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ چند دھماکے ہوئے تو میری بھی آنکھ کھل گئی میں گھس گیا اور پھر گھستا چلا گیا میں نے تائید غیبی سمجھی ایسے ہی ایک دستے کو پناہ دیئے ہوئے تھا ۲۷ جون ۱۹۶۵ء کو گھر سے دور ایک مقام پر جس کا نام کولپارہ ہے پکڑا گیا میرا مکان سری نگر سے چالیس میل دور وولر جھیل کے کنارے قصبہ ہانڈی پورہ میں تھا البتہ میری ایک خالہ سری نگر کے محلہ نورا میں رہتی تھی شیخ عبداللہ جن کے والد شیخ ابراہیم جو سری نگر ہی کے محلہ نوشہرہ میں سبزی بیچا کرتے تھے اور شیخ عبداللہ ٹیچر ہو گیا تو میر واعظ مولانا یوسف شاہ صاحب جو میرے چچا ہیں آزاد کشمیر کے صدر بھی رہے انہوں نے عوام میں اسے بڑے اعتماد سے متعارف کروایا۔ جب یہ پاپولر ہو گیا تو بک گیا۔ اس کے خریداروں نے میری خالہ کے بالکل متصل گھر بھی خرید کر اس کو دیا اور جب میں سری نگر کالج میں پڑھتا تھا تو فاروق عبداللہ

میرا اہم مکتب تھا۔ بلا کا شرابی بدکردار مگر کند ذہن تھا۔ ہاں تو عرض کر رہا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے اور پاکستانی ایجنٹ قرار دے کر سری نگر کے خوفناک ترین انٹروگیشن سیل باغ مہتاب سیل نمبر ۱۶ میں بھیج دیا گیا وہاں غلام قادر رڈوگرہ کا ندھڑ بلی جیسے سفاک اور مشہور ترین ایس پی کے حوالے کر دیا۔ غلام قادر رڈوگرہ پولیس میں ملازم تھا اور پانچ جماعت پاس کر کے حوالدار بن گیا تھا اور اپنے ظلم کی وجہ سے پورے کشمیر میں جانا جاتا ہے اس نے آتے ہی میرے ناخن اور پاؤں کے ناخن تار کاٹنے والے پلاس سے اس بے دردی سے کاٹے کہ پتھر کی دیواریں بھی اس بربریت پر لرز دی ہوں گی یہی حال دوسرے مجاہدوں کا بھی ہوا پھر ہم جو درد سے بے حال تھے۔ ہماری پتلونوں کے پائنچے باندھ کر بھوکے چوہے چھوڑ دیئے گئے رات بھر ہم اس دوہرے عذاب میں رہے۔ صبح ہم سے پوچھا گیا کہ بتاؤ پاکستانی دہشت گرد کہاں ہیں مگر علم چونکہ صرف مجھے تھا باقی یہ بات نہ جانتے تھے لہٰذا وہ مجھ سے اس شدید بربریت کے باوجود یہ سب نہ پوچھ سکے۔ پھر جب میرا جواب نفی اس قادر یار کو ملا تو اس نے پسی ہوئی مرچیں ہمارے ناخنوں پر ڈلوا دیں۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میرے مالک اگر امتحان لیا ہے تو کمزور اور بے بس کو ہمت بھی عطا کر جولائی کا باقی مہینہ ہم نے قادر جو خود کو قادر مطلق سمجھتا تھا اس کی تحویل میں گزارا۔ باقی مجاہدین چونکہ مجھ سے پھر الگ کر دیئے گئے تھے لہٰذا ان کا علم پھر مجھے کبھی نہ ہونے پایا شہادت ملی فرار ہوئے کہ غازی ہی رہ گئے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ جب بھارت نے ہر معاہدہ کو بالائے طاق رکھ یہ جانتے ہوئے کہ کشمیر بس جا پایا ہے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے لاہور پر حملہ کر دیا تو مجھے بھی سری نگر سے جموں منتقل کر دیا گیا۔ سیل نمبر ۱۶ مہتاب باغ سری نگر میں جو دن گزارے وہ قیامت سے کم نہ تھے۔ میں ان کے منہ سے جب وہ مجھ سے سوال کرتے تھے جب لفظ پاکستان سنتا تھا تو جسم میں ایک فرحت کا احساس سا دوڑتا تھا راتوں کو وہ جب مجھے ادھموا کر کے ایک زمین دوز اندھیری کوٹھڑی میں پھینک جاتے تو میں پاکستان کی فتح کے خواب دیکھا کرتا تھا مجھے ایسے لگتا کہ ابھی ابھی جیل کا دروازہ کھلے گا اور پاکستانی

فوجی جوان لوٹ سجاتے میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے دیوانی صاحب آپ تو بے حد زخمی ہیں آیئے پہلے ہسپتال چلیں پھر مجھے گرم دودھ پلا کر نرم ترین بستر پر لٹا دیا جائے گا۔ اس طرح کے خواب سجائے زانوں کر اونگتا ہوتا صبح پھر وہ مجھے مارنے لے جاتے۔ آپ کو میرے پاگل پن پر شاید یقین نہ آئے قادر یار اکثر پاکستان کو گالیاں دیا کرتا تھا ایک دن اس نے گالی دی وہ میرے قریب ہی بیٹھا تھا میں نے پوری قوت سے اپنے خون آلود ہاتھ سے ایک مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ ان لوگوں نے کیا کیا میں نے تو آنکھ اپنی اس اندھیری کوٹھڑی میں کھولی جہاں فرش پر میرے اور نہ جانے کن کن مجاہدوں کے خون کی بو مجھے اور زیادہ پریشان کر دیتی۔ میں بے حد کمزور ہو گیا سوائے گرم پانی کے یا نمکین دلیئے کے کچھ نہیں کھا سکتا تھا میرا منہ پورا کھل ہی نہ سکتا تھا ستمبر ختم ہونے تک مجھے جموں جیل میں رکھا گیا پھر کشمیر کی خوفناک ترین جیل کٹھوعہ جیل منتقل کر دیا گیا کٹھوعہ جیل اور کٹھوعہ از خود پورا علاقہ سانپوں اور بچھوؤں کے لیے مشہور ہے۔ آپ یقین کریں کہ جیل کے ہر کمرے میں سانپ اور بچھو لاتعداد چھوڑے گئے آج کل وہاں سکھ حریت پسندوں کو رکھا جاتا ہے۔ سیل یعنی وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ اس کے ایک کونے میں زمین سے چار فٹ اونچا اور ساڑھے تین فٹ لمبا ایک فٹ چوڑا ایک تھڑا بنایا گیا تھا جس کی دیواریں ایک خاص قسم کے تیل سے چپڑی ہوئی تھیں۔ بچھو اور سانپ ان پر چڑھنے کی کوشش کرتے مگر پھسل جاتے ان سانپوں اور بچھوؤں کو باقاعدہ خوراک دی جاتی۔ تھڑا چونکہ بہت چھوٹا تھا لہٰذا اڑھائی ماہ میں نے اس پر بیٹھ کر اونگھ کر گزارے اور لیٹ کر نہیں سویا۔ دن میں ایک بار وہ صرف ایک گھنٹے کے لیے مجھے باہر نکالتے اور میں باہر نکل کر بھی زمین پر لیٹ جاتا جب پریم ناتھ سپرنٹنڈنٹ جیل تبدیل ہو گیا اور ایک سکھ جیلر وہاں آیا تو اس نے مجھے دن بھر باہر جیل کی چار دیواری کے اندر رکھنے کا حکم دیا صرف رات کو ہی وہاں بند کیا جاتا جو میں جاگ کر گزار لیتا۔ اپنے دکھوں کی وہ داستان پھر کبھی گوش گزار کروں گا۔ سر دست مجھے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہندو اور عہد نامہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اب چونکہ سارک کانفرنس میں کشمیر سیاچن گلگت اور دیگر اہم مسائل

جن میں افواج میں کمی ڈیفنس بجٹ میں کمی زیر بحث نہیں لائی گئی البتہ ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ پاکستان سے لیا گیا۔ یہ معاہدہ اگر نہ بھی ہوتا تو بھی بھارت پاکستان کے چھوٹے سے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا حالانکہ اسرائیل اور روس دونوں نے ایسا کرنے کے لیے دباؤ بھی ڈالا اور وسائل مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا مگر بھارت جانتا تھا کہ اسی ایک پلانٹ کے بدلے پھر کیا کچھ اور کتنے پلانٹ گنوانے پڑتے۔ لہٰذا یہ معاہدہ سراسر بھارت کی جیت ہے اور اس نے عوامی دور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک دشمن اجازت سے پاکستان آرمی کو اس کے کئی اقدام کے جواب میں پابند کر لیا ہے۔

دوسرا معاہدہ ڈرگ کا ہے۔ ڈرگ یا تو پاکستان اور افغانستان کے درمیان پیدا ہوتی ہے جسے وزیرستان کہا جاتا ہے وہاں سے باروش سے اس کے ایجنٹ یورپی اور اسلامی ممالک کے لیے لاتے ہیں۔ پاکستان محض گزرگاہ ہے یہ درست ہے کہ دریا جہاں سے گزرتا ہیں وہاں کی جگہ بھی گیلی ہوتی ہے نہریں کھود کر پانی ادھر ادھر لے جایا جا سکتا ہے گر اسے امریکہ اور یورپ کے لیے بھیجا رہا ہے۔ درمیان سے بھارتی بیوپاری اسے لے اڑتے کی ملی بھگت سے بھارت لے جاتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی ۹۰ فیصدی بھارتی تھا اب حکومت رینجرز پر دباؤ بڑھا کر اسے بھارت جلنے سے روکے گی۔ امریکہ اور یورپ نے اپنے آنے والے تمام راستے جدید الیکٹرونک مشینری پاکستان کو فراہم کر کے دباؤ دے کر بند کرا رکھے ہیں اب اس سیلاب کو جو شمال مغرب سے آ رہا ہے اپنی ہی کھیتیاں اجاڑنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ پاکستان پولیس کا کردار اچھی طرح واضح ہے۔ تیسری بات دہشت گردی کو روکنا۔ دہشت گردی کی ہم بھی مذمت کرتے ہیں مگر قوموں کا دوسری قوموں سے ظلم اور ناانصافی کی بنا پر آزادی کی خواہش کو دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس معاہدہ کی رو سے عوامی حکومت سکھوں کے معاملات کو سکار ڈ سمجھنے لگی ہے سکھ قوم جو ڈھائی کروڑ کی تعداد میں انڈیا میں رہتی ہے ہم کشمیری مسلمانوں کی طرح بھارت سے حق خود ارادیت طلب کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ ہماری طرح ان سے بھی معاہدہ کیا گیا تھا جو تارا سنگھ پٹیل معاہدہ کہلاتا تھا کہ تمہیں مسلمانوں کو قتل کرنے کے عوض خالصتان عطا کیا جائے گا۔

سال محرومیوں کے بعد وہ اپنا حق مانگتے ہیں تو یہ دہشت گردی نہ ہوئی ان کے جائز حق کا غصب ہوا۔ پاکستان پر الزام لگایا جاتا تھا کہ سکھوں کو اکساتا ہے۔ ہتھیار فراہم کرتا ہے ٹریننگ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ بھارت کے اندرونی معاملے میں مداخلت ہے میں کہتا ہوں کہ تامل وریلوں منیر ورام کے باسیوں کو گورکھوں کو، ناگالینڈ میں بسنے والے مجبور عوام کو کشمیری حریت پسندوں کو کیا پاکستان اسلحہ ٹریننگ مہیا کرتا ہے۔ ان لوگوں کو کس نے اکسایا۔ مجیب الرحمان اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود کیا کر لیتا کیا بھارت کو زیادہ مراعات دے ڈالتا وہ خطرہ تو آج بھی پاکستان کو درپیش ہے ایک موثر ایلائنس مغربی پاکستان کی جماعتیں مل کر بنا سکتی تھیں جو ایک موثر دباؤ سے اسے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتیں تھیں جیسے آج پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد کی شکل میں موجود ہے جس دن ڈھاکہ فال ہوا میں سری نگر جیل میں تھا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے اندرا گاندھی نے بڑے فخر سے آکاش وانی کے ریڈیو سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دو قومی نظریہ خلیج بنگال سمندر میں غرق کر دیا گیا ہے ہم جیل میں تھے۔ جنگ کی صورت حال سے بے خبر جس دن اچانک یہ خبر سنی میری امید وطن کے چراغوں میں سے ایک چراغ اور بجھ گیا لگتا تھا میں اندھیرے میں پھینک دیا گیا ہوں کہ یہ کشمیر کیا لیں گے آدھا ملک گنوا دیا۔ میں نے جذبات میں شرابور ہو کر بیرک کے اندر ہی پوری قوت سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا دیا۔ میرے ساتھیوں نے بھی نعرے لگائے۔ جس کی قیمت مجھے اگلے ہی دن چکانی پڑی۔ مولوی فاروق میرے ساتھ ہی بیرک میں بند تھا ہر وقت اپنے بچوں کو یاد کر کے جتنے شعرا سے یاد تھے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے گھبراتے ہی تحریر دے دی کہ وہ حکومت ہند کا وفادار رہے گا اس کے ساتھیوں کو اس کی رہائی کی اطلاع دے کر اسے رہا کر دیا گیا۔ جو اسے پھولوں کے ہار پہنا کر لے گئے اور میں بری بیڑیاں لگا کر ایک ماہ سزا اور بڑھا کر دوبارہ بند کر دیا گیا۔ بات دہشت گردی کی مذمت کی ہو رہی تھی راجیو گاندھی نے سری لنکا مالدیپ اور مشرقی پاکستان کے صدر کے سامنے جانے کس ضمیر سے دہشت گردی کی مذمت کی تھی۔ ہم بھی پوری قوت سے دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں مگر نہایت ادب سے جناب راجیو سے پوچھتے ہیں

کہ مکتی باہنی اور شانتی باہنی کو کس نے ٹریننگ دی کس نے اس کو ہتھیار فراہم کیے؟
مسلمان آزاد ریاست میں مداخلت کا سبب کون بنا۔ سری لنکا کے چائے کے باغات
مزدوری کے سبب بسنے والے تاملوں کو ٹریننگ اور اسلحہ کس نے فراہم کیا کس نے ز
سری لنکا میں گھسنے پر آمادہ کیا۔ وہ امن پسند غریب ملک بارود کا ڈھیر کس نے بنایا۔
جب پاکستان سے باقاعدہ معاہدہ کے تحت تربیت یافتہ سری لنکا کے فوجی باغیوں کو کچ
دینے میں عین کامیاب ہونے والے تھے تو آپ نے اپنی فوج وہاں داخل کر دی تاکہ
کبھی کسی ساورن کے وہاں پیدا ہونے کے امکان کو ختم کیا جا سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ
ڈھائی کروڑ برہمن نوے کروڑ دوسری اقوام پر ظلم اور جبر سے حکومت کر رہے ہیں
صدیوں سے محکوم رہنے کے سبب ان میں احساس تحفظ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا تھا اور اس
عدم تحفظ نے وشال بھارت اشوکا اور چندر گپت موریہ کے ہندوستان کا تصور بخ
جس میں بقول ان کے افغانستان بھی شامل ہے۔ پاکستان میں حکومت جیالوں کی ہو یا
بیماروں کی بھارت کسی کے لیے بھی اپنی اس اکھنڈ بھارت کے تصور کو ختم نہیں کرنا
ان کی اربوں کی انوسٹمنٹ بے پناہ فوجی اور دیگر حربی طاقت کا حصول اور کسی مقصد کے
لیے نہیں ہاں غلط فہمی یا خوش فہمی دوسری بات ہے۔ جب تک پاکستان اپنے قدموں پر
قائم ہے یہاں کوئی حکومت آجائے بھارت کے ساتھ امن دوستی کا پرچار دھوکہ د
کی سنگین ترین شکل کے سوا کچھ نہیں۔

تاملوں کو ٹرینڈ کیا گیا ایک الگ ملک کا تصور دے کر جب اپنے مقاصد پوری ط
سے حاصل کر لیے گئے تو انہیں تاملوں کو جن سے معاہدہ پایا تھا بھارتی فوج پوری قوت سے کچ
میں مصروف ہے۔ یہی کچھ مالدیپ کے ساتھ کیا گیا ایک خفیہ مشن کے ذریعے تاملوں کو خا
تربیت دے کر مالدیپ میں داخل کر دیا گیا۔ پلان اتنا مکمل تھا کہ خلیج میں معمول کی
گشت سے وکرم اور کرشن نامی جہازوں کو مالدیپ بھیج دیا گیا۔ بھارتی جیالے اب بھی
وہاں موجود ہیں اور مالدیپ کے عوام اپنی مسلمان خواتین کی بے حرمتی سہنے اور دیکھنے پر
مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ہم بھی راجیو گاندھی کے اعلان کے مطابق بڑی شدت سے دنا

برائی کی مذمت کرتے ہیں سب سے پہلے سکم پھر بھوٹان پھر نام نہاد دلائی لامہ کا تبت
ریزی پاکستان پھر سری لنکا اور آخری شکار مالدیپ۔ پاکستان کو دیکھیے کونسا مزید
دریا اس کے لیے روا رکھا جائے گا۔ اگر مشرقی پاکستان کی موجودگی میں جبکہ سول سیکرٹریٹ
پاکستان کے جھنڈے سے مزین ہو پی آئی اے کا ہوائی اڈہ بھی بدستور کام کر رہا ہو اور
ہوٹل کے ایک کمرہ میں بیٹھ کر بننے والے بنگلہ دیش کو بھارت جیسی سیکولر دہشت گردی
کی مہان آہنسا کی پجاری ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت روس سے دفاعی معاہدہ کے
باوجود اقوام متحدہ کی ممبر حکومت اگر اسے تسلیم کر سکتی ہے تو ہم بھی خالصتان کو قبول اور
منظور اور تسلیم کر سکتے ہیں۔ پاکستان بھارت دونوں کے استحکام اور علاقائی سالمیت کی
ضمانت بفر سٹیٹ ہے جو دنیا کے نقشے پر ابھر کر رہے گی۔ بھارت میں پاکستان اور بنے
رہا کہ جو پہلے سکھ ہے بعد میں بھارتی یا پاکستانی ہے۔ اب اس بات پر تل چکا ہے کہ
خالصتان ہی اس کی منزل ہے اس ملک میں رہنے والے لوگ تحفظ کی شکل سے دوچار
ہو چکے ہیں۔ اخلاقی پستی کی انتہا کو چھو رہے ہیں مگر بڑی طاقت بننے کا اس کا خواب روز
افزوں ترقی پر ہے۔ صحرائے گوبی سے بکھرے ہوئے قبائل کو جمع کر کے ایک طوفان کی
طرح بغداد کا رخ کرنے والے چنگیز کو روکنے کی کوشش کرنے والے جلال الدین خوارزم
شاہ کو التمش والی ہند نے یہ کہہ کر بھگا دیا کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے مسلم دنیا کو اس کا نتیجہ بھی
جلد ہی معلوم ہو گیا تھا۔ ہمیں ایسی تاریخی غلطیاں بار بار نہیں دہرانی چاہئیں۔ بھارت میں باقاعدہ
والے اکھنڈتا کے حصول کے لیے کام کر رہے ہیں ہر بھارتی سفارت کار اسی کوشش
میں لگا ہے ہمارے ہاں جمہوریت آئی ہے۔ ہمیں ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت
ہے۔ اپنی دفاعی صلاحیتوں کو مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔ حب الوطنی کی ضرورت ہے۔
حکومت پاکستان کو میرے خیال میں بھارت سے کوئی بھی سودے بازی اس مسئلہ پر
نہیں کرنی چاہیے۔ وہ سیاچن پر قبضہ برقرار رکھ کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پھر
وہ چین سے تعلقات بنانا چاہتا ہے لہذا شاہراہ قراقرم کی حفاظت نہ خیانتوں سے کوئی
غرض نہیں۔ پاکستان کو اپنی پہلے سے موجود علاقائی تعاون کی تنظیم آر سی ڈی کو فعال بنا

کہ ایران اور ترکی سے دفاعی۔ اقتصادی اور معاشرتی معاہدے کرنے چاہئیں
اگر روس سے نام نہاد معاہدہ دوستی کر سکتا ہے تو ہمیں بھی امریکہ کو تھوڑا سا ناراض
چاروں مسلمان ملکوں کو الائنس بنانا چاہیئے اس طرح آہستہ آہستہ مسلمان م
تعداد بڑھ سکتی ہے۔ ایران عراق کے ساتھ اپنے تنازعات طے کر رہا ہے لہٰذا
ممالک پاکستان کی اس ضمن میں حوصلہ افزائی کریں گے۔ افغان جو خالص اسلامی ز
کر ابھرنے والے ہیں ترکی جو یورپ سے ٹیکنالوجی حاصل کرتا ہے ایران جو تیل کی
سے مالامال ہے ہمیں ماضی کے اپنے اصل روابط ہی زندہ رکھ سکتے ہیں۔ راجیو
کرنے کے لیے کشمیر ہاؤس کے بورڈ اتار کر کشمیریوں کو سڑکوں پہ ڈنڈے مار کر انہ
جیلوں میں ٹھونس کر ہم بھارت سے اپنا وجود نہیں منوا سکتے۔ وجود طاقت
منوایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً بھارت جیسی سرکار حکومت جو طاقت کے علاوہ کوئی زبا
نہیں سمجھتی۔ ہمارا اپنا اسلامی الائنس جب مضبوط ہوگا کشمیر ہمیں مذاکرات کی میز
مل سکتا ہے۔ ہم بھارت کی قید میں رہنے والے سی پی یو پی کے مجبور و مقہور مسلمانو
جو بیس کروڑ سے بھی متجاوز ہیں ہم انہیں تب ہی عزت سے زندہ رہنے کا حق دلا
ہیں۔ ہماری جواں سال عوامی قیادت ایک جھٹکے سے ان نفسیاتی بندھنوں سے آزاد
ہو کر ایک باوقار قوم کو اس احساس تحفظ سے عاری قوم کو نجات دلا سکتی ہے جاپان
اور کوریا نے ترقی یافتہ ہو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترقی صرف مغربی اقوام کا حصہ نہیں
پاس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہ تو ٹیلنٹ کی کمی ہے نہ ہی وسائل کی۔ اللہ نے اس
قوم کو شعور کے ساتھ ساتھ ہر اس دولت سے نوازا ہے جو ہمیں ہمارے اسلاف
قوت اور عزت عطا کر سکتی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب ہم یہ جرأت مندانہ فیصلے
قوم کو اعتماد میں لے کر کریں اپنی بقا کو یقینی بنائیں اپنے وقار کو بحال کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ
ہمیں کب تک اقتدار میں رہنا ہے۔ یہ سوچیں کہ ہمیں کیونکہ زندہ رہنا ہے۔

'را' آزاد ریاست بنانے کیلئے کوشاں

مقبوضہ کشمیر سے ملنے والی تازہ ترین اطلاعات کے مطابق حریت پسندوں اور
فوج کے درمیان زندگی اور موت کا معرکہ اپنے نقطہ عروج کو چھو رہا ہے۔
خوش آئند بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ پاکستانی حکومت نے اس مسئلے پر قدرے
سنجیدہ بھی لیا ہے گو کہ اس کے پس منظر میں بھی گذشتہ ۴۲ سال کے "تلخ حقائق
دباؤ اور سب سے بڑھ کر حریت پسندوں کی جان توڑ جدوجہد کارفرما ہے پاکستانی
وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو نے وزارت خارجہ اور داخلہ کو احکامات جاری کر دیئے ہیں
بھارت سے مذاکرات کا سلسلہ فوراً منقطع کر دیا جائے اور دونوں ممالک کے درمیان
سیکرٹریوں کی سطح پہ ہونے والے رابطوں اور اجلاس کو مقبوضہ کشمیر کی صورت حال میں
تبدیلیوں تک مؤخر کر دیا جائے۔

ان احکامات کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بھارت سیکرٹریوں کے اجلاس کو اپنے
مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور پاکستان پہ پنجاب اور مقبوضہ کشمیر
میں مداخلت کا الزام لگا کر دباؤ کی صورت حال پیدا کی جائے گی جیسا کہ بھارتی حکام
ماضی میں کرتے آئے ہیں۔ خیال رہے کہ گذشتہ دنوں ایوان صدر میں ہونے والے ایک
اجلاس کے دوران بعض اعلیٰ حکام نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مقبوضہ کشمیر کی موجودہ صورتحال
سے واضح ہو چکا ہے کہ بھارت کو معاملات اپنے ہاتھ سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس
صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھارتی انٹیلی جنس "را" نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ کہ

منقبوضہ کشمیر میں ایک نام نہاد آزاد ریاست قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو بظاہر آزاد ریاست ہو گی لیکن درحقیقت یہ بھارت کی طفیلی حکومت ہو گی پاکستان کو اس میں انتہائی محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے خیال رہے کہ حال ہی میں پاکستان کے خصوصی ایلچی مسٹر عبدالستار کے دورہ بھارت کے دوران بھارتی وزیر اعظم وی پی سنگھ نے اس ضرورت پر زور دیا تھا کہ مشترکہ کمیشنوں کے اجلاس بلانے کی تاریخیں طے کی جائیں کیونکہ افسران اس بات کے خواہشمند ہیں کہ دفاع اور داخلہ کے سیکرٹریوں کے درمیان اجلاس جلد از جلد منعقد ہوں بھارتی حکومت نے یہ عندیہ دیا تھا کہ دفاع کے سیکرٹریوں کے مذاکرات میں بھارت اس وعدے کا اظہار کرے گا کہ وہ اپنے فوجی ان چوکیوں سے ہٹائے گا جو دنیا کا بلند ترین اور سرد ترین میدان جنگ ہے پاکستانی خفیہ اداروں نے اس امر کا سگنل بھی دیا تھا کہ داخلہ سیکرٹریوں کی سطح پر ہونے والی بات چیت میں اس بات کا امکان ہے کہ بھارت کی طرف سے پاکستان میں موجود سکھوں کے تربیتی کیمپوں کی ایک فہرست بھی پیش کی جائے گی اور پر یہ الزام عائد کرتے ہوئے کہ پاکستان سے تخریب کار مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو رہے ہیں مشترکہ گشت کا تقاضہ کیا جائے گا۔

ایسے الزامات عائد کرنا جھوٹ بولنا اور اس بات کے بل بوتے پر اپنی قائم کرنا ہی بھارتیوں کا وطیرہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ کشمیر کی موجودہ صورت حال پر جموں لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان کا انٹرویو پیش ہے۔

سوال ... مسئلہ کشمیر نے ۴۷ء سے آج تک پاکستانی نقطہ نظر سے کیا اہمیت اور کیا موڑ اختیار کیا اس میں ہماری سیاسی جماعتوں اور حکومت کے کردار کا آپ کیا تجزیہ کریں گے؟

جواب ... مسئلہ کشمیر قیام پاکستان کے فوراً بعد سے کچھ مدت پہلے تک پاکستان کا اہم ترین قومی مسئلہ رہا لیکن گذشتہ تقریباً ڈیڑھ عشرے سے پاکستان کی حکومتیں اور کسی حد تک اس کی سیاسی پارٹیاں بھی اس مسئلے کو وہ اہمیت نہیں دے رہیں جو اس

سے پہلے دیتی تھیں اس تبدیلی کی ایک بلکہ سب سے اہم وجہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا دولخت ہونا ہے۔ جس کے نتیجے میں بھارت کو پاکستان پر تقریباً ہر لحاظ سے برتری حاصل ہو گئی ہے اور پاکستان کی حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں بھارت سے کسی قسم کے تصادم کو پاکستان کی سالمیت کے لیے ایک بڑا خطرہ تصور کرتی ہیں مسئلہ کشمیر سے پاکستان کی سرد مہری کی دوسری وجہ اس مسئلے کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی عدم توجہی ہے جو بھارت کی انتہائی شاطرانہ ڈپلومیسی پاکستان کی اپنی غلط پالیسیوں اور کشمیری لیڈروں کی کوتاہ بینیوں اور اقتدار پرستی کا نتیجہ ہے بھارت نے اپنی شاطرانہ سفارتی سرگرمیوں کے ذریعہ دنیا کو یہ تاثر دیا ہے کہ کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہے۔ اور کشمیر کے عوام بھی نام نہاد کشمیر کے بھارت سے الحاق کو حتمی سمجھتے اور اس کی حمایت کرتے ہیں بھارت دنیا کے سامنے اول الذکر استدلال کے سلسلے میں مہاراجہ کشمیر کی طرف سے بھارت سے الحاق اور بعد میں نام نہاد کشمیر اسمبلی کی طرف سے اس کی توثیق کو ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے جبکہ مؤخر الذکر استدلال کے ثبوت میں وہ کشمیر کے شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کو پیش کرتا رہا ہے جو کشمیر کے نام نہاد انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتتے رہے ہیں اور کشمیر کے بھارت سے نام نہاد الحاق کو حتمی قرار دیتے ہیں بھارت کے یہ بے بنیاد استدلال بین الاقوامی سطح پر کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا اندازہ درج ذیل دو مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران نیویارک میں مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ اور سفیروں سے ملتا رہا اور انہیں مسئلہ کشمیر سے متعلق اصل حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ان میں سے کچھ تو مسئلہ کشمیر کی تفصیلات سے بالکل بے خبر اسے بھارت اور پاکستان کے مابین ایک علاقائی تنازعہ سمجھتے تھے اور کچھ کا کہنا تھا کہ کشمیر کا بڑا حصہ بھارت کے پاس ہے وہاں باقاعدگی سے انتخابات ہوتے ہیں اور ان انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتنے والی پارٹیاں کشمیر کے بھارت سے الحاق کو حتمی سمجھتی ہیں مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا

کہ بہت سے مسلمان ملکوں کے نمائندے بھی بھارت کے اس پروپیگنڈے سے متاثر تھے۔ مئی ۱۹۸۰ء میں اسلام آباد میں ہونے والی مسلم وزراء خارجہ کانفرنس کے دوران میں سینیگال کے وزیر خارجہ جو اس کانفرنس کی ڈرافٹ کمیٹی کے چیئرمین تھے سے میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مسئلہ کشمیر کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کر کے کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حق میں ایک قرارداد کانفرنس میں پیش کریں۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ اس قسم کی قرارداد کسی دیگر ملک کی طرف سے پیش ہونی چاہئے میں ڈرافٹ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایسی قرارداد پیش کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کا سب سے بڑا لیڈر شیخ محمد عبداللہ ہے اور اس کی پارٹی نے حال ہی میں کشمیر کے انتخابات میں ۶۰ فیصد ووٹ حاصل کئے ہیں اور وہ بھارت سے کشمیر کے الحاق کو حتمی قرار دیتا ہے۔ اسکے مقابلے میں آپ کے پاس اپنے نظریئے کے حق میں کوئی بڑا عوامی مینڈیٹ نہیں ان حقائق کے پیش نظر مجوزہ آپ کے مطالبے کا کیا جواز ہے میں نے ان سے کہا کہ روڈیشیا کے بشپ موزرلوا اور اس کی پارٹی نے وہاں کے انتخابات میں ۶۸ فیصد ووٹ حاصل کئے تھے کیا آپ بشپ موزرلوا کو روڈیشیا کے عوام کے حقیقی لیڈر اور ان انتخابات کو رائے عامہ کا حقیقی نقشہ تصور کرتے ہیں اس پر اس نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا کہ بشپ موزرلوا تو نسل پرست آئن سمتھ کا ایجنٹ ہے اور وہ انتخابات سراسر فراڈ تھے میں نے کہا بالکل اسی طرح شیخ محمد عبداللہ توسیع پسند بھارت کا کٹھ پتلی ہے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے نام نہاد انتخابات بھی ایک بڑا فراڈ ہوتے ہیں جس کی تصدیق خود بھارت کے باضمیر اخبارات اور افراد کرتے ہیں اس پر وہ خاموش ہو گئے بہرحال پاکستان کے ایک دوست اور ایک اہم اسلامی ملک کے وزیر خارجہ کے اس استدلال سے بھارتی پروپیگنڈے کے اثرات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کے بارے میں پائی جانے والی سرد مہری کی دوسری وجہ خود پاکستان کی انتہائی ناقص کشمیر پالیسی رہی ہے۔ پاکستان ابتداء سے ہی انتہائی

کمزوری اور نااہلی کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے اقدامات کرتا رہا جس کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر جو بنیادی طور پر ایک کروڑ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا مسئلہ ہے آہستہ آہستہ بھارت اور پاکستان کے مابین ایک قطعہ زمین کی ملکیت سے متعلق ایک تنازعے کی صورت اختیار کر گیا اور عالمی رائے عامہ دو ملکوں کے مابین علاقائی تنازعات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے بھارت و پاکستان کی ناکامی جن کی بنیادی وجہ بھارت کی ہٹ دھرمی اور پاکستان کی کچھ غلطیاں تھیں) کے بعد اس عالمی ادارے کے کچھ نمائندوں (سر اوون ڈکسن ڈاکٹر گراہم اور گنار جیرنگ) کی کوششیں بھی بھارت کی ہٹ دھرمی اور پاکستان کی کچھ غلطیاں پاکستان کی ان تمام غلطیوں کا اعتراف بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں شائع ہونے والے مسئلہ کشمیر کے بارے میں سرکاری وائٹ پیپر میں کیا گیا ہے۔ کی وجہ سے ناکام ہو گئیں اقوام متحدہ کے آخری نمائندے نے اپنی رپورٹ میں مسئلہ کشمیر کے حل نہ ہونے کی پوری ذمہ داری بھارت پر ڈالی تھی۔ لیکن پاکستان اس رپورٹ سے استفادہ کرنے میں ناکام رہا۔ ۱۹۸۰ء میں مجھے اقوام متحدہ میں متعین سب سے سینئر امریکی صحافی (جو ۱۹۴۶ء) سے اقوام متحدہ سے منسلک ہیں اور مسئلہ کشمیر پر ہونے والی بحثوں اور دیگر سرگرمیوں کی تفصیلات کے بارے میں حیران کن حد تک باخبر ہیں) نے بتایا کہ اقوام متحدہ کے آخری نمائندے کی یہ رپورٹ سلامتی کونسل کے ریکارڈ سے ہی غائب کر دی گئی ہے۔

۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے دوران بھارت نے امریکہ کے صدر کینیڈی کے ذریعہ پاکستان سے کہلوایا کہ اگر اس جنگ کے دوران پاکستان بھارت کی مشکلات میں اضافہ نہ کرے تو بھارت جنگ کے بعد مسئلہ کشمیر کا منصفانہ حل تلاش کرنے کے لیے پاکستان سے بامقصد سنجیدہ اور پرخلوص مذاکرات کرے گا۔ پاکستان نے امریکی دباؤ کے تحت) یہ تجویز منظور کر لی اور چین بھارت جنگ کے خاتمے کے بعد مسئلہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے درمیان وزارتی سطح پر مذاکرات کے

پانچ راؤنڈ ہوئے ان مذاکرات کے دوران سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ پاکستان مسئلہ کشمیر پر اپنے سابقہ موقف (کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت) سے عملاً دستبردار ہوگیا ان مذاکرات کے ابتدائی راؤنڈ میں ہی دونوں وفد اس بات پر متفق ہوگئے کہ مذاکرات کے دوران اس مسئلے کا حل کشمیریوں کے حق خود ارادیت یا کشمیر میں رائے شماری کی بجائے کچھ لو کچھ دو کے اصول کی بنیاد پر تلاش کیا جائے گا۔ چنانچہ پاکستان نے ابتدا میں ہی پیشکش کی کہ صوبہ جموں کے ہندو اکثریتی اضلاع بھارت لے لے اور ریاست کا باقی حصہ پاکستان کو ملے اس کے برعکس بھارت نے پیشکش کی کہ کشمیر میں حد متارکہ جنگ میں کچھ معمولی سی تبدیلیاں کرکے اسی کو پاک بھارت سرحد بنایا جائے مذاکرات کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ فریقین کے موقف کے درمیان خلیج بھی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک مرحلے پر بھارتی مقبوضہ کشمیر میں دریائے جہلم کو پاک بھارت سرحد بنانے کی تجویز بھی سامنے آئی یہ تجویز پاکستانی وفد کے ایک ممبر نے غیر رسمی طور پر (غالباً فیلہ کے طور پر) پیش کی تھی اس تجویز کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ بھارت کو پورا صوبہ جموں (بھارتی مقبوضہ) کے علاوہ وادی کشمیر کا دریائے جہلم کے جنوب والا علاقہ بھی مل جاتا یہاں تک کہ وادی کشمیر کے تمام اہم شہر سری نگر، سوپور، بارہمولہ بھی بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوجاتے کیونکہ دریائے جہلم ان تینوں شہروں کے درمیان سے گزرتا ہے پاکستان کی طرف سے کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر مسئلہ کشمیر اصولوں کا یہ سودا ایک انتہائی قابل افسوس قدم تھا بہرحال خوش قسمتی سے یہ مذاکرات بھی بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوگئے اور کشمیر ایک انتہائی غیر قدرتی غیر فطری اور غیر منصفانہ طرز پر ہمیشہ کے لیے تقسیم ہونے سے بچ گیا لیکن ایک طرف دنیا کو یہ تاثر ملا کہ پاکستان کشمیریوں کے حق خود ارادیت میں دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی کے مصداق بھارتی مقبوضہ کشمیر کا کچھ حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف محب وطن کشمیریوں کے دلوں میں بھی حکومت پاکستان کے بارے میں شکوک شبہات پیدا ہوگئے جواب بین الاقوامی سطح پر جہاں بھارت کے سفارتی مشن کشمیر میں بھارت کی ننگی جارحیت پر پردہ ڈال کر مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے غلط موقف کو انتہائی خوبصورت بنا کر

کر عالمی رائے عامہ کو متاثر کرتے ہیں وہاں پاکستان کے مشن کس طرح خواب غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال کا میں خود چشم دید گواہ ہوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی تیسری کمیٹی نے اپنے ۳۲ ویں اجلاس میں اپنے سپیشل رپورٹر کی ایک تفصیلی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد ان قوموں اور علاقوں کی ایک فہرست منظور کی جو اقوام متحدہ کی نظر میں حق خود ارادیت کے مستحق ہیں لیکن ابھی تک اس حق سے محروم ہیں اور اس رپورٹ کی منظوری کے بعد اسے ایک کتاب کی صورت میں اقوام متحدہ کی طرف سے شائع کیا گیا اس رپورٹ کا پبلی کیشن نمبر E/C.N-4/SUB-2/405 Vol.1 ہے حق خود ارادیت سے محروم قوموں کی اس فہرست میں ریاست جموں وکشمیر بھی شامل تھی اور نمبر شمار میں اس کا بارہواں نمبر تھا اور کتاب کے صفحات نمبر ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۸۳ میں مسئلہ کشمیر کے پس منظر اور اس سے متعلق حقائق درج تھے۔ یہ رپورٹ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی چنانچہ میں نے نیویارک میں اقوام متحدہ کی بک شاپ سے اس کی چند کاپیاں خریدیں چونکہ ۱۹۸۰ء کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس رپورٹ پر کھلی بحث ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے میں نے برطانیہ واپس آکر مسئلہ کشمیر کے پس منظر اس سے متعلق حقائق اور کشمیر کی صورت حال پر ایک مفصل رپورٹ تیار کرکے اس کا بیان اقوام متحدہ میں تمام ممبر ممالک کے سفیروں اور بہت سے وزراء خارجہ کو بھی بھیج دیں تاکہ وہ لوگ اس مسئلے کے اصل حقائق سے آگاہ ہوں اور جنرل اسمبلی اور تیسری کمیٹی میں اس پر مفصل بحث کے دوران انہیں مدنظر رکھیں ستمبر ۱۹۸۰ء کے اوائل میں دوبارہ نیویارک پہنچا اور اس رپورٹ کی کچھ اور کاپیاں خریدنے اقوام متحدہ کے بک شاپ میں گیا تو مجھے وہاں متعلقہ شیلف پر اس رپورٹ کی بجائے اس کی نظر ثانی شدہ رپورٹ شائع شدہ فروری ۱۹۸۰ء ملی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس نظر ثانی شدہ رپورٹ میں محکوم قوموں کی فہرست سے جموں وکشمیر غائب تھا اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے سپیشل رپورٹر نے لکھا تھا چونکہ بھارت کو اصل رپورٹ میں ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے کے اندراج

پر سخت اعتراض تھا اس لیے جموں و کشمیر کو اس رپورٹ سے خارج کیا جاتا ہے اس نوٹ کے ساتھ سیٹر رپورچار نے بھارتی سفیر کے خط کا متن بھی شامل کیا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا علم ستمبر ۸۰ء میں ہوا جبکہ نظرثانی شدہ رپورٹ فروری ۸۰ء میں شائع ہوئی تھی جب میں نے اس سلسلے میں پاکستانی مشن سے رابطہ قائم کیا تو یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ پاکستان کے سفیر یا سفارت خانہ کے کسی اور افسر کو اس انتہائی اہم دستاویز میں اتنی بڑی تباہ کن تبدیلی کا علم ہی نہیں تھا حالانکہ یہ تبدیلی سات ماہ قبل ہوئی تھی یہ ہے پاکستان کے سفارت خانوں کی کارکردگی کی ایک جھلک۔ میں نے ۸۶ء میں برطانیہ کے جیل سے اقوام متحدہ میں بھارتی مشن کی طرف سے اقوام متحدہ میں کشمیر سے متعلق ریکارڈ میں ایک اور انتہائی نقصان دہ تبدیلی کرانے کے بارے میں پاکستان کی وزارت خارجہ اور اقوام متحدہ میں پاکستانی مشن کو خط لکھے تھے لیکن وہاں سے مجھے خطوط کی رسید تک نہیں ملی۔

سوال... شملہ معاہدے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب..... پاکستان کا مسئلہ کشمیر سے متعلق سب سے زیادہ نقصان دہ اقدام معاہدہ شملہ تھا گو اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جون ۱۹۷۲ء کے اواخر میں بھارت اور پاکستان کے سربراہان حکومت کے مابین شملہ میں ہونے والے مذاکرات میں بھارت ایک فاتح اور پاکستان ایک شکست خوردہ فریق کی حیثیت سے شریک ہوا تھا اور مذاکرات کے اس کھیل میں ترپ کے تمام پتے بھارتی وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھے اس کے باوجود پاکستانی وفد نے پاکستان کے مفادات کا کامیابی سے تحفظ کیا اسے اس کے وہ تمام علاقے واپس مل گئے جن پر بھارت نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران قبضہ کیا تھا اور جنگی قیدی بھی لیکن جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے اس سلسلے میں پاکستانی وفد چاروں شانے چت ہو گیا۔ کچھ حلقوں کے اس الزام میں کوئی وزن نہیں کہ شملہ میں کشمیر کے بارے میں ایک خفیہ معاہدہ بھی ہوا تھا۔ کیونکہ معاہدہ شملہ بذات خود کشمیر کی فروخت کے مترادف ہے اس کے ساتھ کسی خفیہ معاہدے کی ضرورت ہی نہیں۔

معاہدہ شملہ میں کشمیر سے متعلق اندراجات کا لب لباب یہ ہے کہ دونوں ممالک

کے حالات معمول پر آنے کے بعد مناسب وقت پر دونوں ملکوں کے حکام دوطرفہ مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کا ایک دائمی حل تلاش کریں گے۔ جس کے بعد دونوں ملکوں کے سربراہان حکومت اس حل کی بنیاد پر اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔ لیکن جب تک یہ حل تلاش نہیں کیا جاتا اس وقت تک فریقین جموں و کشمیر میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران حاصل شدہ علاقوں پر قابض رہیں گے یاد رہے کہ اس جنگ کے دوران بھارت نے ریاست کے شمال میں پاکستان کے زیر کنٹرول وسیع علاقے پر قبضہ کیا تھا معاہدہ شملہ کے تحت ان علاقوں کے بھارت کے قبضے میں رہنے کے نتیجے میں ہی بعد میں بھارت سیاچین کے ایک وسیع علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

(۲) کشمیر میں حد متارکہ جنگ کا نام لائن آف کنٹرول رکھا جائے (حد متارکہ جنگ کی اصلاح سے یہ تاثر ملتا ہے کہ کشمیر میں عارضی طور پر جنگ بند ہوئی ہے جو کسی وقت بھی دوبارہ شروع ہو سکتی ہے جبکہ لائن آف کنٹرول کی اصطلاح خاص کر جبکہ فریقین نے اسے عبور نہ کرنے کا اقرار بھی کیا ہو، ریاست کی مستقل تقسیم کے سوا اور کیا مطلب رکھ سکتی ہے۔

(۳) فریقین مسئلہ کشمیر کو کسی بین الاقوامی ادارے میں نہیں اٹھائیں گے (جس کا مطلب ہے کہ پاکستان اس مسئلے کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرنے سے دستبردار ہو گیا)

(۴) کوئی بھی فریق لائن آف کنٹرول کو عبور نہیں کرے گا۔ (جس کا مطلب کم و بیش تنازعہ کراسے مستقل سرحد تسلیم کیا گیا۔ اور

(۵) فریقین کسی ایسی تنظیم کو ابھرنے نہیں دیں گے جس کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ (اس شق کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انقلابی نظریات اور پروگرام کی حامل کشمیری تنظیموں کو کچل دیا جائے۔)

اس معاہدے کی درج بالا مہلک شقوں سے بھی زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ اس میں نہ تو کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا کوئی ذکر ہے نہ ہی کشمیریوں کو جو اس مسئلے کے سب سے اہم فریق ہیں، فریق تسلیم کیا گیا ہے اور ایک کروڑ انسانوں کی قسمت کو بھارت اور پاکستان کی افسر شاہی اور سربراہان حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک کروڑ کشمیریوں سے اس سے بڑی دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے۔

پاکستان کے کچھ حلقے دعویٰ کرتے ہیں کہ معاہدہ شملہ نے سرد خانے میں پڑے ہوئے مسئلہ کشمیر کو پھر سے زندہ کر دیا اور یہ کہ بھارت سے مسئلہ کشمیر کا وجود تسلیم کرایا۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ معاہدہ شملہ کی درج بالا مہلک نوعیت کی نسبت تو اس مسئلے کا اپنی سابقہ نوعیت میں سرد خانے میں پڑا رہنا ہی بہتر تھا۔ جہاں تک بھارت کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے وجود کو تسلیم کرنے کا تعلق ہے مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت کی تشریح یہ ہے کہ پاکستان ریاست جموں و کشمیر کے جس حصے (آزاد کشمیر و گلگت بلتستان) پر قابض ہے وہ اسے بھارت کے حوالے کرے کیونکہ پوری ریاست جموں کشمیر بھارت کا آئینی حصہ ہے۔ بھارت مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان اور محب وطن کشمیریوں کی تشریح کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔

پاکستان کے ایسے ہی اقدامات نے مسئلہ کشمیر کو جو بنیادی طور پر اور خالصتاً ایک کروڑ کشمیریوں کے بین الاقوامی طور پر مسلمہ حق خود ارادیت کا مسئلہ تھا ایک ملا قائی تنازعہ کی شکل دے دی جس کے نتیجے میں بین الاقوامی برادری اس سے لاتعلق ہو گئی یہاں تک کہ پاکستان کے دوست ممالک بھی مسئلہ کشمیر پر بات کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس مسئلے کے بارے میں پاکستان اب عالمی رائے عامہ سے کس قدر محروم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر موجود ہونے کے باوجود پاکستان اس پر کونسل میں بحث کا مطالبہ نہیں کر پاتا کیونکہ معاہدہ شملہ کے تحت اس پر عائد پابندی کے علاوہ اسے کسی مثبت اور نتیجہ خیز قرارداد پاس کروانے کے لیے مطلوبہ تعداد میں کونسل کے ممبروں کی حمایت کی امید نہیں۔

سوال... کشمیری لیڈروں کو آپ اس صورت حال سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔؟

جواب اس صورتحال کی ذمہ داری ریاست کے دونوں طرف کے کشمیری لیڈروں پر بھی عائد ہوتی ہے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں وہاں کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت شیخ عبداللہ نے ڈوگرہ راج کے خلاف طویل جد و جہد اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۴ء تک دو عشروں کے دوران تقریباً پندرہ سال تک پس دیوار زنداں یا گھر پر نظر بند رہنے کے باوجود مجموعی طور پر بھارت کے کٹھ پتلی کا کردار ادا کیا۔ وہ اپنے اقتدار کے دوران ایک طرف تو ریاست کے محب وطن بھارت دشمن اور آزادی پسند عناصر کو بری طرح کچلتے رہے اور دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر بھی بھارت کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ شیخ صاحب اپنی اسیریوں اور نظر بندیوں کے دوران بھی کشمیر کے لیے واضح منزل کی نشاندہی کی بجائے مبہم مطالبات ہی کرتے رہے اور دوبارہ اقتدار ملتے ہی ان سے بھی دستبردار ہو کر بھارت کے گیت گانے لگے۔ مقبوضہ کشمیر میں برسر اقتدار آنے والے دوسرے لیڈروں بخشی غلام محمد جی ایم صادق میر قاسم فاروق عبداللہ اور جی ایم شاہ نے تو بھارت کی جی حضوری میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

جہاں تک آزاد کشمیر کا تعلق ہے ریاست کے اس علاقے کو آزاد کرا کر وہاں ایک انقلابی حکومت قائم کرنے کا بنیادی مقصد اس علاقے کو بیس کیمپ بنا کر ریاست کے باقی حصے آزادی کے لیے جد و جہد کرنا تھا لیکن ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی کے بعد ادھر کے لیڈر جنگ آزادی کو چھوڑ کر جنگ اقتدار میں مصروف ہو گئے اور تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کی سرگرمیاں سیاسی سطح پر زبانی جمع خرچ تک محدود ہو گئیں۔ آزاد کشمیر کی بڑی پارٹیوں میں سے کسی نے بھی جنگ آزادی کے اہم محاذوں یعنی مسلح جد و جہد کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جن چھوٹی تنظیموں نے ان اہم محاذوں پر جد و جہد کرنے کی کوشش کی ان کی بڑی جماعتیں ان کی مدد

کرنے کی بجائے ان کے راستے میں دیوار بن گئیں۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا
ہوگا کہ مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر سے متعلق موجودہ صورت حال کی ذمہ دار
پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری لیڈروں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

سری نگر کی گلیوں اور بازاروں میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے
بھارتی کٹھ پتلی فاروق عبداللہ کے بیان کے مطابق بھی پانچ ہزار بے گناہوں کو
پس دیوار زنداں کر دیا گیا ہے۔ یہاں افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑے گی کہ
اسلامی ممالک کا ردعمل ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے شاید ابھی تک ان
نے مسئلے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا یا پھر ان تک مسئلے کا صحیح ابلاغ نہیں ہو سکا
کچھ بھی رہی ہو لیکن اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ پاکستانی حکومت عالم
رائے عامہ کو خصوصاً اسلامی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرے اور اب وقت
آ گیا ہے کہ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد
عملی معاونت کرے۔

ہندو سامراج

بھارتی قیادت نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی سے جہاں پاکستان کی سالمیت کے لیے خطرات پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے وہاں اپنے دوسرے ہمسایوں کے لیے بھی بھارت خوف و دہشت کی علامت بن چکا ہے۔ بھوٹان اور سکم کو اس نے اپنے اندر ضم کر لیا ہے اور مالدیپ سری لنکا نیپال پر اپنے دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ ہوس ملک گیری کی خواہش بھارتی حکمرانوں کو آسٹریلیا کے ساحلوں تک لے ہے اور حال ہی میں فجی نامی چھوٹے سے ملک نے بھارتی سفارتکاروں پر سنگین الزامات عائد کر کے بھارتی حکومت کو اپنا سفارتخانہ بند کرنے اور فجی سے نکل جانے کے لیے کہا۔ نیپال کی بھارت نے معاشی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ مالدیپ میں خود ... کروا کے خود ہی "مدد" کا بہانہ بنایا اور اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ سری لنکا میں امن ... کرنے کے لیے گھس گیا لیکن اپنی ہی چال میں پھنس کر وہاں سے ذلت آمیز پسپائی کی اور واپس بھی لوٹ آیا۔

بنگلہ دیش بھارت کا خود ساختہ ملک ہے جس کے ساتھ اب بھارت ... گئی ہے۔ جنرل ضیاء الرحمٰن کو "را" کے ذریعے قتل کروا کر بھارت نے اب بنگلہ دیش میں بھی "بنگا بھومی" کے نام سے علیحدگی پسند تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔

خدا کے فضل اور بے پایاں رحمت سے اس خطے میں صرف پاکستان ہی ایک ملک ہے جو بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کرنے کی ہمت ہے جبکہ پاکستان کے خلاف سازشوں، ریشہ دوانیوں اور تمام تر عیاریوں کے باوجود بھارت کو ذلت کا منہ ہی دیکھنا پڑا۔ ان مضامین کا مطالعہ آپکو بھارتی سامراج کا اصل چہرہ دکھانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

پاکستان پر بھارتی حملہ؟

مطبوعہ: ۶ مئی ۱۹۸۸ء

گزشتہ تین ماہ سے مشرقی پنجاب میں سکھوں کی جدوجہد آزادی اور آزاد مملکت خالصتان کے حصول میں بہت شدت آگئی ہے۔ علیحدگی پسند سکھوں نے اپنے ذرائع سے بالآخر کار ہتھیار، راکٹ لانچر اور میزائل بھی حاصل کر لیے ہیں اور اب وہ بھارتی سی آر پی، بی ایس ایف فوج اور پولیس پر حملے کرنے لگے ہیں۔ صورت حال حکومت کے کنٹرول سے اتنی بے قابو ہو چکی ہے کہ اسے مجبور ہو کر سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے بھتیجے اور دربار صاحب کے ہیڈ گرنتھی بھائی جسبیر سنگھ اور دیگر سنگین نوعیت کے مقدمات میں ملوث سکھ لیڈروں کو جن میں خواتین بھی شامل ہیں اور جنہیں دربار صاحب پر بھارتی فوج کے حملے کے دوران گرفتار کیا گیا تھا جذبہ خیر سگالی کی آڑ میں رہا کرنا پڑا۔

بھارتی حکومت کو حسب روایت سکھوں کی تحریک خالصتان میں شدت پیدا ہونے میں بھی پاکستان کا ہاتھ نظر آیا ہے اور بھارتی وزیر داخلہ اور وزیر اعظم گزشتہ تین ماہ سے پاکستان کو سخت نتائج بھگتنے کی دھمکیاں بھی دیتے آ رہے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ حکومت پاکستان محض اپنی نیک نامی کی خاطر یا پھر اس خوف کے پیش نظر کہ بھارت کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔ برطانوی امریکی اور کینیڈین شہریت کے حامل سکھوں کو پاکستان آنے کی اجازت نہیں دیتی۔

ایسی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ سینکڑوں یورپی اور امریکی شہریت کے حامل سکھوں جن کا تعلق سکھوں کی مختلف تنظیموں سے ہے انہیں گزشتہ تین سال سے پاکستان

آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی محض اس لیے کہ یہ لوگ حکومت ہند کے خلاف ہیں۔ درخواست گزار پاکستانی سفارت خانوں میں جب ویزے کے لیے اپلائی کرتے ہیں تو ملتجیانہ کہتے ہیں کہ ان کا مقصد محض اپنے مذہبی مقامات کی یاترا ہے کیونکہ بھارت نے ان کا داخلہ ویسے ہی ممنوع کر دیا ہے لے دے کر ایک پاکستان ہی ایسا ملک رہ جاتا ہے جہاں ان کے تاریخی اہمیت کے مقدس مقامات ننکانہ صاحب، پنجہ صاحب اور ڈیرہ صاحب وغیرہ موجود ہیں اور ہر مذہب کے پیروکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی مقامات کو ایک نظر ضرور دیکھ لے۔

اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ یہ لوگ پاکستان آکر کوئی سیاسی مقاصد پورے کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے سیاسی مفادات پاکستان سے وابستہ نہیں۔ اگر حکومت محض بھارتی سرکار کو مطمئن رکھنے کے لیے ان لوگوں کی آمد پہ پابندی لگاتی ہے تو اس مقصد میں بھی اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی کیونکہ پاکستان کے خلاف الزام تراشیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ بھارتی حکومت نے پاکستان کو "ٹیررسٹ سٹیٹ" کی دھمکیاں بھی دینی شروع کر دی ہیں۔

بھارتی حکومت کے سیاسی اثر و رسوخ یا یورپی ممالک کی ڈگمگاتی جمہوریت کیونکہ بھارت جیسی منڈی کو ہاتھ سے گنوانے کا خطرہ وہ مول نہیں لے سکتے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو بھارتی حکومت نے اکثر ممالک میں خالصتان نواز سکھوں کا ان کی اپنی حکومتوں کے ہاتھوں ناطقہ بند کروا رکھا ہے۔

امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں تو خاص طور سے بھارتی سفارت خانے اس سلسلے میں خاصے سرگرم رہتے ہیں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ میں بھارتی سفارت خانے اور ان کے تنخواہ دار ایجنٹ سکھوں کی مقامی سرگرمیوں پہ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ سال جب میں برطانیہ گیا تھا تو وہاں کے ہر قابل ذکر گوردوارے میں بھارتی حکومت کی طرف سے حکومت پاکستان کے خلاف طبع شدہ اشتہارات پھینکے جاتے تھے اکثر اشتہارات میں ان دنوں یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستانی حکومت شہید گنج کو مسجد

بنایا کر رہی ہے اس کے علاوہ خالصتان کے مختلف قسم کے جعلی نقشے جن میں پاکستانی علاقے خالصتان میں شامل دکھایا گیا تھا یہ الگ بات ہے سکھوں کو اب برہمنی ذہنیت کا مکمل ادراک ہو چکا ہے اور وہ عموماً اپنی صفوں میں چھپے بھارتی ایجنٹوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں موقع ملنے پر وہ قوم کے ان غداروں کی خوب درگت بھی بناتے ہیں۔

اس سال بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سنگین ہو گئی ہے بھارتی حکومت پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ مختلف انگریزی اخبارات میں پاکستان کے خلاف اشتعال انگیز خبروں اور مضامین کی اشاعت کے پیچھے کارفرما ہاتھوں کو لندن کے باشعور شہری اچھی طرح پہچان چکے ہیں۔ کاش ہمارے سفارت کاروں کو بھی دشمن کی ریشہ دوانیوں کا ادراک ہو جائے اور وہ موثر سطح پہ ان کا جواب دے سکیں۔

پاکستان کے متعلق بہتر نظریات رکھنے والا ہر شخص بھارتی حکومت کو اپنا دشمن نظر آنے لگتا ہے خصوصاً جب سے سکھوں نے احساس کیا ہے کہ ہم ہیں اور اس سے پہلے ہندو نے بڑی ہوشیاری سے اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا تھا اور اب اس نے خود بھی ہندو کا کھیل دیکھ لیا ہے تو سکھ بھی بھارتی حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے ہیں اور انہیں پاکستان کے خلاف بھڑکانے کے لیے عجیب عجیب حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

۱۲ اپریل کو راقم الحروف برطانیہ میں مڈلینڈ کے ایک شہر لیسٹر کے گوردوارہ گورو تیغ بہادر میں موجود تھا جب پریتم سنگھ نامی ایک سکھ نے جو بھارتی حکومت سے اپنی دوستی کے لیے خاصی شہرت رکھتا ہے اچانک وہاں ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ پاکستان میں سکھوں کے گوردواروں کی بے حرمتی ہو رہی ہے اور گوشت کا استعمال عام ہے۔ یہ گوردوارہ خالصتان نواز سکھوں کے کنٹرول میں ہے اور زیادہ تر ایسے سکھ وہاں موجود تھے جو پاکستان اپنے مذہبی تہواروں پہ آتے جاتے رہتے ہیں وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے گو کہ ان لوگوں نے پریتم سنگھ کو تسلی بخش جواب دے دیا لیکن ایسی حرکتیں عموماً گوردواروں میں کانگریس نواز ہندو نما سکھ کرتے رہتے ہیں جس کی انہیں خاصی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے کیونکہ سکھ ان کی خوب درگت

بناتے ہیں لیکن یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

۱۳ ار اپریل بیساکھی کا تہوار تھا۔ بیساکھی کو سکھوں کے ہاں زبردست مذہبی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس روز سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ جی نے باقاعدہ سکھ پنتھ کا آغاز کیا تھا۔ اس مرتبہ کیونکہ دربار صاحب امرتسر میں ہیڈ گرنتھی سردار جسبیر سنگھ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے بھتیجے اور خالصتان حامی تھے جنہیں حال ہی میں حکومت ہند نے غیر مشروط طور پر رہا کیا ہے اس لیے اس بیساکھی پر جوش و خروش کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں آیا۔ اس موقع پر جہاں دنیا بھر میں موجود سکھوں کی نگاہیں بھائی جسبیر سنگھ کی طرف لگی ہوئی تھیں وہاں بھارتی حکومت کو بھی بھائی جسبیر سنگھ کی طرف دیکھنا پڑا۔ دربار صاحب کے ہیڈ گرنتھی کی طرف سے جاری کردہ کوئی بھی بیان طرفین کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا۔

بھارتی حکومت کو تو یہی امید تھی کہ اس نے رہائی دیتے وقت بھائی صاحب سے اگر کوئی سودے بازی کی تھی تو اس کا حق نمک وہ آج ہی ادا کر سکتے تھے دوسری طرف دو تین روز پہلے ہی پنتھک کمیٹی کی طرف سے یہ بیان جاری ہو چکا تھا کہ بھارتی حکومت سے سودے بازی کی کوشش کی گئی تو اس کے خطرناک نتائج بھگتنے ہوں گے اور سکھ پنتھ کسی لیڈر کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اس کی قربانیوں کا سودا کر سکے۔ دراصل حکومت ہند کو بھائی جسبیر سنگھ کے رہائی کے بعد کے بیانات سے کچھ خوش نہی پیدا ہو چلی تھی لیکن بیساکھی کے روز ۲ لاکھ کے مجمعے سے خطاب کرتے ہوئے بھائی جسبیر سنگھ نے کہا کہ سکھوں کے لیے سوائے اپنی علیحدہ مملکت کے حصول کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا اور وہ ہرگز اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ آزادی کے حصول کے لیے سرگرم سکھوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا اہتمام کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دنیا بھر میں موجود سکھوں کو جدوجہد آزادی تیز کرنے کا حکم بھی دیا بھائی صاحب کا یہ حکم نامہ ۲ اپریل کو لندن کے سب سے قدیم اور بڑے گوردوارے "سنگھ سبھا" ساؤتھ ہال لندن میں ہزاروں خالصتان نواز سکھوں کی موجودگی میں سٹیج سے پڑھ کر سنایا گیا۔

اس لمحے سکھوں کا جوش دیدنی تھا۔ ہزاروں کرپانیں فضا میں لہرا رہی تھیں اور اکال تخت کی آواز "خالصتان زندہ باد" کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ بعینہ صورت امرتسر میں تھی جہاں لاکھوں کی تعداد میں بسنتی رنگ کی دستاریں سجائے ننگی کرپانیں اور جدید ترین اسلحہ بردار سکھ عورتوں، مردوں اور بچوں نے خالصتان زندہ باد کے نعرے بھارتی سیکورٹی فوج کی موجودگی میں لگائے۔ ان نعروں کی گونج بیساکھی کے تہوار پر صرف بھارتی پنجاب بلکہ دنیا بھر میں پھیلے سکھوں کے گوردواروں میں سنی گئی۔

بیساکھی کے اس موقعے پر دنیا بھر میں سکھوں نے خصوصی مذہبی مجالس برپا کیں۔ جہاں گورو گرنتھ صاحب کی موجودگی میں لاکھوں سکھوں نے خالصتان کے لیے جنگ کرنے کے عہد کیے۔ خالصتان کے حصول کی جدوجہد میں مارے گئے سکھوں کے لیے برطانیہ بھر کے گوردواروں میں "اکھنڈ صاحب کا بھوگ" ڈالا گیا۔ خیال رہے کہ لندن کی فضا میں خاصی کشیدگی ہے جہاں خالصتان نواز سکھوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے خلاف ہندو اور ہندو نواز سکھ لابی خاصی سرگرم رہتی ہے۔ ان لوگوں کے آپس میں جھگڑے آئے روز کا معمول بنتے جا رہے ہیں اور اب صورت حال یہ ہے کہ برطانوی پولیس کو سکھوں اور ہندوؤں کے تہواروں پر سیکورٹی کے خصوصی انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔

بھارت نواز سکھوں اور ہندوؤں کو اس سلسلے میں سفارت خانے کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے اور بھارتی سفارت خانے کا پبلک ریلیشن سیکشن جو اصل میں بھارتی انٹیلی جنس "را" کا ذیلی دفتر ہے اس سلسلے میں خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بھارتی انٹیلی جنس نے برطانیہ میں اپنی بہت سے "پاکٹس" بنا رکھی ہیں اس سلسلے میں سفارت خانے کے علاوہ بھارتی خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں جن میں دو نام خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس فرض کی ادائیگی سنت نما ہندو بھی بطریق احسن کر رہے ہیں۔ خاص طور پر سنڈرلینڈ کے شہر کا ونٹری میں بھارتی وزیر داخلہ بوٹا سنگھ کے دست راست سنت بابا میاں سنگھ کا گوردوارہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ ایسے ہی ایک سنت

کو اس سے پہلے لندن میں سکھ قتل کر چکے ہیں جس کے بعد سے میاں سگھ زیادہ ہی محتاط ہو گیا ہے اور دہلی "پروگرام" "دھرم کرم" کے حوالے سے ہی انجام پاتے ہیں۔ پاکستان کے خلاف لابنگ صرف ایشیائی ممالک کے باشندوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بھارتی لابی نے مقامی پریس کو اپنے یہودی کرم فرماؤں کے توسط سے کنٹرول میں لے رکھا ہے۔ خاص طور سے روزنامہ "دی ٹائمز" کا رویہ مکمل نظر ہے۔ اخبار نے چند روز پیشتر مارچ کے آخری ہفتے میں اپنے ایک اداریے میں سکھوں کی بھارت میں معاندانہ کارروائیوں پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ بھارتی حکومت اب کوئی بھی انتہائی اقدام کرنے میں حق بجانب ہے۔ اسی اداریے کے بعد سے برطانیہ میں یہ افواہ زور پکڑ رہی ہے کہ بھارت مئی سے جون تک پاکستان پر حملہ کرے گا۔

ایک ریٹائرڈ سکھ فوجی آفیسر نے جو بھارت کے پالیسی ساز اداروں میں خدمات انجام دے چکا ہے اور آج کل خالصتان کی تحریک میں سرگرم ہے مجھے لندن میں بتایا کہ اخبارات اور فوجی مبصرین کے اندازوں کے برعکس بھارت سندھ، کشمیر یا پنجاب کے بجائے سیاچن پر حملے کا زور رکھے گا کیونکہ وسائل کی بہتات کی وجہ سے بظاہر بھارت کو اس فرنٹ پر برتری حاصل ہے اور اسے یہ بھی امید ہے کہ چین بہت سوچ سمجھ کر ہی اس لڑائی میں حصہ لینے کا فیصلہ کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو "واخان" میں موجود روسی افواج کے لیے ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع شاہراہ تک پہنچنا کوئی اہم مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے پاکستان کو اس محاذ سے آنکھیں بند کرنا نہیں چاہئیں۔ کیونکہ فوجی لحاظ سے کسی بھی علاقے کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملے کی افواہیں عموماً نومبر میں گشت کیا کرتی ہیں اس مرتبہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور بھارتی وزیر اعظم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات اور جنون کی حد تک خطرناک اسلحے کے حصول نے واقعی برصغیر کے عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ عین ممکن ہے بھارت سرکار کوئی انتہائی اقدام کر گزرے برطانیہ میں رہنے والے بھارت اور پاکستان کے باشندوں نے صورت حال کچھ بھی رہی ہو ذہنی

...ر پر خود کو مئی جون میں ہونے والی پاک بھارت جنگ کے لیے تیار کر لیا ہے اب دیکھنا ہے کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تحریک خالصتان سے متعلق اہم اطلاع یہ ہے کہ ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان نے خالصتان کونسل کی صدارت سے استعفیٰ دے ...یا ہے۔ گزشتہ سال ہی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق خالصتان کونسل میں بہت سی ...یں سننے میں آ رہی تھیں اور بیشتر سکھ راہنما ان کی قیادت پر مطمئن نہیں تھے۔ ببر خالصہ ...یت البتہ ڈاکٹر چوہان کو حاصل تھی جب ببر خالصہ نے بھی ان کی حمایت سے ہاتھ ...یا تو ان کے لیے اب سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ صدارت کے منصب ...ستعفی ہو جائیں صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ببر خالصہ کے راہنما کہتے ہیں۔ ...اب ہیں بیانات کی نہیں عمل کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب کی خالصتان تحریک سے ...ملی خدمات ناقابل چیلنج سہی۔ لیکن کوئی بھی برسر پیکار گروپ ان کی حمایت کے لیے ...ادہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر چوہان خالصتان کونسل سے استعفیٰ کے بعد اب ببر خالصہ کے لیڈر ...گرمیج سنگھ کو جو خالصتان جلاوطن حکومت کے وزیر اعظم بھی ہیں کونسل میں مرکزی ...یت حاصل ہو گئی ہے اس طرح بظاہر سکھوں کے برسر پیکار گروپ دو حیثیتوں میں ...ٹ گئے ہیں۔ سکھ یوتھ فیڈریشن کو اگر دربار صاحب کے ہیڈ گرنتھی بھائی جسبیر سنگھ ...حمایت حاصل ہے تو دوسرے گروپ پنتھک کمیٹی سے ہمدردیاں رکھتے ہیں۔ گزشتہ ...سے یہ کوشش جاری ہے کہ مشرقی پنجاب میں خالصتان کے لیے برسر پیکار تمام ...نگ گروپس جن کی تعداد ۲۰ ہے کا آپس میں اتحاد ہو جائے اور ان کی مرکزی کمان ...کر دی جائے لیکن بظاہر ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔

سکھ لیڈر شپ میں تبدیلی سکھ پنتھ کے لیے اس صدی کا سب سے اہم واقعہ ...اس سے پہلے سکھوں کی راہنمائی کے فرائض مذہبی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ...ہی انجام دیا کرتا تھا لیکن اب سکھ نوجوان نسل نے ادراک حاصل کر لیا ہے۔ ...ان کی کمان بوڑھی لیڈر شپ کے ہاتھوں میں ہی رہی تو مطلوبہ نتائج حاصل کرنے ...یں اگلی ایک اور نسل کو بھی قربانی کی بھینٹ چڑھانا پڑے گا یہی وجہ ہے کہ تمام

شمار ب گروپوں کی قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ حتیٰ کہ دربار صاحب کے بیڈ گر
بھائی جسبیر سنگھ کی عمر بھی بمشکل ۲۸ سال ہے اور شاید وہ سکھ تاریخ میں سب سے کم عمر
گرنتھی رہے ہوں۔

سکھ یوتھ فیڈریشن کے راہنما ڈاکٹر جسبیر سنگھ رائے سکھ نوجوانوں میں مقبول تر
شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر رائے پیشے کے لحاظ سے ایک ماہر ای این ٹی سرجن ہیں اور فیڈریشن
میں انتہائی حساس اہمیت کی پوسٹ پر بھی فائز ہیں۔ موجودہ صورت حال کے حوالے سے
میں نے ان سے جو گفتگو کی وہ کچھ یوں تھی۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب دنیا بھر میں یہ تاثر عام ہے کہ خالصتان نواز سکھ پنجاب م
عورتوں بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام کر رہے ہیں یہ وحشیانہ طریقہ کیا سکھوں کو دنیا کی دو
اقوام کی نظروں میں گرا نہیں دے گا؟

جواب۔ افسوس ہمارے پاس ایسے موثر ذرائع کوئی نہیں کہ ہم دنیا کو اس تلخ حقیق
سے آگاہ کر سکیں کہ یہ کام ہندو خود کر کے ہمارے سر منڈھ رہا ہے اور مقصد یہی ہے کہ سکھ
کی تحریک کو دنیا کی حمایت سے محروم کیا جائے۔ اب یہ بات بین الاقوامی پریس میں بھی آ
چکی ہے اور ہم نے اس کے دستاویزی ثبوت فراہم کر دیئے ہیں کہ پنجاب میں آئی جی
پولیس مسٹر رابیرو کے زیر کمان ہندو سرکار نے خطرناک قیدیوں پر مشتمل ایک گروہ ترتیب
دیا ہے جسے "ریڈ بریگیڈ" کے طرز پر خونخواری کی تربیت دے کر پنجاب میں نہتے اور بے
ہندو اور سکھوں کے قتل عام پر مامور کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے گھٹیا کارناموں کو بھارتی اخ
بڑی تشہیر دیتے ہیں اور ان کے ہاتھوں مرنے والے بچوں کی تعداد بڑے بڑے وحشیانہ انداز
سے شائع کی جاتی ہیں یہ سارا الزام ہمارے سر ڈال دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ لوگ مختلف تنظیموں کے نام سے لوگوں کو دھمکی آمیز خطوط لکھ
کر ان سے رقم بٹورتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی آپس میں دشمنیاں ہیں اور وہ
ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے کسی بھی برسرپیکار گروپ کا نام استعمال کرتے ہ
ہمارے پاس ان لوگوں کو روکنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ حال ہی میں خالصتان کمانڈو

ری نے ایسے پندرہ ڈاکوؤں کو اپنے ایک آپریشن میں بطور سزا مار ڈالا ہے جو ان کی
دی اس طرح کی کارروائیاں کر رہے تھے۔ خالصتان کے حصول کے لیے برسرپیکار گروپ
یے لوگوں کے تعاقب میں تو ہیں لیکن مکمل طور پر ان کا صفایا ممکن نہیں۔

نیپال پر ہندو سامراج کی یلغار

نیپال نے جمہوریت تو حاصل کر لی لیکن اپنے مسائل میں بے پناہ اضافہ بھی کر لیا اور مقام حیرت تو یہ ہے کہ مسائل جو نظام بادشاہت میں موجود تھے جن کی غلط تصویر پیش کر کے بھارتی ایجنٹ مرہ لے نیپال کی ملکی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تھا اور اپنے مطلب کی حکومت کے برسر اقتدار آنے تک بھارت کی طرف سے نیپال کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی جاری رکھی تھی اب اپنی مرضی کی حکومت کو برسر اقتدار لا کر کیا بھارت نے نیپالی عوام کو فسطائیت سے نجات دلا دی ہے۔

ایشیا ویک کے نمائندے نے حال ہی میں نیپال کا دورہ کیا کٹھمنڈو کا ایک دکاندار کہتا ہے ہر چیز گزشتہ سال سے پچاس فیصد مہنگی ہو گئی ہے۔

ایک قالین باف نے پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر چلاتے ہوئے کہا۔

کیسی جمہوریت؟ کہاں کی جمہوریت؟ ہمیں تو ایک ہی فرق محسوس ہوا کہ پولیس بھی زیادہ ہو گئی ہے اور لاٹھی چارج بھی بڑھ گیا ہے۔ بلاشبہ بھارتی حکومت نے بڑی بڑی ریلیاں منعقد کروانے کے بعد اور نیپال جیسے پرامن ملک کو دنگا فساد اور لڑائی جھگڑے کی بھینٹ چڑھا کر وہاں وزیر اعظم کرشنا پرشاد بھٹہ رائے کی عبوری حکومت قائم کروا دی ہے لیکن نیپال میں اشیائے خورد و نوش کی دکانیں اب بھی سامان سے خالی نظر آتی ہیں اور ابھی تک بھارت نے اپنی اقتصادی ناکہ بندی کا مکمل خاتمہ نہیں کیا شاید ابھی تک موجودہ عبوری حکومت نے بھارتی

استبداد کے سامنے مکمل سرنڈر نہیں کیا یا پھر بھارت کی تمام شرائط قبول کرنا نیپال کی موجودہ حکومت کے لیے ممکن ہی نہیں رہا ہو گا۔ جس طرح شکاری اپنے قبضے میں آئے شکار کو تڑپا تڑپا کر اس کے مغلوب ہونے کا احساس دلاتا ہے اسی طرح بھارت نے بھی نیپال کی اقتصادی ناکہ بندی کو تھوڑی سی ڈھیل دے کر پھر اس کی طنابیں کھینچ لی ہیں۔

نیپال کے ۶۵ سالہ وزیر اعظم خود بھارت پہنچے اور انہوں نے مسٹر وی پی سنگھ سے درخواست کی کہ نیپال کے غریب عوام کو آخر وہ کس قسم کا سبق سکھانا چاہتے ہیں اور انہیں "نارمل ٹریڈ" کے لیے رضامند کرنے کی کوشش بھی کی اور خدا خدا کر کے ۲ جولائی سے نیپال کے جنوبی علاقے میں رہنے والے عوام جلانے کا تیل حاصل کرنے کے قابل ہو سکے اور ٹرکوں کے وہ قافلے جو بھارت نے نیپال میں داخل ہونے والے ۲۱ سرحدی راستوں پر روک لیے تھے انہیں نیپال میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ امید کی جا رہی ہے کہ ان ۲۷ پوسٹوں کو بھی ایک مرتبہ پھر بھارتی اور عوامی آمد و رفت کے لیے کھول دیا جائے گا۔ نیپال جیسا غریب ملک جس کی اکانومی کی بنیاد ہی درآمدات پر ہے اور جسے روزمرہ استعمال کی زیادہ اشیاء کے لیے بھی بیرونی دنیا کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے مال کی درآمد کے لیے بھارتی حکومت کا دست نگر ہے بلکہ نیپال کے لیے سامان کی درآمد اور برآمد کا زیادہ تر انحصار بھارتی بندرگاہوں پر ہے۔ اقتصادی ناکہ بندی کا جو ہتھیار بھارت نے استعمال کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ماہرین کے اندازوں کے مطابق تجارتی خسارہ ۱۹۹۰ء میں ... ملین ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ بھارت کی آہنی گرفت نیپال پر اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہاں بھارت کی مرضی کی حکومت برسر اقتدار آ کر بھی اپنے مسائل کا حل تلاش نہیں کر پائی اور اس کی مشکلات میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال مارچ میں اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے

بھارت سے نیپال جانے والے تمام راستے بند کر کے صرف دو راستے کھلے رکھے گئے
دیا تھا۔ یہ سزا نیپال کو بھارتی احکامات کی مکمل بجا آوری سے انکار کی صورت میں
دی گئی تھی صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بھارت نے اشیائے ضروریہ کی سپلائی بھی
نیپال کو معطل کر دی۔

بھارت نیپال سے کچھ معاملات پر سودے بازی کے لیے بضد تھا جبکہ
نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ بھارت کے ساتھ معاہدہ دو
پر یعنی صرف تجارتی معاملات پر دو طرفہ بات چیت ہو سکتی ہے دیگر معاملات پر
نیپال بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ کیونکہ یہ اس مسئلہ مشترکہ مفادات کا نہیں بلکہ
خطے میں بھارتی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کا تھا جبکہ نیپال اس خوش فہمی کا شکار
چلا تھا کہ سارک کے ممبر ممالک بھارت کو اس کے خلاف زیادتی نہیں کرنے دیں گے
اور وہ برابری کی حیثیت سے بات کرنے پر زور دے رہا تھا۔ نیپال کا مطمع نظر یہ
تھا کہ عالمی اخلاقی اور آئینی حیثیت سے وہ سمندری سرحد نہ رکھنے کی وجہ سے محض
تجارت کے لیے بھارت کا دست نگر کیوں بنے؟ کیونکہ ہر وہ ملک جس کے ساتھ سمندر
نہ لگتا ہو اپنی سمندری تجارت ہمسایہ ملک کے سمندری راستے سے کرنے کا حق
محفوظ رکھتا ہے۔ نیپال سے کمزور ہمسایہ ہونے کے ناطے ایک یہ جرم بھی سرزد ہوا تھا
کہ اس نے بھارت کی مرضی کے خلاف چین سے براہ راست اسلحہ خرید لیا تھا جس
نیپال نے یہ گستاخی کی۔ بھارتی حکومت نے فوراً نیپال پر "امپورٹ ڈیوٹی" کی شرح
سو گنا بڑھا دی۔ یعنی نیپال کی جو درآمدات بھارتی سمندری اور زمینی راستے سے
نیپال جاتی تھیں ان پر ٹیکس کی شرح یکدم سو فیصد بڑھا دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی
پنخ بھی لگا دی کہ نیپال نے بھارتی نژاد جن باشندوں کو اپنا لیبر یا لسنز لیبٹ کر کے
چلے جانے کا حکم دیا نیپال کو مجبور کیا گیا کہ ان سب کو دوبارہ ورک پرمٹ جاری کرے
تاکہ وہ نیپال کی سرحدی تجارتی منڈیوں پر قابض رہیں اور بھارتی مفادات کو تحفظ
اس پر بھی جب نیپال کے شاہ بریندرا نے جھکنے سے انکار کیا تو ان کے خلاف

جمہوری تحریک" چلا دی گئی "را" حرکت میں آئی اور نیپال نیشنل کانگریس کی طرف
سے قومی سطح پر جمہوری ریلیوں کا انعقاد ہونے لگا۔ تناؤ بڑھتا گیا اور نوبت یہاں
تک پہنچی کہ شاہ بریندرا کے محل پر حملہ آور ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فوج کو گولی چلانی
پڑی جس سے بہت سی جانوں کا ضیاع ہوا۔

فروری ۸۹ء میں تحریک کا آغاز ہوا اور یہ فائرنگ کا واقعہ اس جمہوری تحریک
کا نقطہ انتہا بن گیا۔ امن پسند شاہ بریندرا نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے
ہوئے نیپالی عوام کے خون کو سڑکوں پر بہانے کے بجائے "را" کا کھیل اپریل میں ہی
ختم کر دیا اور ۱۶ اپریل کو کانگریس کے صدر بھٹہ رائے کو حکومت بنانے کے لیے
کہہ دیا۔

جمہوریت کی بحالی کے ساتھ ہی مزدور گلیوں اور بازاروں میں اپنے حقوق
کے پرچم لہراتے نکل آئے۔ ملک کی سب سے بڑی صنعت قالین بافی جو غیر ملکی آمدن
کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس ہڑتال سے تباہ ہو کر رہ گئی۔ مالکان اور ہنر مند
کاریگروں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی لڑائی کا آغاز ہو گیا حکومت کو مجبوراً کاریگروں
کی تنخواہوں میں ۴۰ فیصد اضافے کا حکم دینا پڑا۔ لیکن مزدوروں کی تنخواہ میں اضافے
کے ساتھ ہی صنعت قالین سازی کا بحران شروع ہو گیا کیونکہ سستی لیبر پر ہی اس
صنعت کی آمدن کا انحصار تھا۔

اس بپھرے ہوئے سمندر کو کنٹرول کون کرے گا؟ کیا عبوری جمہوری حکومت؟
اگر یہی حال رہا تو نظم و نسق کا اس ملک سے جنازہ اٹھ جائے گا۔ صنعت قالین سازی
کی ایک ممتاز شخصیت نے کہا کہ کس کا دماغ خراب ہوا ہے جو ایسے بگڑے ہوئے
حالات میں سرمایہ کاری کا خطرہ مول لے گا۔

اس کے برعکس نیپال ٹریڈ یونین کا جنرل سیکرٹری بھرت ادھیکاری کہتا ہے
"ہم صرف اپنے حقوق مانگ رہے ہیں۔ ۳۰ سال تک ہمیں پابند رکھا گیا یہ تو ۳۰ سال
پابندی کے بعد آزادی کا قدرتی ردعمل ہے لیکن ہم انارکی نہیں پھیلنے دیں گے۔ ہم

ذمہ دار ٹھہری ہیں۔

روپ جیوتی ایک بڑا سرمایہ دار کہتا ہے اگر حکومت نے لوگوں کے مطالبے پر چاولوں کی قیمت کم کر دی تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور دوبارہ کوئی امپورٹ یا[...] کرنے کی شاید ہمت ہی نہ کر سکے۔

عبوری حکومت میں کمیونسٹ پارٹی کی شمولیت نے صنعت کاروں اور کارخانہ داروں میں تشویش کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے۔ مارکیٹ وزیر انڈسٹری اینڈ کامرس ساہانہ پردان نے عوام سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو ایک سال پہلے والی سطح پر واپس لے آئے گا جبکہ ایک سال میں قیمتوں میں ۱۲ فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔ بھارت کی اقتصادی ناکہ بندی کے بعد سے پکانے کھانے کے تیل کی قیمت میں ۲۰ فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ اگر بھارت کے ساتھ اقتصادی سمجھوتہ طے پا گیا تو ایک تہائی قیمتیں کم ہو کر خود بخود کم ہو جائیں گی۔

لال فیتہ اور کرپشن کے مسائل نے الگ سر اٹھایا ہے سول بیوروکریسی نے غیر سیاسی پنچایتی نظام کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور شاہ بریندرا کے دور میں یہی نظام کامیابی سے چل رہا تھا۔ اب جب جمہوری پنچایتی نظام آیا ہے تو لوگ کرپشن کے شاکی ہو رہے ہیں جمہوری قیادت کا خیال ہے کہ جیسے جیسے گرفت نرم ہو گی کرپشن کا خاتمہ ہو جائے گا جبکہ ملک کا دانشور طبقہ اس کے برعکس سوچ رکھتا ہے۔

نیپال کے حالیہ دور ہنگامہ آرائی میں "کرپشن" سب سے زیادہ زیر بحث رہنے والا مسئلہ رہا ہے۔ لوگ شاہ کے دور کے افسران کا احتساب چاہتے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ وہ اپنے "جوہر قابل" کو ضائع کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ سرکاری حلقوں میں خوانخواہ ہراس پھیلانے سے ہم کرپشن کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ اب عبوری حکومت نے اگلے پانچ سالہ منصوبے کو جس کا آغاز ۱۱ جولائی کو ہونے والا تھا معطل کر دیا ہے۔

۱۰ جون کو بھارت اور نیپال کے درمیان جو معاہدہ طے پایا ہے اس کی رو سے

بھارت اور نیپال اپنے تمام متنازعہ معاملات کو مل بیٹھ کر طے کریں گے اور ایک دوسرے کی خود مختاری کا احترام کیا جائے گا۔ لیکن معاہدے کر کے ان پر عمل پیرا ہونے میں بھارت کسی اچھی شہرت کا مالک نہیں خصوصاً پاکستان چین، سری لنکا، بنگلہ دیش وغیرہ کے ساتھ اس نے جو معاہدے کئے ہیں ان کے اتنے حصے پر ہی عمل کیا ہے جو بھارت کے اپنے مفاد میں ہو۔ جہاں سے اس کے ہمسائے کے مفاد کی سرحدیں شروع ہوں وہاں سے بھارت کی پسپائی کا آغاز ہوتا ہے۔

جنوبی ایشیاء میں امن اور طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے اب چھوٹے ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ناگزیر ہو چکا ہے اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ جنوبی ایشیاء کے کمزور ممالک کی ایک ایسی یونین بنے جو بھارت کی چیرہ دستیوں کو لگام دے سکے۔

تازہ ترین اطلاع کے مطابق بھارت نے پاکستان نیوی کے خیر سگالی مشن پر سری لنکا آئے ہوئے دو جہازوں کی آمد پر زبردست احتجاج کیا ہے اور سری لنکا کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جہازوں کو فوراً واپس بھیجے۔ یہ اسی بھارت کا احتجاج ہے جس نے سری لنکا سے ملحقہ سمندروں کو اپنی ذاتی جاگیر بنا رکھا ہے اور جب چاہے تامل مسئلے کی آڑ لے کر سری لنکا کے اقتدار اعلیٰ کی دھجیاں بکھیرنے سے نہیں چوکتا۔ جنوبی ایشیاء کے اس سامراج کو اگر جلد لگام نہ دی گئی تو دنیا کے اس خطے کے امن کو لاحق خدشات حقیقت کا روپ بھی دھار سکتے ہیں۔

بھارت کی ذلّت آمیز پسپائی

مطبوعہ ۱۶ر جون ۱۹۹۰ء

بھارت نے سری لنکا میں اپنی آمریت اور ہوس ملک گیری کا جو جال بچھایا تھا پریماداسا کے بیان کے بعد بھارت اپنی نام نہاد امن افواج کو فوراً سری لنکا سے نکال لے۔ بھارتی خواب چکنا چور ہو گئے ہیں۔ حالانکہ بھارت نے اس سے پہلے خود ہی اپنی فوج سری لنکا سے آہستہ آہستہ نکالنے کا اصولی فیصلہ کر لیا تھا اور اسی فیصلے پر عمل درآمد بھی ہو رہا تھا

گزشتہ چند مہینوں سے ایل ٹی ٹی ای کے گوریلوں کے ہاتھوں بھارتی فوج کے افسروں اور جوانوں کی اموات میں جو تیزی سے اضافہ ہوا ہے اس نے جہاں بھارتی فوج میں بددلی پیدا کی ہے وہاں بھارتی پریس میں ایک پریشان کن سوال بھی حکومت کے لیے سر اٹھانے لگا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ جو خطرناک اسلحہ آج تامل گوریلے بھارتی فوج کے خلاف استعمال کر رہے ہیں وہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟ بظاہر تو یہ وہ اسلحہ ہے جو بھارت میں موجود تاملوں کے تربیتی مراکز میں انہیں بھارتی انٹیلی جنس "را" کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔ "را" نے اپنی دانست میں سری لنکا کے سمندری ساحل پر ایک نیا "بنگلہ دیش" تامل لینڈ کی صورت بسانے کی کوشش کی تھی اور ان لوگوں کو جدید ترین اسلحہ سپلائی کیا تھا۔ اب وہی اسلحہ خود بھارتی فوج کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔ تربیتی کیمپوں میں تامل گوریلوں کا رابطہ جن اسلحے کے سمگلروں سے بھارتی ایجنسی نے کروایا تھا اب وہی سمگلر زیادہ پیسوں کے لالچ میں گوریلوں کو اسلحہ سپلائی کر رہے ہیں گو کہ بھارتی نیوی نے اس سارے علاقے کی عملاً بحری ناکہ بندی کر رکھی ہے

مگر بہرحال زیادہ راستوں کا علم رکھتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سری لنکا حکومت اور تامل لبریشن ٹائیگرز (ایل ٹی ٹی ای) بہ سست رفتار زہر کے ذریعہ ہند سری لنکا معاہدے کا خاتمہ کرنے کے درپے ہیں ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ کسی قسم کی خوش گوار رسموں کے بغیر ہی ہندوستانی فوج سری لنکا چھوڑ دے اس کا اظہار خصوصاً حالیہ واقعات اور نئی دہلی و کولمبو میں حکومت ہند کی جانب سے جاری کیے جانے والے تازہ بیانات سے ہوتا ہے۔

کولمبو میں تاملوں کی اس انتہا پسند تنظیم اور سری لنکا حکومت کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہو چکے ہیں اور ہر دور کے اختتام پر جاری ہونے والے اعلامیوں میں جو کہ ظاہر ہے حکومت کے اہتمام سے تیار کیے گئے ہیں ایل ٹی ٹی ای کے ہندوستان مخالف رول کی بازگشت سنی گئی ہے اس سے قبل صدر پریماداسا نے ہندوستان کے سیاسی اشتراک کے بغیر ایل ٹی ٹی ای سے جنگ بندی اور صلح کی اپیل کی جس کے جواب میں تنظیم نے ایسی جزوی جنگ بندی سے عملاً اتفاق کر لیا جو صرف اس کے اور حکومت کے فوجوں کے درمیان ہے۔ جب کہ بھارتی فوج پر اس کے حملے نہ صرف جاری رہے بلکہ ان حملوں میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے محض چار دنوں میں بھارتی فوج کے ایک میجر ایک لیفٹیننٹ اور دوسرے افسران سمیت بیس فوجی تامل ٹائیگرز کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔

۷ر مئی کو کولمبو میں ہندوستانی ہائی کمیشن کو ایک بیان جاری کر کے مذکورہ اعلامیوں کے ہندوستان مخالف انداز پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرنا پڑا۔ بیان میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ سری لنکا کی حکومت کے ان اعلامیوں میں ہندوستان امن فوج کے رول اور فرائض کے بارے میں صرف ایک فریق کے خیالات کو نمایاں کیا گیا ہے اور ہندوستانی فوج پر کیچڑ اچھالی گئی ہے علاوہ ازیں اس امر پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ سرکاری اعلامیوں میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ ہندوستانی فوج کن حالات میں سری لنکا گئی تھی اس کو کتنے مشکل حریفوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے سری لنکا کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے کتنی قربانیاں دیں۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ حکومت ہند کو امید

تھی کہ مذاکرات کا مقصد ان کو پروپیگنڈہ کا میدان بنانا نہیں بلکہ یہ تھا کہ تمام فریقوں کو تشدد ترک کر کے جمہوری عمل میں شامل ہونے پر اور سری لنکا کے اتحاد و سالمیت کا پابند بنانے پر آمادہ کرنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سری لنکا کی حکومت کے اعلامیوں میں تامل ٹائیگرز کے نقطہ نظر کی بہت زیادہ تشہیر کی گئی ہے۔ اور مذاکرات بھارت کی مذمت کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ مذاکرات کے پچھلے دور میں تامل ٹائیگرز نے اپنا پورے دن کا وقت بھارتی ہائی کمیشن لال ملہوترا کے ساتھ ایسی میں صرف کیا جس میں موصوف نے ہندوستانی فوج کے اور کارکردگی پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس انٹرویو میں ظاہر کردہ خیال شمالی اور مشرقی صوبوں کی صورت حال کے متعلق مکمل غلط بیانی" قرار دیا گیا۔ ایک روزہ مذاکرات سے منعقدہ اعلامیہ کا تین چوتھائی حصہ ہائی کمشنر کے بیان کی مذمت میں صرف کیا گیا اور الزام لگایا گیا وہ اختلافی مسائل پیدا کرنے اور عوام کی توجہ ملک کے اہم توجہ طلب مسائل سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سیاسی حلقوں کے بیان کے مطابق ابھی تک بات چیت کی کیفیت یا اس کا ایجنڈا واضح نہیں ہے اور نہ اس بات کے آثار ہیں کہ اصل معاملات میں جن کا تصفیہ ہونا ہے غور و خوض شروع کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے سرکاری ترجمان نے کہا کہ حکومت ہند اس بات کو ناگواری سے دیکھتی ہے کہ ایل ٹی ٹی ای کے سیاسی مشیر اے بالا سنگھم نے ہندوستانی فوج کو ظالم اور غاصب فوج کا نام دیا ہے۔ ترجمان نے اس بیان کو حقائق کی درگت قرار دیا اور کہا کہ اس طرح دباؤ ڈال کر ایل ٹی ٹی ای بھارتی فوج کو سری لنکا کے باہر کرنا چاہتی ہے۔

روزنامہ ہندو کے نامہ نگار تھامس ابراہیم نے کولمبو سے اطلاع دی ہے کہ تامل ٹائیگرز نے جزیرہ نما جافنا کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ ہندوستانی فوج سے کوئی ربط نہ رکھیں۔ ایسے پوسٹر نمودار ہوئے ہیں جن میں دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اس ہدایت پر عمل نہ کیا گیا تو ہر اس شخص کو ہلاک کر دیا جائے گا جو اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ نامہ نگار کے مطابق اس تنظیم نے مذاکرات میں بھارتی فوج پر تاملوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنے

...ن کی بے جا گرفتاریوں کے الزامات عائد کئے ہیں جن کی سرکاری ذرائع وسیع تشہیر کر رہے ہیں

اس موقع پر ایک خبر یاد آتی ہے جو دہلی کے ایک بڑے انگریزی اخبار نے شائع کی تھی جب تامل ٹائیگر (جو اکثر سری لنکا کے مسلمانوں پر حملے کرتے رہے ہیں) ایک گاؤں میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے اور بھارتی امن فوج سے مدد کی درخواست کی گئی تو ...ں نے صاف انکار کر دیا۔

ہندوستانی ہائی کمیشن کے مذکورہ بالا مفصل بیان سے ایک روز قبل نئی دہلی میں وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ ایسے وقت جب ایل ٹی ٹی ای سری لنکا حکومت کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہے ہندوستانی امن فوج پر اس کی نئی یلغار اس تنظیم کے سیاسی مقاصد کے بارے میں بہتانات پیدا کرتی ہے اس بیان سے دو دن پہلے تامل ٹائیگر کے ایک ہی حملہ میں دس ہندوستانی فوجی ہلاک ہوئے تھے استفسار کے جواب میں معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے تامل ٹائیگر کی کارروائیوں میں یہ شدت پیدا ہونے کا معاملہ سری لنکا حکومت کے سامنے بے ضابطہ اٹھایا ہے

حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند ایک مشکل صورت حال میں گومگو سے دوچار ہے سری لنکا میں ہندوستانی امن فوج کی موجودگی کو طول دینے کے مضمرات کے بارے میں جو اندیشے ملک کے مختلف مبصرین عرصہ سے ظاہر کر رہے تھے وہ درست ثابت ہو رہے ہیں لیکن تو یہ اندیشے اس ملک میں بھارتی فوج کا ایک سال پورا ہونے کے بعد سے خصوصاً سری لنکا کے صدارتی انتخاب کے وقت سے ظاہر کئے جا رہے تھے جب موجودہ صدر اور اس وقت کے وزیر اعظم پریما داسا نے اعلان کیا تھا کہ وہ صدر منتخب ہونے کے بعد ہند سری لنکا معاہدے کو منسوخ کر دیں گے اور ہندوستانی امن فوج کو واپس بھیج دیں گے لیکن تامل ٹائیگر اور سری لنکا کی حکومت کے درمیان ایک ماہ قبل براہ راست مذاکرات قائم ہو جانے کے بعد آنے والے حالات کی پیچیدگی کے بارے میں رہے سہے شکوک دور ہو گئے تھے۔

اب صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کولمبو حکومت اور ایل ٹی ٹی ای نے مل کر بھارتی فوج

کے خلاف سیاسی محاذ بنا لیا ہے۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے کیونکہ ہند سری لنکا معاہدے کے تحت سری لنکا کی حکومت نے اس تنظیم کے ساتھ مفاہمت کی کوششیں ناکام ہونے کی بعد اس سے ہتھیار ڈلوانے کے لیے بھارتی فوج کی مدد طلب کی تھی اور آثار ظاہر کر رہے ہیں کہ ان دونوں فریقوں کے درمیان کم از کم جنگ بندی کے تمام مسائل کا تصفیہ ہونے والا ہے۔ صرف ہندوستانی فوج ہی مفاہمت کے عمل سے الگ رہ جائے گی۔ ایل ٹی ٹی ای کے بیانات میں یہ بات بارہا واضح کر دی گئی ہے کہ اب اس کا اصل جھگڑا سنہالیوں یا وفاقی حکومت کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان اور ہندوستانی فوج کے ساتھ ہے، حالات کو مزید پیچیدہ بنانے والی چیز یہ ہے کہ مقامی حکومت نے جنتا مکتی مورچہ (جے وی پی) کو بھی بات چیت اور سمجھوتہ کی دعوت دی ہے جو کہ سری لنکا کی دوسری انتہا پسند تنظیم اور سنہالیوں کی نمائندگی کی دعویدار ہے۔ یہ بھی ہندوستانی فوج کی موجودگی کی اتنی ہی مخالفت کرتی ہے جتنی کہ ایل ٹی ٹی ای کرتی ہے اس پیشکش کا ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا لیکن اس محاذ پر بھی حالات پہلے سے بہتر ہیں ان حالات میں یہ امکان صاف نظر آ رہا ہے کہ سری لنکا کی خانہ جنگی یا مختلف فریقوں کی ایک دوسرے کے خلاف مسلح کارروائیاں ختم ہو کر یہ ہندوستانی فوج کے خلاف مرکوز ہو جائیں گی اور اس کی مسلح مزاحمت تک محدود ہو جائیں گی۔ ایسی صورت میں ہندوستان کی بین الاقوامی پوزیشن کیا ہو گئی ہے اس کا ابھی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ الگ بات کہ بھارت نے کبھی بین الاقوامی اصول و ضوابط کو پرکاہ جتنی اہمیت نہیں دی لیکن اس عشرے میں بھارت نے عموماً ہمسایہ ممالک کے خلاف جارحانہ اقدام کے ضمن میں زیادہ تر منہ کی ہی کھائی ہے۔ بنگلہ دیش سے بھارتی اثر و رسوخ کا جنازہ اٹھا اور صورت حال اتنی کشیدہ ہو گئی کہ بھارت کی مدد سے قیام پذیر بنگلہ دیش نے بھارت پر بنگلہ دیش کے معاملات میں کھلم کھلا مداخلت کا الزام عائد کیا ہے خاص طور پر بھارتی انٹیلی جنس کی طرف سے "بنگا بھومی" نام کے ڈھونگ کی زبردست مذمت کا سلسلہ جاری ہے۔ یاد رہے کہ بھارت نے بنگلہ دیش کو زچ کرنے کے لیے وہاں

ہند مملکت کا شوشہ چھوڑ رکھا ہے اور بنگلہ دیش کی سرحدوں پر ہندو انتہا پسندوں کی ٹریننگ کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ نے بھارت سے اپیل کی ہے کہ وہ علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کر کے پہلے ہی سے قدرتی آفات کے شکار بنگلہ دیش کے لیے مزید مسائل پیدا نہ کرے بھارت نے حسب روایت اس الزام کی نفی کرتے ہوئے اس تحریک سے بھارت کی لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھارت اور بنگلہ دیش کے تعلقات بہت کشیدہ ہو چکے ہیں۔

دوسری طرف نیپال نے جب سے خود مختاری اور عزت نفس کے ساتھ بھارتی تسلط سے الگ رہ کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے بھارت نے نیپال کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی ہے اور وہاں صورت حال اتنی دگرگوں ہو چکی ہے کہ نیپال میں راشن بندی کا سلسلہ جاری ہے لیکن نیپال نے بھارت کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا ہے۔

ہمسایہ ممالک پر دباؤ کو بڑھاتے چلے جانا بھارت کی پرانی پالیسی ہے لیکن اب بظاہر کمزور ہمسایہ ممالک نے یہ جان لیا ہے کہ بھارت کی بالادستی قبول کر کے وہ زیادہ عرصہ تک کاروبار مملکت نہیں چلا سکتے اور انہیں بہر حال بھارتی تسلط سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس صورت حال کا سامنا براہمن سامراج کس طرح کر پائے گا یا پھر یوں کہیے کہ اب وہ کون سا پینترہ بدلے گا اس سوال کا جواب بھی جلدی سامنے آنے والا ہے۔ فی الوقت راجیو حکومت کی خاموشی کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے بھارت کے عام انتخابات جو اس سال کے آخری عشرے میں منعقد ہوں گے۔ ان انتخابات کے نتائج پر ہی بھارت کی آئندہ خارجہ پالیسی کا انحصار ہو گا۔ اگر مسٹر راجیو گاندھی دوبارہ برسر اقتدار آ جاتے ہیں جس کے امکانات خاصے کم ہیں تو وہ نشہ اقتدار میں کوئی بھی سخت اقدام کر گزریں گے اور یہ ممکن ہے کہ جب بھارت کی موجودہ گومگو کی پالیسی ختم ہو تو اس کا اصلی اور بھیانک چہرہ دوبارہ دنیا کو دیکھنے کو مل جائے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بھارتی حکومت نے سری لنکا کے صدر پریما داسا کے مطالبے کو مسترد کر دیا ہے کہ بھارت دو ماہ کے اندر اپنی افواج سری لنکا سے نکال لے۔

بھارتی حکومت کا کہنا ہے کہ فی الوقت سری لنکا سے بھارتی فوجوں کا اخراج سری لنکا کے لیے نقصان دہ ہے۔ گویا اب سری لنکا کی قسمت کا فیصلہ بھی بھارت کو کرنا ہے یہی وہ خطرہ تھا جس کی نشاندہی شروع ہی سے کی جاتی رہی ہے کہ بھارت کا مقصد اس علاقے میں موجود سمندر پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا ہے اور اب اس نے دھمکی دھونس کی پالیسی اپنا کر اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ یہ وارننگ بھارت کی طرف سے اپنے تمام ہمسایہ ممالک کے لیے ہمیشہ سے موجود رہی ہے کہ جس ملک نے بھارت سے دوستی کی اس نے بالآخر دوستی کا مزا چکھ لیا بالکل ایسے جیسے سری لنکا نے چکھا ہے۔ مالدیپ اور سری لنکا کے جزائر پر بھارتی فوج کا یہ غاصبانہ قبضہ پاکستانی سیاستدانوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے خصوصاً ان کے لیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو انسانی بھائی چارہ یا دوستی نام کے الفاظ سے بھی شناسائی رکھتا ہے۔

نہرو خاندان سے نجات

مطبوعہ: ۲ر جون ۱۹۸۹ء

بھارت میں ۸۹ء کے آخر میں ہونے والے عام انتخابات کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ انتخابات بھارتی وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی اپنی ذاتی حیثیت میں لڑیں گے جبکہ ان کے مضبوط مخالف جنتا دل کے جانے پہچانے راہنما مسٹر وی پی سنگھ اپنی پارٹی سٹریٹجی کے مطابق میدان میں اتریں گے۔ مختلف بھارتی رسائل اس ضمن میں عوامی سروے پر مبنی رپورٹیں شائع کر رہے ہیں۔ بھارتی عوام میں دونوں امیدواروں کی شخصیات سے متعلق کچھ اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

لوگ سوچتے ہیں کہ راجیو گاندھی نسبتاً زیادہ روشن خیال اور ماڈرن لیڈر ہیں۔ اس کے برعکس ایک اور مضبوط رائے یہ بھی موجود ہے کہ مسٹر وی پی سنگھ اپنے دو سالہ دور اقتدار میں جبکہ وہ ۱۹۸۵ء تا ۸۷ء وزیر خزانہ رہے اور کئی سرمایہ داروں نے ان کی پالیسیوں کو ہدف تنقید بھی بنایا اس کے باوجود انہیں بھارتی معیشت کے لیے بہترین پالیسی ساز اور منتظم مانا جاتا ہے۔ راجیو گاندھی اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بھارتی معیشت میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کے حامی ہیں جبکہ وی پی سنگھ ملکی صنعت کاروں کو مزید سہولیات دے کر خود انحصاری کی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔

اگر بھارتی اخبارات اور رسائل میں چھپنے والی آراء کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی یہ انتخابات ہار جائیں گے۔ ممکن ہے وہ منتخب ہو کر پارلیمنٹ تک پہنچ جائیں لیکن اس بات کے امکانات کم ہیں کہ کانگریس اکثریت حاصل

کسے اور وہ دوبارہ بھارت کے وزیر اعظم بن پائیں۔ اس عوامی اظہار رائے کے بعد بھارت یا بھارت سے باہر شاید ہی کوئی اس بات پر یقین کر سکے کہ نہرو خاندان سے عوام کو اتنی جلدی نجات مل جائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا سبب کیا؟

اس کا بہترین جواب بھارتی ہفت روزہ سنڈے نے ایک اداریے کی صورت میں دیا ہے۔ پرچے کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں راجیو گاندھی نے انتخابات جیتنے کے لیے اتحاد کا نعرہ لگایا تھا اور یہ واویلا مچایا تھا کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے خطرے میں ہے۔ ممکن ہے وہ اس مرتبہ بھی اسی نعرے کا سہارا لیں اور ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جس میں بھارت کو متحد رکھنے والی ایک ذات ان ہی کی نظر آئے۔ اس امر کو تقویت مسٹر گاندھی کے اس حالیہ اقدام سے ملتی ہے جس کے ذریعے ایک مرتبہ پھر اندرا گاندھی قتل کیس کی سازش کے تحت چار سکھ لیڈروں پر مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ جن میں مشہور سابق ڈی آئی جی پنجاب پولیس سمرن جیت سنگھ مان اور آل انڈیا سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق صدر اتندر پال سنگھ کے نام بھی شامل ہیں جو پہلے ہی سے مختلف الزامات کے تحت بھارتی عقوبت خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ دراصل ٹھکر کمیشن کی رپورٹ کے ذریعے مسٹر راجیو گاندھی ایک مرتبہ پھر ایسی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں بھارت کی مقتول وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے قتل کے واقعات زیر بحث آنے لگیں اور وہ پھر ہمدردی کے ووٹ کا کارڈ کھیل کر ستم رسیدہ ماں کے مظلوم بیٹے کی صورت راج سنگھاسن پر براجمان ہو سکیں۔

۱۰ اپریل کو جب مسٹر گاندھی بھارتی پارلیمنٹ میں ٹھکر کمیشن رپورٹ پر تقریر کرنے کے لیے ڈائس پر کھڑے ہوئے تو بھارتی اخبار نویسوں نے یہی سرخیاں جمائی تھیں کہ مسٹر راجیو آج بھی پانچ سال پہلے والی فضا پیدا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ۸۴ء میں بھی انہوں نے خالصتان کے مسئلے کو بنیاد بنا کر ملکی وحدت کا رونا روتے ہوئے بھارتی عوام کے ووٹ حاصل کئے تھے اور آج بھی وہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اب پانچ سال بعد جبکہ پنجاب میں خونریزی اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے اور سرکار کی تمام تر کوششوں کے باوجود خالصتان نواز تحریک روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے تو بھارتی اپوزیشن نے راجیو گاندھی حکومت پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنے اور لونگوال کے درمیان ہونے والے معاہدے پر عمل کریں اور آنندپور صاحب کے ریزولیوشن کو قبول کرتے ہوئے اس مسئلے کو ختم کر دیں۔ اپوزیشن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ طاقت کے بل پر مسٹر راجیو گاندھی اگر اس تحریک کو کچل سکتے تو اب تک خالصتان تحریک دم توڑ چکی ہوتی کیونکہ مرکزی حکومت نے ہر ممکن سختی اور لالچ کی پالیسی اپنانے کے باوجود کامیابی حاصل نہیں کی اس کے برعکس تحریک کو تقویت ہی حاصل ہوئی ہے۔

اپوزیشن کا شروع سے یہی مطالبہ رہا ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی کو آنندپور صاحب ریزولیوشن کو قبول کر لینا چاہیئے۔ اپوزیشن کا خیال ہے کہ اس سے حالات میں بہتری پیدا ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ دوسری طرف مسٹر راجیو گاندھی اس مطالبے کی حمایت کرنے والوں کو علیحدگی پسند اور دہشت گردوں کے حامی قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ آنندپور ریزولیوشن قبول کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم پلیٹ میں رکھ کر سکھوں کو خالصتان پیش کر دیں اور جو لوگ انہیں ایسا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ دراصل بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں۔ حقائق کچھ اور کہانی سنا رہے ہیں۔ دراصل مسٹر راجیو گاندھی دانستہ صورت حال کو بگاڑ رہے ہیں ان کا حالیہ بیان بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ درآنحالیکہ مسز اندرا گاندھی کے قاتل طویل عدالتی کارروائی کے بعد اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایک کیہر سنگھ کی بے گناہی کا اظہار آج بھی مغربی پریس کر رہا ہے خود بھارتی پریس اور عدلیہ سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا حصہ اسے غیر قانونی پھانسی بلکہ بے گناہ کے قتل سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اور بڑی شرمناک بات ہے کہ اب مسز گاندھی کے قتل والی فائل ٹھپ ہو چکی ہے لیکن مسٹر راجیو گاندھی نے بیان دیا ہے کہ ۸۴ء میں ان کی والدہ کا قتل ایک بڑی سازش کا حصہ ہے

جس کی پشت پناہی غیر ملکی طاقتیں کر رہی تھیں اور اس سازش کا مطلب بھارت کے استحکام کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ جبکہ بھارتی سپریم کورٹ میں کہر سنگھ اور ستونت سنگھ کیس میں وکلا کی بحث کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس قتل میں کوئی غیر ملکی ہاتھ ملوث نہیں تھا اور قاتلوں نے بدلے کی آگ میں اندھے ہو کر یہ انتہائی اقدام کیا تھا۔ اس کے برعکس مسٹر راجیو گاندھی کا کہنا ہے۔

اندرا جی اپنی زندگی میں دہشت گردوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کی نشاندہی کرتی رہی ہیں اور اپنی آخری ایام کی تقاریر میں انہوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ کچھ غیر ملکی طاقتیں انہیں قتل کر کے بھارت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتی ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے مسٹر راجیو گاندھی نے اس مفروضے یا "الیکشن سٹنٹ" کو ہی فنڈ بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں سازش کا جال بہت وسیع ہے اور اس کا سلسلہ بھارت سے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی کچھ ۸۴ء میں کانگریس کی الیکشن مہم کی کامیاب بنیاد تھا۔ اب جو ایک مرتبہ پھر راجیو گاندھی نے کانگریس آئی کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے اس گڑے مردے کو اکھاڑ رہے ہیں تو اس کے پس پردہ محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خیال رہے کہ مسٹر راجیو نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی وہ مانی سنکر آئر جیسے گھاگ ڈپلومیٹ کی ڈرافٹ کردہ تھی جبکہ اس تقریر کے متن کو تیار کرنے کے لیے دو سینئر سول سرونٹس کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جنہوں نے کابینہ سے مشاورت کے بعد تقریر تیار کی تھی۔ اس تقریر میں دو نکات پر تکرار کی گئی ہے۔

۱۔ اندرا قتل میں غیر ملکی ہاتھ کی موجودگی اور بھارتی وحدت کے خلاف سازش
۲۔ اپوزیشن کی طرف سے ملکی امن و امان کو لاحق خطرات کے خاتمے کے لیے پیش کردہ تجاویز کو سکھ دہشت گردوں سے الحاق کا نام دیا گیا۔

اس موقع پر راجیو حکومت نے بڑی عرق ریزی کے بعد ایک چال تیار کی اسے بڑی کامیابی سے بروئے کار لایا گیا۔ ٹھکر کمیشن کی خفیہ رپورٹ کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے پہلے منصوبے کے مطابق اس کے کچھ حصے افشا کر دیئے گئے۔

اخبارات نے ان حصوں کی خبروں کو سرخیاں بنانا شروع کر دیا۔ اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ رپورٹ کے صرف وہ حصے افشا کیے جائیں جن سے یہ ثبوت ملتا ہو کہ اس قتل میں غیر ملکی طاقت ملوث ہے۔ اسی طرح رپورٹ کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لانے سے پہلے ایک مرتبہ عوام میں اخبارات کے بحث مباحثہ کے ذریعے ۸۴ء کی اندرا گاندھی کے قتل والی فضا پیدا کر دی جائے اور اس فضا کی موجودگی میں اپوزیشن کی طرف سے علیحدگی پسند خالصتانیوں کے ساتھ مذاکرات اور آنند پور صاحب ریزولیشن کی حمایت کو سکھ علیحدگی پسندوں کے ہاتھ مضبوط کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے عوام کو جذباتی بنا کر دوبارہ ۸۴ء والا حربہ آزما کر اقتدار پر اگلے پانچ سال کے لیے قبضہ کر لیا جائے۔ اس دوران قربانی کا بکرا بنانے کے لیے ارون نہرو کو منتخب کیا گیا۔ کیونکہ نہرو خاندان میں راجیو کی حماقتوں کے بعد عوام نے ان کے دست راست اور نہرو خاندان ہی کے ایک چشم و چراغ ارون نہرو کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا اور بھارتی پریس میں باقاعدہ اس بحث کا آغاز ہو گیا تھا کہ ارون نہرو کی شخصیت راجیو گاندھی پر بھاری پڑنے لگی ہے۔ ارون نہرو پر ٹھکر کمیشن رپورٹ کے افشا کا الزام بھی کابینہ کی طرف سے لگایا گیا۔ اس طرح اس کے حکومت میں رہنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں چھوڑا گیا۔ اور مسٹر راجیو گاندھی نے بڑی ہوشیاری سے ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔

مرے پر سو درے اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے یہ واویلا بھی مچایا گیا کہ ٹھکر کمیشن کے کچھ حصوں کے افشا ہونے سے اخبارات میں چھڑنے والی بحث کے بعد مسٹر راجیو کی وہ بات سچ ثابت ہوئی ہے کہ بھارتی عوام اپنی مقتول وزیر اعظم کے قتل کے پس پردہ حقائق جاننا چاہتے ہیں جبکہ کچھ سیاست دانوں کو یہ ناگوار خاطر گزرتا ہے۔ گویا ہر طرح سے ایسی فضا بنا دی گئی جس میں اندرا قتل کیس پھر زیر بحث آئے اور اس ایشو پر ہندو عوام کا ووٹ کانگریس کی جھولی میں پکے پھل کی طرح آن گرے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی نے اصولی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی انتخابی مہم کی بنیاد دو نکات پر رکھیں گے۔ اندرا قتل میں غیر ملکی ہاتھ اور بھارت ماتا

کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی غیر ملکی سازش بوٹا سنگھ نے منصوبے کے عین مطابق یہ بیان
بھی داغ دیا کہ عین ان دنوں میں جبکہ حکومت اندرا قتل سازش کا کیس عدالت میں پیش
کرنے جارہی تھی ٹھکر کمیشن رپورٹ کا افشا قاتلوں کے ہاتھ مضبوط اور حکومتی کیس کو کمزور
کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی راجیو گاندھی پر کڑی تنقید کرنے والے
مشہور جرنلسٹ ارون شوری کو بھی رگڑا دیا گیا اور کہا گیا کہ انہوں نے رپورٹ
کے خفیہ حصوں کی اشاعت کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اندرا کے قاتلوں سے ان کے
روابط ہیں یہی الزام تکرار کے ساتھ ہمیں مسٹر راجیو گاندھی کی پارلیمنٹ میں کی گئی تقریر
میں بھی نظر آیا ہے۔

اسی طرح راجیو گاندھی کے ایک اور سیاسی دشمن رام جیٹھ ملانی پر بھی خالصتانی
ہونے کا الزام عائد کر دیا گیا۔ راجیو گاندھی نے جیٹھ ملانی کے لکھے کتابچے "بھارت کی
موت" کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اس پر الزام عائد کیا کہ جیٹھ ملانی علیحدگی پسند خالصتان
کا ایجنٹ ہے اور اس کتابچے کے ذریعے ملانی نے آزاد مملکت خالصتان کی حمایت کی ہے۔

مسٹر راجیو گاندھی نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد اپنی ماں کی "مظلومانہ موت" کو
بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک انتخابی ٹیم تیار کی گئی ہے۔ اس ٹیم
کی سربراہی وٹھل گڈگل نامی ایک گھاگ بیوروکریٹ کر رہا ہے اسے الیکشن سٹریٹیجی چیف
ایڈوائزر کی حیثیت حاصل ہے۔ عموماً پولیس اور پارلیمنٹ میں مفروضے کو تقویت پہنچانے
کے لیے الٹی سیدھی دلیلیں وٹھل کی طرف سے ہی گھڑی جاتی ہیں۔ حال ہی میں اس
نے مسز گاندھی کی موت کو "سرمایہ دار ممالک" کی بھارت کے خلاف سازش ثابت کرنے
کے لیے تیسری دنیا کے کچھ ممالک کے واقعات کو بنیاد بنایا ہے۔

وٹھل کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے چلی میں الندے، مصر میں انور سادات اور بنگلہ دیش
میں شیخ مجیب الرحمان کو قتل کروانے کے لیے ان کے باڈی گارڈز کی خدمات ہی
حاصل کی گئی ہیں گویا یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ مسز اندرا
گاندھی کو ان کے "قابل اعتماد محافظوں" نے محض مذہبی جنون کے ہاتھوں اندھے ہو کر

...ن کے گھاٹ اتار دیا۔

اب پی چدامبرم نے ایک مرتبہ پھر مشرقی پنجاب میں علیحدگی پسند تحریک کا ذمہ دار
...ان کو گردانتے ہوئے اس پر خالصتان نواز سکھوں کو اسلحہ اور تربیت دینے کا الزام
...ہرانا شروع کر دیا ہے۔ یہی الزام ایک مرتبہ پھر راجیو گاندھی دہرانے لگے ہیں حالانکہ
...رک کانفرنس سے واپسی پر پاکستان کے متعلق ان کا لب و لہجہ تبدیل ہو گیا تھا۔
...مسٹر گاندھی نے ایک نیا انداز اپنایا ہے اور وہ پاکستانی حکومت پر الزام عائد
...رنے کے بجائے اس کا ذمہ دار براہ راست پاکستان کی مایہ ناز سروسز انٹیلی جنس
...ٹھہرانا شروع کر دیا ہے اور یہ موشگافی بھی فرما دی ہے کہ وزیر اعظم مسز بینظیر بھٹو کا
...ادارے پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ اس کے علاوہ چدامبرم نے ایک "خط" بھی
...ارلیمنٹ میں پیش کر دیا ہے جو سکھ انتہا پسندوں کی طرف سے لکھا گیا ہے جس میں
...اجیو گاندھی اور مسز بینظیر کو قتل کرنے کے کسی "خود ساختہ منصوبے کا" انکشاف
...را ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں ہونے والی گڑبڑ کو بھی بھارتی حکومت آئی ایس آئی کے کھاتے
...ڈال رہی ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس نے مقبوضہ کشمیر میں تربیت
...تہ افغان مجاہدین داخل کر دیئے ہیں۔

دراصل ایسی فضا پیدا کر کے انتخابی میدان کو اپنے لیے ہموار کرنے کے علاوہ
...مسٹر راجیو گاندھی کے پاس کھیلنے کے لیے اور کوئی کارڈ باقی نہیں رہا۔ اس قسم کی
سیاست انہیں ورثے میں منتقل ہوئی ہے۔ ان کی والدہ بھی مسلم دشمنی یا دوسرے
...لفظوں میں پاکستان دشمنی کے بل بوتے پر ہی اپنی سیاسی دکان چمکاتی رہی ہیں اور یہ
...ازمودہ اور سستا نسخہ اب ان کے سپوت نے اپنا لیا ہے۔

مغربی مبصرین کا کہنا ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی کے پاس چونکہ کھیلنے کے لیے اور
...کارڈ باقی نہیں رہا اس لیے عین ممکن ہے کہ وہ "ہیرو" بننے کے لیے پاکستان سے
...جنگ کا خطرہ مول لینے پر بھی تل جائیں۔ اس مفروضے کو تقویت سیاہ چن میں ہونے والی

تازہ جھڑپوں سے بھی ملتی ہے۔

پاکستانی وزیر دفاع کا یہ بیان کہ بھارت سیاچین مذاکرات میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے اس علاقے میں مزید پوسٹیں قائم کرنے کا خواہش مند ہے تاکہ پاکستان کو دباؤ کی حالت میں مذاکرات کی میز پر لایا جائے بھی محل نظر ہے۔

راجیو کو اپنی اس انتخابی مہم میں ایچ کے ایل بھگت کی زبردست "آشیرواد" حاصل ہے۔ بھگت گزشتہ ۵۰ سال سے سیاست کر رہا ہے اور اندرا گاندھی کے بعد راجیو کابینہ میں بھی اسے اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے۔ ایچ کے ایل بھگت نے دہلی کے مشرقی علاقے سے ۳ لاکھ ۱۲ ہزار ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ ۸۴ء میں الیکشن جیتا تھا اس کو واضح طور پر "سکھوں کے خون کا پیاسا" کہا جاتا ہے کیونکہ مسز گاندھی کے قتل کے بعد اس کے حلقہ نیابت میں ایچ کے ایل بھگت کی سربراہی میں سکھوں کے خون کی زبردست ہولی کھیلی گئی تھی۔ یہ الزام اس پر اپوزیشن کی طرف سے بھی لگایا گیا ہے اور آج تک بھگت پر اس ضمن میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ بھی تکرار کے ساتھ جاری ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ راجیو کا دست راست ہے۔

ان حالات کے بعد بظاہر یہ ممکن نظر آتا ہے کہ جنتا دل کے مسٹر وی پی سنگھ ہندوؤں کی اکثریت والے ملک میں کامیابی حاصل کر سکیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کشمیری براہمنوں کی آمریت کا خاتمہ جلد ہی ہونے والا ہے۔ یہ الگ بات کہ ایسا کب تک ممکن ہو گا۔

بھارتی انتخابات اور فرقہ پرست جماعتیں

مطبوعہ: ۱۸ر اگست ۱۹۸۹ء

بھارت میں عام انتخابات کی آمد آمد ہے عین ممکن ہے کہ کسی بھی وقت مسٹر راجیو گاندھی کوئی ڈرامائی قدم اٹھائیں اور حالات کو اپنے لیے سازگار پاکر وقت سے پہلے انتخابات کا اعلان کر دیں لیکن بھی اپوزیشن جماعتوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے خصوصاً بھارتی پارلیمنٹ سے اپوزیشن ممبران کے مشترکہ استعفوں نے عالمی سطح پر مسٹر راجیو گاندھی کی پوزیشن خاصی خراب کر دی ہے اور اب عالمی پریس یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ منہ سے جمہوریت کا مسلسل راگ الاپنے والے راجیو گاندھی کی اصلیت کیا ہے اور وہ اپنے مفادات کے لیے کس حد تک جا سکتے ہیں حیرت کی بات ہے کہ بھارتی آڈیٹر جنرل کی سرکاری رپورٹ جس میں اس نے "بوفورس" سودے میں بے ضابطگی کی نشاندہی کی ہے کو بھی اپوزیشن کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے جس کا کوئی اخلاقی جواز بھی نظر نہیں آتا

بھارت کے عام انتخابات میں بھارت کی فرقہ پرست جماعتیں خصوصاً راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور شیو سینا کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دونوں جماعتوں نے اپنا دائرہ کار خاصا وسیع کر لیا ہے اور ان کے عزائم بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اگلے عام انتخابات میں ووٹروں کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ پارلیمنٹ کی ہر نشست اور ہر حلقے میں کم سے کم ۵۰ تا ۶۰ ہزار نئے ووٹروں کو رائے دہی کا حق حاصل ہو جائے گا۔ اکثر حلقوں میں یہ ۵۰ ہزار نئے اور نوجوان ووٹر فیصلہ

کن ثابت ہوں گے اور نتائج پر زبردست اثر ڈالیں گے۔

ہر حلقے اور ہر نشست کے ان ۵۰ تا ۶۰ ہزار نوجوان ووٹروں کو اپنے اثر میں لانے کے لیے سب سے پہلے بھارتیہ جنتا پارٹی نے منظم منصوبہ تیار کر لیا ہے بی جے پی کا خیال ہے کہ ناتجربہ کار اور نوعمر ووٹروں کو آسانی کے ساتھ جذباتی نعروں سے بہکایا جا سکتا ہے اور اپنے جال میں پھنسایا جا سکتا ہے بی جے پی نے پرمود مہاجن رکن پارلیمنٹ کو نوجوانوں کے بارے میں حکمت عملی تیار کرنے کا کام سونپ دیا ہے اور وہ پوری سرگرمی سے اس مہم میں مصروف ہو گئے ہیں۔

پرمود مہاجن نے کہا کہ وہ نوجوانوں میں جذبہ اور جنگجو ہندو اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم خاص طور پر نوجوانوں میں جذبہ پیدا کریں گے اور اس میں ہمیں کامیابی کی امید ہے انہوں نے کہا کہ اگر ہم جنگجو ہندو اسپرٹ رکھتے ہیں تو نتائج کی پروا کیے بغیر ہمیں اس کا اظہار بھی کرنا چاہیے۔

مہاجن نے کہا کہ ہم اقلیتوں کے روبرو جھکنے کی پالیسی کے خلاف ہیں ہم اقلیتوں کو اقلیتوں کی طرح شناخت نہیں کریں گے۔ ہم ان کو ہندوستانی کے نام سے پکارنا پسند کریں گے۔ مہاجن نے کہا کہ جوشیلے ہندو جذبہ کا اظہار کرنا کوئی جرم نہیں ہے ہم نوجوان ووٹروں میں بھی یہی جذبہ پیدا کریں گے۔

بھارت میں اس وقت ایک طرف تو رام جنم بھومی کے تنازعے کو لے کر ہندو فرقہ پرست جماعتیں ملک کے کونے کونے میں "یگیہ" کے ذریعہ فضا کو بگاڑنا چاہتی ہیں دوسری طرف مہابھارت اور رامائن کی مسلسل نشر و اشاعت نے انتہا پسندی اور قدامت پسندی کے ماحول کو ہوا دی ہے۔ اس ماحول میں بی جے پی نے اگر منظم کوشش کی تو وہ آسانی سے ۱۸ سال سے ۲۰ سال تک کی عمر کے نوجوانوں کو ورغلا سکتی ہے اور اپنے ساتھ لگا سکتی ہے ملک کے بعض حصوں میں یہ بات نوٹ کی گئی ہے کہ بہت سارے سیکولر اور صاف ذہن رکھنے والے کانگریسیوں کی نئی نسل بھی فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئی ہے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ باپ اور چچا تو کانگریس یا دوسری جماعتوں سے

وابستہ ہیں لیکن بیٹے، بھانجے، بھتیجے "گرو سے کہو ہم ہندو ہیں" کا نعرہ سینے پر لگائے پھرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس نے ووٹروں کی عمر کم کر کے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے اور ہر پارلیمانی حلقے میں کوئی ۶۰ ہزار ایسے نوجوانوں کو ووٹنگ کا حق دے دیا ہے جو سیاسی سوجھ بوجھ، سماجی ذمہ داری یا امن و قانون کی زیادہ پروا نہیں کرتے اور آسانی کے ساتھ فرقہ وارانہ اور انتہا پسندوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

نوجوان ووٹروں کو ساتھ لینے کے لیے کانگریس نے نہرو روزگار یوجنا پر زور دیا ہے اور کروڑوں روپیہ ان یوجناؤں کے ذریعے تقسیم کے لیے ہر حلقے کو دیا جا رہا ہے لیکن یہ ایک عارضی کارروائی ہے اس سے روزگار کا مسئلہ حل کیے بغیر نوجوان ووٹروں کو اپنے ساتھ لینا ان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ نوجوان کانگریسی ورکروں سے یہ سوال ہی کرتا ہے کہ چالیس سال سے اقتدار میں رہ کر کانگریس نے روزگار کا مسئلہ اب تک کیوں حل نہیں کیا اپوزیشن پارٹیوں جنتا دل، کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ اور بی جے پی نے بھی روزگار کے سوال کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ہم برسہا برس سے مانگ کرتے آ رہے ہیں کہ کام کرنے کے حق کو بنیادی حق کے طور پر مانا جائے اس کا مطلب ہوتا ہے کہ حکومت ہر نوجوان کو روزگار فراہم کرے یا اس کو وہ بے روزگاری الاؤنس دینے کی پابند ہو گی اگر اپوزیشن پارٹیوں نے بے روزگاری الاؤنس کی گنجائش اپنے مینی فیسٹو میں شامل کر دی تو وہ بڑی تعداد میں کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔

ارون نہرو جو کسی وقت رنگ کے بیوپاری تھے ایک رنگارنگ شخصیت کے مالک ہیں ارون نہرو بیرونی ملکوں میں ایک ماہ کی چھٹیاں گزار کر واپس آ گئے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں ارون نہرو کی سرگرمیوں کے بارے میں جو خبریں چھپی ہیں ان پر ارون نہرو کو بڑا غصہ ہے ذیل کے انٹرویو میں انہوں نے کافی غصہ اتارا ہے۔

سوال.... آپ کے حالیہ غیرملکی دورے پر بڑی افواہیں پھیلی ہیں کیا واقعی یہ محض تفریحی دورہ تھا یا اس کا کوئی اور مقصد تھا؟

ارون نہرو۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر میں اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ
منانے کے لیے بیرون ملک جاؤں تو اس پر کیوں تنقید یا نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ یہ
بالکل صحیح نہیں ہے کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ نیویارک میں ٹھہرا تھا۔ مجھ
اچھی طرح پتہ تھا کہ انٹیلی جنس والے میرے غیر ملکی دورے میں میرا تعاقب کریں گے۔
میں نے اس سلسلے میں را سیو کو بھی خط لکھ دیا تھا۔

سوال۔۔۔۔ آپ کا جو تعاقب اور نگرانی کی گئی اس میں بتدریج ان کے
جیبلی کے سراغ رساں ادارے آر اے ڈبلیو کا ہاتھ تھا یا راجیو کیمپ نے آپ
سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے پرائیویٹ جاسوس مقرر کیے تھے۔

ارون نہرو۔۔۔۔ اس بارے میں فی الوقت کچھ نہیں کہوں گا بہرحال
جس طرح میرے اور میرے اہل خانہ پر نظر رکھی گئی ہے اسے میں نے پسند نہیں کیا۔

سوال۔۔۔۔ بتایا گیا ہے کہ آپ نے اپنے غیر ملکی دورے پر ۲۰ لاکھ سے
زائد روپیہ خرچ کیا آپ نے اپنی بڑی مقدار میں زر مبادلہ کد سرت حاصل کیا تھا؟

ارون نہرو۔۔۔۔ میں نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہے اس لیے
کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں میری لڑکی غیر ملک میں رہتی ہے اگر میں نے اس
کے پاس جاکر چند دنوں کے لیے قیام کیا تو اس میں کون سا گناہ ہو گیا۔

سوال۔۔۔ کانگریس کے کچھ لوگوں نے آپ پر زر مبادلہ کے قانون کی
خلاف ورزی کا الزام لگایا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔

ارون نہرو۔۔۔ میں نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی میں نے ڈائریکٹر
کو صاف صاف لکھا ہے کہ اگر ان کی حکومت سمجھتی ہے کہ میں نے یا میرے ساتھیوں نے
کسی بھی قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو وہ جلد سے جلد مجھ پر مقدمہ دائر کریں۔

سوال۔۔۔ کچھ لوگ آپ کی سیاسی صلاحیتوں کے بارے میں ایسی رائے
رکھتے ہیں ان کے اندر وہ کہا جاتا ہے کہ آپ اب تک کانگریس کے خلاف اپوزیشن
کو متحد نہیں کر سکے۔

ارون نہرو۔۔۔ بنیادی بات یہ ہے کہ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں ساری
اپوزیشن پارٹیوں پر بڑا دباؤ ہے کہ وہ کانگریس کا مل جل کر مقابلہ کریں مجھے بہرحال
یقین ہے کہ جلد یا بدیر ہمارا مقصد یعنی اپوزیشن کا اتحاد حاصل ہو جائے گا۔
سوال۔۔۔ جنتا دل کی موجودہ حالت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ارون نہرو۔۔۔ میری رائے میں جنتا دل اور نیشنل فرنٹ دونوں ہی کی
طاقت بڑھتی جا رہی ہے اس کا کوئی ثبوت درکار ہے تو وہ کانگریس کی قیادت کی
گھبراہٹ سے مل جاتا ہے اگر وزیر اعظم کو اس کا یقین ہوتا کہ اب ان کی مقبولیت
کا دائرہ بڑھ گیا ہے تو وہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کی اس طرح اجارہ داری کی
کوشش نہ کرتے جیسے کہ اب کی جا رہی ہے نیز اس طرح کے حملے وی پی سنگھ اور این
ٹی راما راؤ اور رام کرشن ہیگڑے پر نہ کیے جاتے جیسے کہ کیے جا رہے ہیں اس سے وزیر اعظم
کے ذہن میں جو گھبراہٹ ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

سوال۔۔۔۔ آپ نے ایک پیش گوئی کی ہے کہ کانگریس کو اگلے چناؤ میں
۱۹۰ سے زائد نشستیں نہیں ملیں گی یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں۔

ارون نہرو۔۔۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ اگر اپوزیشن نے متحد ہو کر کانگریس
کا مقابلہ کیا تو کانگریس کے لیے ۱۹۰ سے زائد نشستیں حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا تاہم زیادہ
انحصار اس پر بھی ہوگا کہ الیکشن سے قبل کیا حالات ہوتے ہیں ویسے عوامی رائے بہت
ڈرامائی طور پر نہیں بدلتی۔

سوال۔۔۔۔ کانگریس اور بی جے پی کے درمیان انتخابی مفاہمت اب کوئی
راز نہیں ہے کیا عام انتخابات میں آپ کانگریس کے خلاف مشترکہ ایک امیدوار کھڑا
کر سکیں گے!

ارون نہرو۔۔۔۔ بی جے پی، مارکسسٹ پارٹی اور جنتا دل کی انتخابی حکمت
عملی کا فیصلہ اخباری بحث کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا ویسے ساری پارٹیاں یہ چاہتی ہیں کہ
کانگریس کو اگلے چناؤ میں شکست دی جائے۔

سوال .... کیا آپ رائے بریلی ہی سے الیکشن لڑیں گے۔ آپ کے بارے میں وزیر اعظم نے کہا ہے کہ آپ کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے گی کیا اس سے ڈر کر الیکشن سے گریز نہیں کریں گے۔؟

ارون نہرو ..... بہتر ہے آپ انتظار کریں اور دیکھ لیں میں اپنی حکمت عملی پر اس طرح سے کھلے بندوں بحث نہیں کر سکتا

سوال .... کچھ اخبار لکھتے ہیں کہ آپ پر سی بی آئی پستولوں کی درآمد کے بارے میں کوئی کیس چلانا چاہتی ہے نیز ٹھکر کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے خلاف شہادت موجود ہے۔

ارون نہرو.... سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن تو اصل میں کانگریس بیورو آف انویسٹی گیشن ہے میں سی بی آئی کے افسروں پر کوئی ریمارک نہیں دوں گا کیونکہ چند لوگوں کو چھوڑ کر ان میں سے زیادہ تر محنت سے اپنا کام کر رہے ہیں اس وقت جو مجرمانہ کام اور جعل سازیاں ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری وزیر اعظم اور ہوم منسٹر چدمبرم پر ہے وہ میرے خلاف جتنے جھوٹے مقدمے چاہے بنالیں اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

غلام نبی آزاد وزیر اعظم راجیو گاندھی کے معتمد اور سب سے زیادہ فعال جنرل سکریٹری ہیں وہ اپنے انٹرویو میں اپوزیشن کے لیے کسی رعایت سے کام نہیں لیتے ان کے بیباکانہ انٹرویو کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

سوال ... ارون نہرو نے کہا کہ کانگریس کو ۱۹۰ سے بڑھ کر لوک سبھا کی نشستیں حاصل نہیں ہو سکیں گی اس کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے۔ آپ نے کوئی سروے اس سلسلے میں کیا ہے۔؟

غلام نبی آزاد ! نہیں ہم نے کوئی سروے اب تک نہیں کیا ہے لیکن اندازے ضرور لگائے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ۲۵۰ سے ۲۸۰ نشستیں اگلی پارلیمینٹ میں ضرور حاصل کریں گے۔

سوال ! آپ کی رائے میں کانگریس کے بعد دوسری بڑی جماعت کون سی ہوگی۔؟

غلام نبی آزاد !... اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پتہ نہیں ہے کہ کون کون سی جماعتیں ساتھ مل کر الیکشن لڑ رہی ہیں اور کون سی علیحدہ علیحدہ؟

سوال ! ارون نہرو کے بیان کے مطابق اپوزیشن کو زیادہ مواقع میں کامیابی کے لئے زائد حلقوں میں راست مقابلہ ہو کیا یہ صحیح ہے۔؟

غلام نبی آزاد ! راست مقابلہ کا تصور غلط ہے۔

دائیں بازو والے بائیں بازو والوں کے ساتھ نہیں جائیں گے بائیں بازو والے فرقہ پرستوں کے ساتھ نہیں جائیں گے اپوزیشن کے ووٹر اپوزیشن کے لیڈروں سے کہیں زیادہ باشعور ہیں۔

سوال ۔ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ مسٹر راجیو گاندھی نے اپوزیشن کے حق میں زیادہ کام کیا ہے جب کہ اپوزیشن نے خود ان کے لیے زیادہ آسانیاں فراہم کی ہیں۔؟

غلام نبی آزاد ! میں نہیں سمجھتا کہ راجیو گاندھی سے کوئی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ ان کے کارنامے موجود ہیں۔ ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد انہوں نے ملک کو مضبوط لیڈرشپ فراہم کی ہے وہ دنیا بھر میں ایک مضبوط لیڈر سمجھے اور مانے جاتے ہیں ملک کے اندر انہوں نے کئی ایسے مسائل حل کر لئے ہیں جو برسہا برس سے یوں ہی چلے آ رہے تھے مثلاً میزورم میں ۲۰ سال سے چلا آنے والا بغاوت کا مسئلہ پنجاب میں بھی راجیو گاندھی نے حالات کو سدھارنے کا کام ٹھیک طرح سے شروع کیا تھا۔

لیکن سنت لونگووال کے قتل کے بعد بعض دشواریاں پیدا ہو گئیں آخر انہوں نے تریپورا آسام گورکھا لینڈ اور تری پورہ کے مسائل کو حل کر دیا۔

سوال ۔ اکاؤنٹنٹ جنرل کی رپورٹ جو بوفورس کی توپوں کے بارے میں ہے اس کا کانگریس کی کامیابی کے امکانات پر کیا اثر پڑے گا۔؟

غلام نبی آزاد! میں نہیں سمجھتا کہ اس سے ہمارے انتخابی امکانات پر کوئی اثر پڑے گا۔ اپوزیشن تمام اہمیت کے سوالات اٹھانے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ انہوں نے بوفورس کے سودے کا معاملہ اٹھایا ہے جس پر کہ پارلیمنٹ میں کئی بار بحث ہو چکی ہے لیکن وہ اب تک کوئی بات ثابت نہیں کر سکے ہیں نہ کسی طرح کا کرپشن ثابت ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپوزیشن کے پاس نہ تو مسائل ہیں نہ پروگرام ہے نہ کوئی نقطۂ نظر ہے۔

سوال۔ اپوزیشن نے وزیر اعظم کے استعفیٰ کا جو مطالبہ کیا ہے اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

غلام نبی آزاد! یہ مطالبہ قطعی غیر جمہوری ہے حکومت بوفورس کیس پر پارلیمنٹ میں بحث کرنے سے کیوں انکار کرتی ہے۔ اپوزیشن نے پارلیمنٹ میں جو زبان اختیار کی اور راجیو گاندھی کے خلاف جو نعرے لگائے گئے ان پر خود اپوزیشن کو شرمسار ہونا چاہیئے۔ ہم نے پیش کش کی تھی کہ ہم رپورٹ پر بحث کریں گے کیوں کہ ہم نے ذہن کو ہمیشہ کھلا رکھا ہے اور اپوزیشن کو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر نقطۂ نظر کو ابھارنے سے نہیں روکا ہے۔

سوال: اپوزیشن عوامی بھلائی کے اور کون سے مسائل اٹھا سکتی تھی۔؟

غلام نبی آزاد! ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور اس کے مسائل بھی گوناگوں ہیں۔ اپوزیشن نے اس وقت جب کہ ملک بدترین سوکھے سے دوچار تھا راجیو گاندھی سے استعفیٰ کا مطالبہ کر کے غریبوں کے خلاف کام کیا تھا۔ کانگریس پارٹی کا ہر آدمی اور وزیر اعظم مصیبت زدہ لوگوں کو مدد دینے کے لیے کام کر رہے تھے۔ سوکھے کے سلسلے میں ریلیف کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے چیرمین پنڈت کملاپتی ترپاٹھی جی تھے۔ اپوزیشن نے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے ایک پیسہ یا اناج کا ایک تھیلا بھی جمع نہیں کیا جب اپوزیشن کے لیڈر لندن اور نیویارک سے بیان دیتے ہیں اور غیر ملکی پریس اپلٹے کرتے ہیں تو وہ اپنی آمدنی کا ۱۰۰ / ا حصہ تو سوکھے کے اثرات دور کرنے کے لیے خرچ کر سکتے تھے

یعنی مسئلہ صرف یہ ہے کہ اپوزیشن کو ہندوستانی عوام کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کو صرف کرسی سے مطلب ہے۔

سوال: ہندی علاقے میں کانگریس کی پوزیشن کیا ہے۔ یوپی اور بہار سے لوک سبھا کی سیٹوں کی بڑی تعداد چنی جائے گی وہاں وی پی سنگھ کا کتنا اثر ہے۔

غلام نبی آزاد! میں اس علاقے میں وی پی سنگھ کے اثر کا اندازہ نہیں کر سکا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے کوئی بھی جلسہ خاص اپنے لوگوں کی مدد سے نہیں کیا ہے۔ وہ دوسروں کی جانب سے بلائی ہوئی میٹنگوں میں تقریر کرتے ہیں بمبئی میں وسنتا سامنت اور نرد بوشی ان کے لیے میٹنگ بلاتے ہیں تامل ناڈو میں ڈی ایم کے جلسہ کرواتی ہے۔ آسام میں آسام گن پریشد اور آندھرا میں تلگو دیشم وہ ایک بیڑی کی مانند ہیں جن کو کسی نہ کسی نئے ذریعے سے روزانہ چارج کرنا پڑتا ہے۔ ہم ہندی علاقے میں ضرور بھی کامیابی حاصل کریں گے۔

بھارتی انتخابات میں مسلم ووٹروں کی خاموش اکثریت بھی فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔ اس مرتبہ گو کہ کانگریس اور جنتا دل دونوں نے ہی مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی حکمت عملی تیار کر رکھی ہے لیکن بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا ہے۔ کہ مسلمان ماضی کی طرح کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ ماضی کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ بھارت کی ہر سیاسی جماعت نے مسلمانوں سے جھوٹے وعدے کر کے ووٹ لیے اور ان کی اصلاح کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس مرتبہ مسلمان ووٹ بٹ جائیں گے اور کوئی ایک جماعت یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ اس کی جھولی میں پڑے ہیں۔

موروثی سیاست کا خاتمہ

مطبوعہ: ۸ دسمبر ۸۹

بھارتی انتخابات اپنے انجام کو پہنچے اور مرکزی اسمبلی لوک سبھا کے لیے بھارتی عوام نے توقعات اور پہلے سے قائم کردہ اندازوں کے عین مطابق کانگریس کو رد کرتے ہوئے اپوزیشن کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے جیسا کہ سیاسی مبصرین نے کرپشن چور بازاری اور رشوت کے الزامات مسٹر راجیو گاندھی پر لگاتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ اس مرتبہ وہ اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والی جماعت کے سربراہ تو بن جائیں گے لیکن دوبارہ راج سنگھاسن کی گدی پر فائز ہونا ان کے لیے ممکن نہیں ہو گا اور یہی ہوا۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق جنتا دل کے راہنما مسٹر وشوا ناتھ پرتاب سنگھ کو بھارتی صدر مسٹر وینکٹ رامن نے حکومت بنانے کی دعوت دی ہے۔ اس طرح مسٹر وی پی سنگھ اب بھارت کے وزیر اعظم بن گئے ہیں اور بھارتی آئین کے مطابق انہیں اگلے ۳۰ دن میں پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا ہو گا۔

ستم ظریفی قدرت ملاحظہ کیجئے کہ وی پی سنگھ جو کبھی کانگریس حکومت میں وزیر خزانہ اور پھر وزیر دفاع کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ کانگریس مخالف اور مضبوط ترین راہنما کی شکل میں سامنے آئے اور آج انہوں نے اپنے ماضی کے وزیر اعظم اور سب سے بڑے سیاسی حریف کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ وی پی سنگھ سیاست میں اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ایک خاص شہرت کے حامل ہیں ان کے شدید ترین مخالفین بھی ان کی سیاسی مستقل مزاجی اور مسائل کو قومی تناظر میں سمجھنے

قابلیت سے انکار نہیں کرتے۔

وی پی سنگھ جنہیں مسٹر کلین بھی کہا جاتا ہے کانگریس حکومت میں وزیر خزانہ تھے اور جب انہوں نے راجیو گاندھی کے ان دوستوں کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا جو قومی خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے تو راجیو گاندھی ان کے مخالف بن گئے۔ یہیں سے اصل میں دونوں میں اصولی اختلاف کا آغاز ہوا۔ راجیو گاندھی نے وی پی سنگھ کا پورٹ فولیو تبدیل کر کے انہیں وزیر دفاع بنا دیا۔ اس پر بھی وی پی سنگھ کی راجیو گاندھی سے نہ نبھ سکی اور بالآخر انہوں نے ۸۷ء میں کانگریس سرکار سے استعفیٰ دے دیا۔ اس استعفیٰ کی وجہ ان کے اصولی اختلافات تھے۔ وی پی سنگھ نے اعلان کیا کہ راجیو گاندھی کے دوست اپنے وزیر اعظم ساتھی کی آشیر باد سے قومی خزانہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ راجیو گاندھی کی تباہی کا باعث بننے والے "بوفورس سکینڈل" کا آغاز وی پی سنگھ سے ہوا تھا۔ وی پی سنگھ جب وزیر دفاع تھے تو انہوں نے دفاعی پالیسیوں کی اپنی مرضی اپنانا شروع کی جس پر ان کے راجیو گاندھی سے اختلافات بہت بڑھ گئے کیونکہ وہ بوفورس توپوں کا سودا حکومت کی مرضی کے مطابق کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ بوفورس کا سودا ہوا اور ایک بھارتی اخبار "ہندو" نے اس پر واویلا مچایا اور بوفورس کا سکینڈل منظر عام پر آ گیا۔

"ہندو" کی رپورٹ کے مطابق بھاری توپوں کے اس سودے میں مسٹر راجیو گاندھی کی آشیر باد سے امیتابھ بچن فیملی کے لوگوں نے کروڑوں روپے رشوت کھائی اور اس رشوت میں راجیو گاندھی باقاعدہ حصہ دار تھے۔ اس سکینڈل کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اخبار نے سویڈن سے باقاعدہ ثبوت حاصل کئے اس کے بعد ہی پھر کانگریس نے شور کر دیا کہ وی پی سنگھ دراصل سی آئی اے کے آدمی ہیں اور انہیں بھارتی وزیر اعظم کا تختہ الٹنے کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ بھارتی اخبارات نے یہ الزام بھی لگایا کہ سویڈن سے بوفورس توپوں کے سودے والی انتہائی خفیہ فائلیں برآمد کروانے

میں کبھی سی آئی اے نے ہندو اخبار سے تعاون کیا اور یہ کارنامہ اپوزیشن کے ذریعے انجام پایا ہے۔

وی پی سنگھ کے سیاست میں جلد ممتاز مقام حاصل کرنے کی وجہ ان کا ماضی ہے۔ جب وہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے تو یو پی کے سرحدی اضلاع خصوصاً چمبل گھاٹی میں ڈاکوؤں کی کارروائیاں اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھیں۔ دیہاتی ڈاکوؤں کے ہاتھوں بہت پریشان تھے اور وی پی سنگھ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکوؤں سے عوام کو نجات دلائیں گے جب وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے اور ڈکیتی کی وارداتوں میں کمی نہ ہوئی تو وی پی سنگھ نے وزارت اعلیٰ کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ کانگریس میں رہنے کے باوجود کانگریس کی عوام دشمن پالیسیوں پر ہمیشہ تنقید کرتے رہے۔

وی پی سنگھ خود راجپوت مہاراجہ ہیں۔ وہ ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے اور صرف دس سال کی عمر میں جب وہ اپنے چچا کے لے پالک تھے تو دایا کی نواحی ریاست "منڈا" کے ولی عہد نامزد ہو گئے۔ وی پی سنگھ راجپوت ہندو ہونے کے باوجود بھارتی اقلیتوں کے خلاف ہندوؤں کے غیر انسانی سلوک کے ہمیشہ شاکی رہے ہیں اور انہوں نے کئی مرتبہ کانگریسی زعما کی ناراضی مول لے کر بھی اقلیتوں کی حمایت کی۔

۱۹۸۸ء میں وی پی سنگھ نے راجیو گاندھی کو ہٹاؤ اور بھارت کو بچاؤ کے نعرہ سے اپنی اپوزیشن سیاست کا آغاز کیا اور جن مورچہ کے نام سے تحریک چلائی۔ اسی درمیان ایک ضمنی انتخاب میں انہیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی اس کے بعد انہوں نے جنتا دل کے نام سے باقاعدہ سیاسی پارٹی قائم کر دی۔

وی پی سنگھ اپنی مسحور کن مسکراہٹ اور جادو بیان مقرر کی حیثیت سے بھارتی عوام میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے ہیں۔ انہوں نے بھارتی عوام خصوصاً لوئر کلاس کے ہندو ہریجن کا دل جیتنے کے لیے مہاتما گاندھی کے انداز میں اپنی ایک تصویر بنائی جس نے عوام کے دلوں میں ان کے لیے مزید جگہ پیدا کر دی اور سادہ لوح انہوں نے وی پی سنگھ کو بھی گاندھی کا جانشین سمجھنا شروع کر دیا۔ وسطی ہند کے ہندو راجہ کا بیٹا وشوا ناتھ پرتاب

سیکولر ذہن کا مالک ہے۔ وہ عوام کے دل تقریر کے ذریعے جیتنے کا فن جانتے ہیں۔ جلسوں میں وہ راجیو خاندان کو کرپٹ اور خود کو "کلین" کہا کرتے تھے۔

وی پی سنگھ ۱۹۷۱ء میں الہ آباد کے حلقے سے پہلی مرتبہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے ۱۹۸۰ء میں انہوں نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ حاصل کیا اور یہاں سے استعفیٰ دینے کے بعد مرکز میں وزیر تجارت بنے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب راجیو گاندھی نے حکومت قائم کی تو انہیں وزیر خزانہ کا عہدہ دیا جس کے بعد وہ وزیر دفاع بنے اور پھر کانگریس کو خیر باد کہہ دیا۔ ان کے خلاف کانگریس نے جو آخری تیر چلایا وہ وی پی سنگھ کے سی آئی اے کے ایجنٹ ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس سلسلے میں کانگریس کے حامی تقریباً سب ہی اخبارات نے باقاعدہ مہم کا آغاز کیا لیکن عوام جان چکے تھے کہ یہ الزام برائے الزام ہے اور کانگریس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا۔

بھارتی انتخابات میں جنتا دل گو کہ واحد اکثریتی پارٹی کی حیثیت حاصل نہیں کر سکی اور بی جے پی نے بھی خاصی سیٹیں حاصل کی ہیں لیکن اس کے بعد بھارتی سیاسی حلقوں میں یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ آخر صدر وینکٹ رامن کس پارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت دیں۔ صدر کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کانگریس کے ایک حصے کی طرف سے واحد اکثریتی پارٹی ہونے کے ناطے یہ مطالبہ سامنے آیا تھا کہ صدر انہیں حکومت بنانے کی دعوت دیں لیکن جنتا دل بی جے پی اور کمیونسٹ اپوزیشن کے ان نمایاں گروپوں کی طرف سے کانگریس سے تعاون نہ کرنے کے اعلان کے بعد بھارتی صدر پر واضح ہو گیا کہ راجیو گاندھی کو حکومت کی دعوت دینا غلط بات ہے اور بھارتی عوام نے کانگریس کے خلاف فیصلہ دیا ہے اس لیے اپوزیشن کو ہی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔

اس مرحلے پر پھر اختلافات نے سر اٹھایا۔ خود جنتا دل میں دیوی لال اور چندر شیکھر بھی وزارت عظمیٰ کے امیدوار تھے اور دوسری طرف بی جے پی اور کمیونسٹ پارٹی ایک دوسرے کے خلاف اتنی شدت سے الزام تراشیاں کر رہی تھیں کہ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ بی جے پی ایک ہندو انتہا پسند جماعت ہے۔

جسے کمیونسٹ اقلیت دشمنی اور بابری مسجد مسئلے کے لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔
اس پیچیدہ صورتحال کے پیشِ نظر یہ امید پیدا ہو چکی تھی کہ اپوزیشن کے اکٹھے ہو جانے کی وجہ سے "شاید کانگریس کو دوبارہ جوڑ توڑ کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے کا موقع مل جائے یا پھر قومی حکومت کی تجویز زیرِ بحث آتی لیکن فیصلہ بالآخر جنتا دل کے حق میں ہوا۔
وی پی سنگھ کا بطور پارلیمانی لیڈر انتخاب بھی ایک سیاسی ڈرامہ ہے کہا جاتا ہے چندر شیکھر مسٹر سنگھ کے پارلیمانی لیڈر ہونے کے شروع ہی سے مخالفت کرتے آئے ہیں اور وہ خود یا پھر ہریانہ کے دیوی لال کو وزیرِ اعظم بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا رویہ اتنا انتہا پسندانہ تھا کہ جب جنتا دل کے پارلیمانی گروپ کا اجلاس ہوا تو وہ ناراض ہو کر اجلاس کا بائیکاٹ کر کے گھر چلے گئے تھے۔ چندر شیکھر کے رویے سے اس بات کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ اس مرحلے پر دیوی لال نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کیا اور اپنے پارلیمانی لیڈر ہونے کا اعلان کر دیا جس کی تائید چندر شیکھر نے کی۔ تالیوں کی گونج ابھی کم نہیں پڑی تھی کہ دیوی لال نے اپنی طرف سے وی پی سنگھ کو پارلیمانی لیڈر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی دعوت دی جس کی تائید جنتا دل کے سیکرٹری مسٹر اجیت سنگھ نے کر دی۔ چندر شیکھر کے لیے یہ چونکا دینے والی کارروائی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دیوی لال نے کہا کہ وہ گاندھی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اب تا عمر عوام میں جا کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ دو دسمبر کو انہوں نے وزیرِ اعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وی پی سنگھ اپنی حکومت برقرار بھی رکھ پائیں گے! اور پاکستان پر اس حکومت کے قیام سے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جہاں تک وی پی سنگھ کے حکومت کرنے کا تعلق ہے۔ تو کانگریس پارلیمانی لیڈر مسٹر راجیو گاندھی نے اپنی والست میں اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کا فیصلہ اسی امکان کے پیشِ نظر کیا ہے۔ اپوزیشن نے اندرا گاندھی کی حکومت سنبھالی تھی اور تین سال بعد ہی نئے انتخابات ہو گئے تھے اس مرتبہ بھی اپوزیشن والے مل کر نہیں چل سکیں گے۔ بظاہر راجیو گاندھی کی یہ سوچ کسی حد تک صحیح دکھائی

تی ہے کیونکہ اپوزیشن کے دو بڑے گروپ جنتا دل اور بی جے پی متضاد نظریات ے حامل ہیں۔

بی جے پی ایک انتہا پسند ہندو جماعت ہے جس نے کھلم کھلا بھارت میں رام راجیہ کا نعرہ بلند کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو ئی سوچ ہندی بنانا ہو گی اور ہندو ہی کو ہندوستان میں رہنے کا حق ہے۔ اس جماعت نے بابری مسجد کو رام جنم بھومی بنا کر یہاں مندر کا سنگ بنیاد رکھا اور اپنے منشور میں یہاں رام مندر بنانے کا اعلان بھی کیا یہ لوگ ہندو راج قائم کرنے کے درپے ہیں۔
کمیونسٹ پارٹی نے اپنی ہر سٹیج سے بی جے پی کی مخالفت کی اس جماعت کو اقلیت دشمن قرار دیا ہے یوں بھی کمیونسٹ سیکولر ہونے کے دعویدار ہیں۔
جہاں تک جنتا دل کا تعلق ہے تو اس کو سیکولر کے بجائے معاملہ فہم جماعت کہا جائے بہتر ہو گا کیونکہ جنتا دل نے بابری مسجد کے مسئلے پر صرف یہ کہا کہ متحارب گروپوں کو الگ مطمئن کیا ہے۔ یہ وی پی سنگھ کی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے ایک ہی وقت ہندو اور مسلمان ووٹرز کی ہمدردیاں حاصل کیں لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قبل میں انتہا پسند ہندو خصوصاً بی جے پی کی مرضی کے بغیر کچھ کر پائیں گے۔
بابری مسجد جنتا دل کے لیے بہت بڑا امتحان ثابت ہو گی اور عین ممکن ہے کہ اسی ایک مسئلے پر جنتا دل اور بی جے پی اختلافات کا شکار ہو جائیں۔ جبکہ کمیونسٹوں کا اپنا ایک اندازِ سیاست ہے اور وہ کسی کے ساتھ مل کر چلنے کو تیار نہیں جہاں تک مسلمان ووٹرز کا تعلق ہے جنہوں نے جنتا دل کو ووٹ دیئے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی ایک مخصوص فضا میں ہی مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا اور بابری مسجد اور سارے واقعات اس کا باعث ہے اگر مسلمانوں نے اس امید پر کانگریس کو رد کیا ہے کہ جنتا بابری مسجد کے مسئلے پر ان کی مدد کرے گی تو یہ خام خیالی ہے۔
نئی حکومت کو بھارت کی علیحدگی پسند تحریکوں خصوصاً پنجاب، کشمیر اور آسام میں ہند تحریکوں کا سامنا ہے اور یہ مسائل اسے ورثے میں ملے ہیں۔

بادی النظر میں دکھائی تو یہی دیتا ہے کہ کانگریس کی حکمت عملی ٹھیک ہے۔ برجنہ حکومت شاید زیادہ عرصہ نہ چل سکے اور بھارتی عوام ایک مرتبہ پھر نہرو خاندان کو تخت پر مسلط کر لیں لیکن فی الوقت یہی نظر آ رہا ہے کہ نہرو خاندان کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور بھارتی عوام نے موروثی سیاست کو ختم کر کے مسائل کے حوالے سے سیاست کا آغاز کیا ہے۔

وزیر اعظم وی پی سنگھ نے کہا ہے کہ وہ خارجہ پالیسی میں بھی نئی ترجیحات کا تعین کریں گے جن میں ہمسایوں سے بہتر تعلقات اور سری لنکا سے بھارتی فوج کی واپسی سرفہرست ہے یہ بھی ممکن ہے کہ راجیو گاندھی نے جنوب مشرقی ایشیا میں بھارت کی بادشاہت کا جو خواب دیکھا تھا اور جس طرح وہ بھارتی سینوں کو مضبوط کر رہے تھے تاکہ ہند مہاساگر میں اپنی عملداری قائم کر سکیں اب شاید وہ خواب ادھورا ہی رہے اور معاملات کم از کم اپنی جگہ ٹھہر جائیں۔ اس طرح ایک بات تو بہر حال کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کو بھارتی جارحانہ عزائم سے کچھ عرصے کے لیے مہلت مل گئی ہے اب اس مہلت کا فائدہ کس طرح اٹھایا جائے پاکستانی حکومت کو اس سوال کا جواب اپنے اعمال کی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا۔

خون مسلم کی ارزانی

دنیا بھر میں گلا پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوری سیکولر حکومت ثابت کرنے والی بھارت سرکار نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کی جو شرمناک مہم شروع کر رکھی ہے اس کے متعلق یہ مضامین بھارتی اخبارات ہی سے اخذ کیے گئے تھے جن سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ آج کے اس ترقی یافتہ اور مہذب دور میں دنیا میں ایسی غیر انسانی مخلوق بھی آباد ہے جسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے فن پر کمال حاصل ہے اور جھوٹ کو آتنا شدت سے سچ بتانے پر تلی ہوئی ہے کہ جدید دور کا انسان بھی اس کی اس دھوکہ دہی سے نہیں بچ سکا۔

مسلمان بچے رامائن پڑھنے پر مجبور

مطبوعہ: ۲۶ مئی ۱۹۸۹ء

دلی کے سرکاری سکولوں کی چھٹی اور ساتویں جماعتوں میں دو کتابیں سنکچھیت رامائن اور سنکچھیت مہابھارت پڑھائی جا رہی ہیں۔ یہ کتابیں اکثریتی فرقے کے طلباء کے علاوہ مسلم طلبا اور دوسری اقلیتوں کے طلبا کو بھی پڑھائی جا رہی ہیں۔ ابھی تک سنکچھیت رامائن سکولوں میں پڑھائی جا رہی تھی اب ایک دوسری کتاب سنکچھیت مہابھارت بھی سکولوں کے نصاب میں شامل کر دی گئی ہے۔ آج سے ۹ ماہ قبل جب دہلی ایڈمنسٹریشن نے مرکزی حکومت کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور اردو اخبارات نے سب سے پہلے اس

معاملے کو اٹھایا تھا تو اس وقت محض سنکچھیپت رامائن پڑھائے جانے کا معاملہ سامنے آیا تھا لیکن اب دوسری کتاب سنکچھیپت مہابھارت بھی نصاب میں شامل کر دی گئی ہے۔ دہلی ایڈمنسٹریشن نے اپنے زیر انتظام تمام سکولوں کی چھٹی اور ساتویں جماعت کے لئے ہندی نصاب میں معاون کتاب کی شکل میں ان دونوں کتابوں کو شامل کیا ہے۔ اب ایک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو گیا ہے ہم نے تو حکومت کی توجہ ایک کتاب کی طرف دلائی تھی اس پر تو کیا عمل ہوتا ایک دوسری کتاب اور نافذ کر دی۔ ایسا لگتا ہے کہ یا تو پوری گاندھی کی کانگریس خودکشی پر آمادہ ہے یا پھر جان بوجھ کر کچھ عناصر کانگریس کو اندھے کنویں میں دھکیل رہے ہیں۔ آج کانگریس جس حالت میں ہے اسے برسر اقتدار رہنے کے لئے ملک کی اقلیتوں، کمزور طبقات، پسماندہ عناصر اور سیکولر طاقتوں کی مدد و حمایت کی ضرورت ہے۔ لیکن کانگریس ایک کے بعد ایک ایسا قدم اٹھا رہی ہے جس کے نتیجے میں ملک کی اقلیتیں اور سیکولر عناصر اس سے دور ہوتے چلے جائیں۔ کانگریسیوں کو اگر یہ غلط فہمی ہے کہ ہندو بنیاد پرستی اور مذہبی احیا پرستی کو ہوا دے کر وہ ہندوؤں کے ووٹ اور حمایت حاصل کر سکے گی تو وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہاں معاملہ الٹا ضرور ہو سکتا ہے۔ اور اقلیتیں بالخصوص مسلمان اس سے دور ہو جائیں گے اور یہ کانگریس کے لئے گھاٹے کا سودا ثابت ہو سکتا ہے۔ کانگریس اس وقت ایک دوہرے چہرے والی جماعت بنتی جا رہی ہے اور ان تمام اصولوں کو رفتہ رفتہ چھوڑ رہی ہے جس پر اس کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ رامائن اور مہابھارت مذہبی کتابیں ہیں مذہبی کتابیں ہونے کا احترام اپنی جگہ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ایک مخصوص فرقے کے مذہبی جذبات سے تعلق رکھتی ہیں کسی ایسے موضوع کو جس کا تعلق کسی خاص فرقے کے مذہب سے ہو ابتدائی تعلیم کا لازمی جزو بنا دینا سیکولر اقدار اور آئین میں درج سیکولرازم کے اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل تحریر کیا جا چکا ہے ان کتابوں کو این سی ای آر ٹی (قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت) نئی دہلی نے تیار کیا ہے۔ ان کتابوں کے آخر میں کچھ اشلوک

دیئے گئے ہیں جنہیں بچوں کو زبانی یاد کرنا ہے۔ دوسری ریاستی حکومتوں کا علم نہیں انہوں نے اپنے یہاں کیا کیا ہے۔ البتہ این سی ای آر ٹی کا تیار کردہ نصاب جن سکولوں میں رائج ہے وہ سب کے سب اس کے پابند ہیں نئی دنیا نے اپنے ۸ جولائی ۱۹۸۸ء کے شمارے میں اس مسئلے کو اٹھایا تھا اور صفحہ اول پر شہ سرخیوں کے ساتھ اسے پیش کیا تھا جو مضمون اس سلسلے میں سپرد قلم کیا گیا تھا اس کی سرخیاں تھیں نئی تعلیمی پالیسی کے تحت بچوں کے لیے رامائن کی تعلیم لازمی سیکولر ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل نئی دنیا میں اس مضمون کی اشاعت کے بعد برسر اقتدار کانگریس آئی کے بعض افراد نے اس سلسلے میں احتجاج کیا تھا۔ ابھی حال ہی میں بہادر ریہ دلبش کانگریس کمیٹی کے اور کل ہند قومی تنظیم کے صدر طارق انور ایم پی نے وزیر تعلیم اور وزیر ابلاغ کو اور دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اور چیف ایگزیکٹو کونسلر کو خطوط ارسال کیے تھے جس میں اس فیصلے کو ہندوستان کے جمہوری دستور کی خلاف ورزی کہا گیا تھا لیکن آج تقریباً نو مہینہ کا عرصہ ہونے کو آ رہا ہے اور سکولوں کا دوسرا نصابی سال شروع ہونے جا رہا ہے۔ لیکن دہلی کے کانگریس آئی کے زیر اقتدار ایڈمنسٹریشن کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی بلکہ اس نے سنکچھیپت مہابھارت کو بھی نصاب میں شامل کر لیا۔

اذان پر پابندی

مطبوعہ: ۱۴ر اپریل ۱۹۸۹ء

آزادی کے بعد سے اب تک بھارت میں اسلام دشمن طاقتوں نے جس انداز پر مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھائے ہیں اور انہیں اسلامی تعلیمات سے دور کرنے کی مذموم کوششیں کی ہیں وہ مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں نصابی کتابوں سے ہمارے اسلاف کے سوانح حیات و کارکردگی کو حذف کر کے ہندوؤں کے سنت اور پیشواؤں کا ذکر، مسلم طلبا پر ہندوازم مسلط کرنے کی سنگین سازش ہو رہی ہے۔ حکومت کے ہر محکمے میں موجود

اسلام وسلم دشمن عناصر نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا ہے۔ انہیں مسلسل نظرانداز کیا جا رہا ہے اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ شکنی کی پرزور سازش ہو رہی ہے اور آج فرقہ پرست و فاشسٹ مسلمان دشمن جماعتیں، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس ہندو مہاسبھا اور شیو سینا مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر رہی ہیں اور مسلمانوں کی حرکات و سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے اور انہیں ملک دشمن سرگرمیوں سے تعبیر کرنے کی مہم چلا رہی ہیں وہ اس سیکولر اور جمہوری ملک کے ماتھے پر کلنک ہے اور سیکولر حکومت کا دعویٰ کرنے والی یہ حکومت بھی ان شرپسند لوگوں کے ہاتھوں بک چکی ہے۔ ارباب حکومت ہیں موجبہ و ہندو کارندوں کو کھلی آزادی دے رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ بابری مسجد کی بازیابی سے لے کر متھرا کی عیدگاہ تک مسلمانوں کے جذباتی مسائل کو مسلسل آگ دکھائی جا رہی ہے عائلی قوانین پر حملہ قرآن پر مقدمہ دائر کرنے والے کی پشت پناہی تک معاملہ موقوف نہیں بلکہ بابری مسجد کا مسئلہ التوا میں ڈال کر مسلمانوں کو محض بے چینی و پریشانی میں مبتلا رکھنے کے سوا کچھ نہیں۔

حکومت نے اب انہیں کارندوں کے دباؤ و اشارے پر کھل کر مسلمانوں کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی واضح مثالیں ملک کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن ملک کے سب سے بڑے کاسموپولیٹن شہر بمبئی میں حکومت میونسپل کارپوریشن اور پولیس نے جو شدت کہ مسلم مخالف محاذ بنایا ہے وہ مستقبل میں مسلمانوں کے لیے انتہائی بھیانک ثابت ہو سکتا ہے۔ مہاراشٹر حکومت مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اذان دینے اور نماز پڑھنے پر پابندی لگانے کا پہلا تجربہ کر رہی ہے شیو سینا بمبئی میونسپل کارپوریشن پر قابض ہونے کے بعد سے ہی شہر کی مسجدوں کو غیر قانونی تعمیرات کا نوٹس اور اس کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کر رہی ہے اور شہر کی ۲۶۷ مساجد میں سے ۲۵۶ مساجد کو غیر قانونی بتایا ہے جبکہ تقریباً ۱۱۱ مساجد پر غیر قانونی تعمیرات کا نوٹس اور ۵۲ مساجد کو وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا ہے۔ بمبئی میونسپل کارپوریشن کی اس شر انگیزی سے مسلمان دل برداشتہ ہو کر ابھی اس کے خلاف جلسے جلوس و احتجاج کی تیاریاں

ہی کر رہے تھے کہ حکومت مہاراشٹر کی ایماء پر بمبئی پولیس کمشنر نے شہر کے تمام علاقائی پولیس سٹیشنوں کو ہدایت کی کہ کسی بھی مسجد میں پولیس کا اجازت نامہ حاصل کیے بغیر لاؤڈ سپیکر پر اذان دینے کی قطعی اجازت نہ دی جائے کمشنر کے اس سرکلر سے آج پوری بمبئی میں ہیجان کا ماحول ہے کیونکہ مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر سے اذان دینے کی اب تک کھلی آزادی تھی انگریزوں کے زمانے میں جب ہم غلام تھے اس وقت بھی لاؤڈ سپیکر پر اذان دینے کی آزادی تھی لیکن حکومت نے اچانک اس کا فیصلہ کر کے مسلم دشمن تحریک اور ہندوازم مستحکم کرنے کا ثبوت دیا ہے جبکہ کسی بھی مندر پر لاؤڈ سپیکر سے بھجن کیرتن پر پابندی عائد نہیں ہوئی تو پھر انہیں اجازت لینے کی ضرورت ہے اس سے مستثنیٰ رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ تمام حرکات مسلم دشمنی سے وابستہ ہیں۔ پولیس کے سرکلر کے مطابق ہر مسجد میں الگ الگ پابندی لگائی گئی ہے کسی مسجد کو ۱۱ ماہ تک کا اجازت نامہ دیا جا رہا ہے تو کسی مسجد کو صرف ایک ماہ کے لیے مطلب یہ کہ آپ ہر گیارہ ماہ بعد اور کہیں کہیں ہر ماہ پولیس سٹیشنوں کے چکر لگاتے رہیں اور پھر پولیس کے اس اجازت نامے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ وہ جن شروط طریقوں پر اجازت نامہ دے رہی ہے، اسے نقص امن کے نام پر کبھی بھی منسوخ کر سکتی ہے۔

بمبئی شہر کے مسلمان اس وقت جس کسمپرسی کی حالت میں ہیں اتنی کسمپرسی شاید بابری مسجد کی بازیابی کے لیے بھی نہ ہو۔ پولیس کا یہ سرکلر اس وقت مسلمانوں کے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند ہے اور مہاراشٹر کے دو مسلم وزراء بھی پروفیسر جاوید خاں اور ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا چپ سادھے بیٹھے ہیں جب مساجد کے منتظمین اور مختلف مسلم تنظیمیں اس مسئلے پر ان سے رجوع ہوتی ہیں تو یہی جواب ملتا ہے کہ اگر پولیس با آسانی اجازت نامہ دے رہی ہے تو اسے حاصل کرنے میں کیا قباحت ہے وزیر داخلہ ویلاس ساونت جنہیں مسلم نواز وزیر کہا جاتا ہے ان کا بھی موقف واضح نہیں وہ بھی دبی آواز میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کمشنر کو ہدایت کر دیں گے کہ اجازت نامہ جاری کرنے میں کوئی دشواری نہ پیدا کریں۔

یہ بات سچ ہے کہ بمبئی کے ہر پولیس سٹیشن سے لاوڈ سپیکر پر اذان دینے کا آسانی سے اجازت نامہ دیا جا رہا ہے اور پولیس کا یہ کہنا بھی ہے کہ "اس سے کچھ نہیں لیکن رسماً اس کا بنوا لینا بہتر ہے حالانکہ سرکار اذان پر پابندی لگانے کے بارے نہ تھی اور نہ ہے"۔ پولیس کے یہ حلفے اور سرکلر میں درج شرائط یقیناً خطرناک ہیں۔ پولیس شہر میں کچھ اور مضافات میں الگ شرائط رکھی ہیں ان میں اہم یہ ہیں۔

۱۔ ۔۔۔۔ لاوڈ سپیکر پر اذان کی آواز دھیمی رکھی جائے۔

۲۔ ۔۔۔۔ لاوڈ سپیکر کا منہ مین روڈ کی جانب نہ ہو۔

۳۔ ۔۔۔۔ مسجد کے اطراف آباد لوگوں کو اس سے تکلیف نہ ہو۔ سپیکر باکس لگے ہوں اور اذان مندرجہ ذیل اوقات میں ہی دی جائیں۔

فجر صبح ۶ بجے، ظہر دوپہر ۱ بجے، عصر شام ۵ بجے، مغرب شام ۷ بجے، عشا ۸ بجے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نماز کے اوقات میں کمی زیادتی رہتی ہے اس بنا سے ہم گرفت میں آ جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اگر مسجد کے پڑوس میں کوئی غیر مسلم آباد ہے اور اذان کی تیز آواز کے خلاف کورٹ میں گیا تو ہم جن چند مشروط طریقوں کے پابند ہو کر اجازت نامہ لیتے ہیں اس کی خلاف ورزی ہوگی اور ہم سزا کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے یہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر لاوڈ سپیکر کی آواز دھیمی رکھی تو لاوڈ سپیکر پر اذان دینے کا کیا ہوا؟

شہر کے مضافاتی علاقے جوگیشوری گورے گاؤں، ملاڈ اور کاندیولی وغیرہ میں اجازت نامے پر بہت سخت شرائط ہیں اس لیے ان علاقوں کے تقریباً متولیان نے ہنگامی میٹنگ میں احتجاج کا فیصلہ کیا اور پولیس کے اجازت نامے کے بغیر اذان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سخت اور شدید رویے کا اثر یہ ہوا کہ ملاڈ میں واقع ایک مسجد سے پولیس نے لاوڈ سپیکر اتروا دیا آج وہاں بغیر لاوڈ سپیکر کے اذان ہو رہی ہے۔

دوسری اہم بات جو مسلمانوں میں شدت پیدا کر رہی ہے وہ یہ کہ مضافات

کے ان علاقوں میں جہاں کثیر تعداد میں جھونپڑے ہیں اور مسلم اکثریت ہے وہاں جو بھی عربی مدارس چلائے جا رہے ہیں اس کی نگرانی میں مدرسے میں پنج وقتہ نماز کا اہتمام کیا گیا ہے جسے بمبئی میونسپل کارپوریشن نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ایسی جگہوں پر نماز کی پابندی لگائی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مدرسے میں نماز پڑھ کر اسے مسجد میں تبدیل کرنے کی سازش ہو جاتی ہے اگر کسی مدرسے کے ایک گوشے کو مسجد کی شکل دی گئی تو فوری طور سے کارپوریشن نوٹس جاری کر دیتی ہے۔ مضافات میں ایسی تقریباً ۹۸ مساجد ہیں جو مدرسوں کے زیر نگرانی ہیں انہیں پولیس نہ لاوڈ سپیکر کا اجازت نامہ دے رہی ہے اور نہ ہی کارپوریشن اسے تسلیم کر رہی ہے بمبئی کی وہ مساجد جو سو سال، پچاس سال یا ۲۵ سال پرانی ہیں ان کا تعمیری منصوبہ اور کارپوریشن کا اجازت نامہ طلب کیا جا رہا ہے۔ غرض کہ ایک ایک کر کے وہ تمام پابندی مسلط کی جا رہی ہیں جو ۱۴۰۰ سال قبل عرب کی سرزمین میں آنحضورؐ کے زمانے میں مشرکین مکہ نے کیا تھا۔ ان حالات میں وہ سخت دل مسلم لیڈران وار باب حکومت میں عہدوں پر براجمان مسلم آفیسران و وزرا نے اگر ایمان کی بنیاد پر کچھ نہ کیا تو یقیناً اس ملک میں مسلمانوں کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔

اُردو کو دیس نکالا

مطبوعہ: ۱۴؍اپریل ۱۹۸۹ء

اُردو کے خلاف آج کل پھر ایک منظم مہم چل پڑی ہے اور اس پر نئے سرے سے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ ۱۵؍مارچ کے ہندی روزنامہ "نوبھارت ٹائمز" میں اننت بکھر داس نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ "اُردو صدیوں سے ہندوستان میں رہ کر بھی ہندوستانی پن سے بچتی رہی ہے۔ وہ یہاں کی ہو کر بھی پرائی بنی رہی۔ وہ ہندوستانی تہذیب میں گھل مل نہیں پائی ہے۔ اردو اپنا رشتہ مکہ مدینہ سے توڑ کر کاشی گیا اور

پریاگ سے نہیں جوڑ پائی ہے۔

اتنی بات تو سبھی کو معلوم ہوگی کہ اُردو پر اس قسم کا الزام لگانے والا ہمارے برادران وطن کا وہی مخصوص طبقہ ہے جس کی آنکھ میں ہندوستان کا مسلمان برابر کی طرح کھٹکتا رہتا ہے اور وہ اس کے وجود کو ہندوستان میں کسی بھی حالت میں برداشت نہیں کر سکتا پھر بھلا مسلمانوں سے جان بوجھ کر وابستہ کر دینے والی اُردو زبان کو کیسے بخش سکتا ہے۔ اس مخصوص طبقہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے مسلمانوں اور اُردو کے خلاف وقت بے وقت زہر اگلنے کا سلسلہ جاری رکھے۔

راج شیکھر ویاس کے مضمون کے ساتھ ہی "آرگنائزر" میں ڈاکٹر او پی کپور کا مراسلہ مضمون کی شکل میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے "انکشاف" کیا ہے کہ اُردو کی زبان ہے ہی نہیں۔ اس میں زیادہ تر عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں اور تقسیم سے قبل انگریزوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ یہاں کے لوگوں کو مختلف خانوں میں بانٹ کر اپنی بالادستی قائم رکھ سکیں۔ ڈاکٹر کپور نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ آئین میں اُردو کو شامل کرنے سے اُردو ہندوستانی زبان نہیں بن جاتی کیونکہ آئین میں تو انگریزی کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کپور نے اپنے مضمون میں مزید کہا ہے کہ اُردو محض ایک محدود ادبی حلقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے یہاں تک کہ مشاعرہ تک میں لوگ اس کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ۱۲، ۱۴ مارچ کے آرگنائزر میں دہلی میں ہونے والی عالمی اُردو کانفرنس کے سلسلے میں ایک رپورٹ بھی شائع ہوئی ہے جس میں یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اُردو کے نام پر ایک نئی علیحدگی پسند تحریک شروع کی گئی ہے اور جس طرح اُردو نے ۱۹۴۷ء میں ملک کو تقسیم کیا اور ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے کروائے آج پھر ملک میں تقسیم کے بیج بو رہی ہے۔

اُردو کے خلاف اس قسم کے الزامات کوئی نئی بات نہیں لیکن ادھر اچانک جس منظم طریقے سے یہ تازہ مہم چلائی جا رہی ہے اور اس کو غیر ملکی زبان کا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہے اس کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔ الیکشن کا موسم پھر قریب ہے پھر سیاسی

پارٹیوں کی جانب سے وعدوں کی فصل اگائی جائے گی لیکن اس مرتبہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اُردو کے سلسلے میں محض وعدے سے شاید کام نہ آئیں۔ کیونکہ اُردو کے سلسلے میں صرف وعدوں کے سہارے سیاسی پارٹیوں نے بہت ووٹ بٹور لیے اب ان کیلئے اُردو کے سلسلے میں کوئی عملی اقدام کئے بغیر چارہ نہیں۔ ایک طرف برسر اقتدار پارٹی ہے جس کی گزشتہ کارکردگی سے ہندوستان کے مسلمان بہت خوش نہیں ہیں وہ مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایسی کوششیں کر سکتی ہے جو اُردو کے مفاد میں ہوں دوسری طرف ہندوستان کے سیاسی افق پر اپوزیشن کی ملی جلی پارٹی کی شکل میں متبادل ابھر کر سامنے آیا ہے جس نے اقلیتوں کے سلسلے میں کوئی واضح پالیسی نہیں اپنائی ہے لیکن بی جے پی لابی کو خدشہ ہو سکتا ہے کہ شاید مسلمانوں کو بہلانے کے لیے وہ اُردو کے تعلق سے کچھ الیکشنی وعدے کرتا۔ اسی لیے برادران وطن نے یہ تازہ مہم چھیڑ رکھی ہے۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل پیش کئے جا رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد سے اب تک اُردو کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ یہ ارباب اقتدار کی غفلت کا شکار رہی۔ ووٹ کی سیاست نے نہ صرف اُردو کو اس کا جائز حق دلوایا بلکہ اس کا رشتہ پیٹ سے ختم کر کے اور اس کی مٹی سے اس کی جڑ کاٹ کر اسے سسک سسک کر دم توڑنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دانستہ طور پر ایسی تعلیمی پالیسی تیار کی گئی جس سے اُردو کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے طالب علموں کو اُردو پڑھنا ناممکن ہو جائے دوسری طرف ستم ظریفی یہ رہی کہ برادران وطن کے ایک مخصوص طبقہ نے اس پر طرح طرح کے اوچھے الزامات لگا کر اسے بے آبرو کرنے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ اُردو ہندوستانی تہذیب میں گھل مل نہیں پائی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان خود ہی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی علامت ہے اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اپنی پیدائش ہی سے اُردو نے جہاں ایک طرف حرم کا ذکر کیا تو دوسری طرف دیر کی بات کی ہے ایک طرف جہاں قشقہ کھینچا ہے تو دوسری طرف مصلیٰ بھی بچھایا ہے ایک طرف جہاں عید کی خوشیوں کے نغمے گائے تو دوسری طرف ہولی اور بسنت کے گیت بھی گائے ہیں۔ اُردو ٹوٹے ہوئے دلوں

سلیم گاؤں میں آیا اور دو تین گلیوں کے موڑ مڑتا ہوا ایک پکی حویلی میں داخل ہوا۔ صحن میں بارش کے باعث کیچڑ ہو گیا تھا اور اس میں سے گزرنے کے لیے اینٹیں رکھ دی گئی ہوئی تھیں۔

سامنے برآمدے میں اس کا دادا غفور بیٹھا تھا اور ذرا دائیں طرف اس کی ماں گلشن آٹا چھان رہی تھی۔ صحن کا ایک حصہ اینٹیں لگا کر پکا کر دیا گیا ہوا تھا اور اس پر دو بھینسیں، دو بیل اور ایک گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس کی بھابی کشور نل سے پانی نکال نکال کر انہیں بالٹی میں پلا رہی تھی۔

اینٹوں پر سے ہوتا ہوا جب وہ برآمدے میں آیا تو بوڑھے غفور نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ سلیم نے جھک کر بچوں کی طرح دادا کی چھاتی پر سر رکھ دیا۔

کیسے ہو بابو!

غفور نے اس کا گال تھپتھپایا۔ ٹھیک ہوں بیٹے!

گلشن بھی اٹھی۔ آٹے والے ہاتھ جھاڑتی ہوئی آگے بڑھی اور سلیم کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ کشور بھی وہاں آ کھڑی ہوئی۔ کیچڑ سے بچنے کے لیے اس نے اپنی شلوار کے پائنچے اوپر اٹھا رکھے تھے وہ اٹھارہ برس کے سن کی ایک حسین اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بے پناہ خوبصورتی اور پرکشش جسم کا تناسب ایسے ہی تھا جیسے ——— جیسے

پربت اور دریا کا حسین سنگم۔

ڈوری اور پتنگ کا خوب صورت ملاپ ——— اور

اور ہاتھ اور مہندی کا قابلِ رشک جوڑ۔ وہ ——— وہ سلیم کے

بڑے بھائی نعیر کی بیوی تھی۔

اتنے میں کشور کا چھوٹا بھائی جس کی عمر بمشکل نو برس کے قریب ہو گی بھاگتا ہوا ایک کمرے سے نکلا اور سلیم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

سلیم اسے اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

کیسے ہو سجاد!

وہ سلیم کی گردن سے لپٹ گیا۔

ٹھیک ہوں بھیا!

سکول نہیں گئے۔

آج تو بارش ہے نا بھیا۔ سکول میں چھٹی ہے۔

اتنے میں کشور بھی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سلیم نے سجاد کو اٹھائے ہی اٹھائے پوچھا۔

کیسی ہو بھابی!

کشور پاؤں جھاڑتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔

ٹھیک ہوں ——— نوکری ملی۔

سلیم مایوس ہو گیا۔

اوں ہوں۔

کشور بھی کچھ دلگیر سی ہو گئی۔

غفور نے بول کر اس ماحول کو فوراً ختم کر دیا۔

نہیں ملی تو جہنم میں جائے۔ تمہارے چار بڑے بھائی ہیں کمانے والے

اس ملک کا آئین سیکولر ضرور ہے۔ جمہوری ضرور ہے۔ مگر یہاں نہ سرکار جمہوری اور سیکولر ہے۔ اور نہ سوسائٹی کے بیشتر افراد۔ نہ یہاں کا پریس سیکولر ہے اور نہ ... جماعتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ حکومت پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ ہندو ... ہے۔ وہ الزام بھی سراسر جھوٹا ہے اس لیے کہ اگر یہ حکومت اور یہ پریس واقعی ... ہوتا تو اس ملک کا مسلمان زیادہ امن اور چین سے ہوتا اس لیے کہ ہندو ازم ... سب سے بڑا داعی ہے۔ قتل و غارتگری کا ہرگز نہیں۔

گزشتہ برس سال نو کی مبارکباد دیتے ہوئے ہمیں علم نہ تھا کہ ۱۹۸۷ء اپنے ... میں کیسے کیسے حادثات چھپا کر لا رہا ہے۔ ورنہ شاید ہم نیک خواہشات کا اظہار ... اب پھر ایک نئے سال کی شروعات ہو رہی ہے اور حالات آج بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ ہاشم پورہ کے ان شہیدوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں سچائی اور حق گوئی کے قربان ہونے والے ہر شہید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور حکومت ہند ... کرتے ہیں کہ وہ فرقہ پرستوں اور خاص طور پر سرکاری مشینری کے ذریعے بے گناہ انسانوں کا خون بہانا بند کر دے اور آنے والے سال کو بارہ بنکی۔ احمد آباد۔ میرٹھ اور ملیانہ ... سانحات سے پاک رکھنے کی کوشش کرے۔ ورنہ بڑھتا ہوا یہ ظلم قہر خداوندی کے ... ہونے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

مسلمانوں کو بھی ایک بات سمجھ لینی چاہیئے کہ نئے سال پر اپنی ہزار ہا نیک خواہشات پیش کرنے کے باوجود ہمارے دل میں برے وسوسے ہیں۔ ہاشم پورہ کے شہیدوں کی تعداد یہ ہرگز نہیں ہیں۔ نہ جانے آنے والے وقت میں ایسی کتنی اور تصاویر شائع ہوں ... ہو سکتا ہے کہ ان تصاویر میں ایک تصویر آپ کی یا میری بھی ہو۔ مگر ہمیں اس کے لیے ... رہنا ہے۔ اس لیے کہ اس ملک کی تقسیم کے ناکردہ گناہ کی سزا مختلف شکلوں میں ہمیں بھگتنی ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ اس ملک کی حکومت۔ اس ملک کا کاغذ پر لکھا ہوا آئین اور اس ملک کی اکثریت کے کچھ لوگ صحیح معنوں میں سیکولر اور جمہوریت پسند نہیں ہو ... صحیح معنوں میں ہندو ازم کی اہنسا کے ماننے والے نہیں ہو جاتے۔

مسلمانوں کا وجود خطرے میں ہے

جمعیت علمائے ہند کے جنرل سکریٹری مولانا سید احمد ہاشمی کہتے ہیں

مطبوعہ: ۱۲ / جولائی سنہ ۱۹۹۰ء

سوال... آپ نے ہندوستان کے منبر پہ دستک دینے کے لیے جو مسلم نیشنل کنونشن بلانے کا اعلان کیا ہے اس کا محرک کیا ہے۔

جواب... آج ہندوستان کی آزادی کے ۴۲ سال بعد بھی ہر حساس سیکولر اور جمہوریت پسند ہندوستانی تشویش اور بے چینی میں مبتلا ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس ملک میں سیکولر اور جمہوری طاقتیں پسپا ہوئی ہیں اور پسپا ہوتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں جو طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہو سکتا ہے وہ طبقہ مسلمانوں کا ہے اس لیے آج کی صورتحال میں ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں سخت بھیانک انداز میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں اور ان کے ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ آزادی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی اب تک ان کے حصے میں صرف آئین کی گارنٹیاں آئی ہیں۔ دستور کی ضمانتیں اور تحفظات کی یقین دہانیاں ہی آئی ہیں۔ لیکن ہمیشہ عملی تجربے میں یہ آیا ہے کہ آئین کی خلاف ورزی کی گئی، تحفظات کا استحصال کیا گیا اور ساتھ ہی اتنا نظر انداز کر دیا گیا کہ کاغذی یقین دہانی اور فریب وعدوں کے علاوہ ان کے حصے میں کچھ نہیں آیا بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر انہوں نے اپنے وسائل سے اپنی طاقت اور اس کی بنیاد پر ہندوستانی متحدہ قومیت کے ایک حصے کی حیثیت سے کوئی

'ان بیلوں میں تربوز ہیں' نکال لو بھابی۔

کشور نے تربوز نکال کر ایک طرف رکھ دیئے اور گلشن کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

چارہ کتر کر انہوں نے مویشیوں کے آگے ڈال دیا اور ایک بھینس کے آگے بیلیں پھیلا دیں۔ نصیر نے گھوڑی کھولی اور اسے ذرا گھمانے باہر لے گیا۔ اتنے میں حویلی کے باہر سے سلیم کو کسی نے آواز دی۔

سلیم جب باہر آیا تو باہر اس کا ایک ہم عمر لڑکا ہی کھڑا تھا۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم آئے ہوئے ہو۔ دریا میں کانگ آئی ہوئی ہے اور بہت لکڑی آرہی ہے آؤ پکڑنے چلیں۔ میں اپنا گٹا گاؤں کے باہر کھڑا کر آیا ہوں اور ہمارے سارے ساتھی بھی وہاں انتظار کر رہے ہیں۔"

سلیم نے رازداری سے کہا۔

'تم چلو میں آتا ہوں۔ باپو اور ماں سے چوری آنا پڑے گا۔ میں اپنا کدو اور کاچھا لے لوں۔'

سلیم اندر آیا۔ ایک بڑا سا سوکھا ہوا کدو اور ایک کاچھا نکال کر اشارے سے کشور کو ایک طرف بلاتے ہوئے دونوں چیزیں اسے تھما کر بڑی رازداری سے کہا۔ "بھابی! میں باہر جاتا ہوں تم یہ دونوں چیزیں مجھے دیوار کے اوپر سے

کشور نے ڈانٹ دیا۔

'نہیں تم نہیں جاؤ گے سلیم! دریا آج طوفان بنا ہے۔'

سلیم منت کرنے لگا۔

'اچھی بھابی نہیں۔'

'نہیں۔'

'میں وعدہ کرتا ہوں گہرے پانی میں نہیں جاؤں گا۔'

'اگر تم گئے تو میں باپو اور ماں سے شکایت کر دوں گی۔'

سلیم نے فوراً کشور کے پاؤں پکڑ لیے۔

'لو بھابی تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں۔ باپو اور امی سے نہ کہنا اور یہ دونوں چیزیں مجھے باہر پکڑا دو۔'

کشور خاموش ہو گئی۔ سلیم باہر نکل گیا۔ کشور دونوں چیزیں لے کر باہر آئی اور دیوار کے اوپر سے اسے دیتے ہوئے کہا۔

'دیر نہیں لگاؤ گے ورنہ باپو سے کہہ دوں گی۔'

'ہاں جلدی آؤں گا۔'

'اور گہرے پانی میں بھی نہیں جاؤ گے۔'

'نہیں جاؤں گا۔'

سلیم نے گاچھا اور گڈو لیا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

گڈے میں بیٹھ کر وہ سب دریا پر پہنچے۔ سب نے کپڑے اُتار کر کچھے پہن لیے اور بیٹ کے نیچے کود کر تیرتے ہوئے لکڑیاں پکڑنے لگے۔

شام سے ذرا پہلے تک لکڑیاں پکڑ پکڑ کر انہوں نے ڈھیر لگا دیے تھے پھر وہ کنارے پر آئے اور ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے کھمبیاں توڑنے لگے۔ پھر انہوں نے ساری لکڑی گڈے میں لادی اور گاؤں آکر لکڑی کے ٹھیکیدار کے پاس بیچ دی۔ بارہ بارہ روپے آئے تھے سب کے حصے میں۔

سلیم گھر داخل ہوا۔ نصیر بھینسوں کا دودھ نکال رہا تھا اور کشور نل پر بیٹھی پاؤں دھو رہی تھی۔ گلشن نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا بیٹے! کہاں سے لوٹے ہو اتنی دیر بعد۔"

سلیم جواب دیئے بغیر ہی اندر چلا جانا چاہتا تھا کیونکہ باپو بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا غفور کی بھاری آواز سنائی دی۔

"سلیم!"

وہ جلدی جلدی اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

"جی باپو!"

"کہاں چلے گئے تھے؟"

"کھمبیاں لایا ہوں باپو!"

"کہاں ہیں؟"

سلیم نے اسے دس بارہ کھمبیاں دکھا دیں۔ تم تو انہیں بہت پسند کرتے

ہو باپو! اس لیے لایا ہوں۔"

"دریا کی طرف تو نہیں گئے تھے"۔

سلیم نے بڑے پیارے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"توبہ توبہ باپو! دریا میں تو ناگ آئی ہوئی ہے میں نے اُدھر کیا کرنے جانا ہے"۔

کشور اس کا جواب سن کر اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ اسے دوسروں سے اپنی ہنسی چھپانے کی خاطر منہ میں دوپٹے کا پلو لینا پڑا۔

غفور خوش ہو گیا۔

"بہت اچھا بیٹا ہے۔ اس موسم میں دریا پر نہیں جانا چاہیے"۔

سلیم نے گلشن سے کہا۔

"بہت بھوک لگی ہے ماں!"

گلشن نے کشور کو آواز دی۔

"کشور! کھانا دو سلیم کو جلدی کر"۔

کشور نے پاؤں دھو کر جلدی جلدی جوتے پہنے اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سلیم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا اور میز کے سامنے کرسی لگا کر بیٹھ گیا۔

کشور نے اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو کہتے تھے جلدی آجاؤں گا۔ باپو اور ماں نے کئی بار مجھ سے تمہارے متعلق پوچھا مگر میں نے کہا مجھے بتا کر نہیں گیا۔

'چودھری تمہیں بلاتے ہیں۔'

نصیر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

'کیوں؟'

'یہ تو پتہ نہیں۔'

نصیر اس کے ساتھ ہو لیا۔ 'چلو۔'

'میں بھی آؤں بھیا!' سلیم نے پوچھا۔

'نہیں کوئی ضرورت نہیں۔' نصیر اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کشو آگے مشین میں باجرہ دینے لگی اور سلیم پھر اسی طرح مشین چلانے لگا۔

نصیر چودھری حاکم کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں اختر اور اشرف کے ساتھ صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ نصیر کو دیکھتے ہی چودھری اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔

'تم نے میرے گھوڑے کو کانجی ہاؤس دینے کی جرأت کیسے کی۔' چودھری کی لمبی لمبی مونچھیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔

نصیر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

'باندھ کر رکھا کریں نا۔ کیوں کھلے چھوڑتے ہیں۔ ہماری سال بھر کی محنت کو خراب کرنے پھرتے ہیں۔'

'تمہیں پتہ ہے میرے گھوڑے کبھی نہیں بندھے۔'

'کھلے بھی نہیں پھریں گے۔'

'کون روکے گا؟'

نصیر نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا۔

'میں روکوں گا۔'

چودھری کا منہ جھاگ چھوڑنے لگا۔

'میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔'

'ہوش میں رہو چودھری! تم جاگیردار ہو تو اپنے گھر میں ہو۔ ہم دن رات محنت کر فصلوں کو جوان کرتے ہیں اور تمہارے گھوڑے انہیں روندتے پھرتے ہیں۔'

چودھری چلایا۔

'روندیں گے۔ روندیں گے۔'

'پھر خون بھی بہے گا۔'

'خون بہائے گا کون۔ تم صرف پانچ بھائی ہو اور میرے ایک اشارے پر سینکڑوں جوان اٹھ کھڑے ہوں گے۔'

'ہم پانچ بھائی پنجاب کے پانچ دریا ہیں جو اگر طوفان پر آئے تو تمہاری بستی تک کو بہا کر لے جائے گا۔'

'ہوں! ایسے خشک دریا پنجاب میں میں نے بہت دیکھے ہیں۔ جنہیں لوگ اپنے پاؤں سے روندھ کر ان میں سے گزرتے ہیں۔'

'تو پھر اب اپنے مویشی اور گھوڑے کھلے چھوڑ کر دیکھنا۔'

'چھوڑوں گا۔ دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔'

'میں روکوں گا اور جو سامنے آئے گا وہ زندہ نہیں بچے گا۔' نصیر غصے میں باہر نکل گیا۔

پچھلے کچھ دنوں میں حکومت اور سرکاری ذرائع ابلاغ نے یہ واضح اشارہ دیا کہ کشمیر اور پنجاب کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں میں جو تشدد پسندانہ سرگرمیاں اور فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری ہے اس میں پاکستان بالواسطہ یا بلاواسطہ پر شریک ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ پاکستان ان معاملات میں کہاں تک ملوث ہے یہ بات اہم ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو ملک میں انارکی اور افراتفری پھیلانے کے لیے پاکستانی ایجنٹوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم اگر ان عناصر کی نشاندہی کر دیتے تو خیال آرائیاں کرنے اور اندازوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ویسے فرقہ وارانہ فسادات برپا کرنے کے سلسلے میں پاکستان کا نام پہلی بار زیر بحث نہیں آیا ہے بلکہ یہ کہانی سب سے پہلے ۱۹۸۰ء میں مراد آباد سے شروع ہوئی تھی۔ اب اتفاق یہ ہے کہ اس وقت وی پی سنگھ یو پی کے وزیر اعلیٰ تھے اور انہوں نے صاف طور پر مراد آباد کے سلسلے میں اسمبلی میں خود کو مجرم تسلیم کیا تھا۔

اخباری اطلاعات کے مطابق گذشتہ دنوں مرکزی وزارتِ داخلہ نے سبھی ریاستوں کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ پاکستان سے عام ویزا پر آنے والے لوگوں کی حرکات و سکنات پر گہری نگرانی رکھیں تاکہ انہیں ریاستوں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تباہ کرنے اور توڑ پھوڑ کرنے کی کارروائی کرنے کا موقع نہ ملے۔ وزارت داخلہ نے یہ حکم جے پور میں برآمد ٹائم بم، بمبئی میں برآمد کیمیکل بموں اور دہلی میں پولیس تھانوں کے پاس ہوئے طاقتور بم دھماکوں کے بعد دیئے ہیں۔

واضح رہے کہ گزشتہ دنوں دوردرشن نے شام کی خبروں میں جے پور کے دو مسلم نوجوانوں کو دکھایا تھا جنہوں نے یہ اقبال جرم کیا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ نے چوری چھپے شہر میں داخل ہوا تھا ان کو بم بنانے کی تربیت دی۔ اس سے قبل اس سلسلہ میں ہندی اور انگریزی کے اخبارات نے پولیس ذرائع سے فراہم کی گئی اس خبر کو اچھالا تھا۔ ہندی روزنامہ "نو بھارت ٹائمز" نے اپنی ۲۷ اپریل کی اشاعت میں اس خبر کی تفصیلات شائع کیں۔ خبر کے مطابق جے پور میں ٹائم بم بنانے والے گروہ کے تقریباً

ون کو گرفتار کیا گیا۔ ان سے پوچھ تاچھ کے دوران علم ہوا کہ انہیں ٹائم بم بنانے کی تکنیک نے کے لیے پاکستان کی خفیہ ایجنسی سے وابستہ شجاع الدین نومبر ۱۹۸۹ء میں جے پور آیا تھا۔ اس نے ٹائم بم بنانے کی تکنیک جے پور کے ۲۵ سالہ نوجوان محمد افضل کو دی۔ شجاع الدین نے افضل کو بم بنانا بھی سکھایا۔ یہیں سے اس سازش کا سراغ ملا...... اور پولیس نے جاع الدین اور اس کے ایک بھائی ممتاز الدین کے بھارت آنے کا پورا پتہ لگایا۔ "دنمان ہر" کے مطابق یہ پاکستانی باشندے جے پور میں چاند دروازے پر واقع اپنے رشتہ دار سے ملنے آئے تھے اور چاند پول بازار کے باہر ایک کثیر منزلہ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان ہوں نے پہلے ایک ریڈیو میکینک کو بم بنانے کی تربیت دی۔ تربیت دینے والے پاکستانی براں نے جے پور میں ۵-۶ دن گذارے انہوں نے آلات اور استعمال کی تکنیک جے پور اپنے ساتھیوں کو اپنے سامنے سکھائی۔ اخبار کے مطابق راجستھان پولیس نے اب تک تحقیقات کی تفصیلات سے مرکزی حکومت کو مطلع کر دیا ہے معلوم ہوا ہے کہ ریاستی ر تحقیقاتی ٹیم کو انعام و اکرام دینے پر غور کر رہی ہے۔

غالباً انہی اطلاعات کی بنیاد پر وزیر اعظم وی پی سنگھ نے ریاستوں کو صورت حال نگاہ رکھنے کے لیے کہا ہے۔ اور یہ بہر صورت ایک خوش آئند بات ہے کہ ریاستی ں فرقہ وارانہ صورت حال پر نظر رکھیں تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہو۔ "جے پور میں برآمد کیا گیا ٹائم بم اور سامان۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت کا درجہ ہے کہ گڑبڑ پیدا کرنے والی غیر ملکی ایجنسیوں سے زیادہ فرقہ وارانہ اشتعال وہ ملکی ایجنسیاں کرتی ہیں جنہیں خود کو محب وطن ہونے پر ناز ہے۔ کانپور کا حالیہ فساد اس کی ایک مثال ہے۔

جہاں فساد کے افسانے اس ایک خبر سے بُنے گئے تھے جو ایک مقامی ہندی ر نے شائع کی تھی خبر میں بتایا گیا تھا کہ کانپور میں بڑی تعداد میں پاکستانی ہتھیار پاکستانی ایجنٹ اس میں ملوث ہیں۔ جن علاقوں میں ان ہتھیاروں کی موجودگی ی تھی وہ سارے کے سارے مسلم علاقے تھے۔ اس خبر کا واحد مقصد مسلمانوں کو تعلق

سے ہندوؤں کے ذہن میں خوف وہراس پیدا کرنا تھا اور سا نہیں اکسانا
وہی ہوا خبر کی اشاعت کے چند دن بعد ایک معمولی واقعہ نے فساد کی شکل اختیار کرلی اور ساس میں ، ربگنا ہوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستانی ہاتھ کے معاملہ کو اس کے اصل پس منظر میں دیکھنے کے بجائے اسے یہاں کے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اکثر وبیشتر افواہوں کو بنیاد بنا کر اسی طرح پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ عام طور پر حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ کانپور کے اخبار میں چھپی خبر بالکل بے بنیاد تھی یہی وجہ ہے کہ کانپور کے علاقوں میں تلاشی کے دوران پولیس اس قسم کا ایک بھی ہتھیار برآمد نہیں کرسکی۔ اس کا اندازہ وزیر اعظم کو بھی بخوبی ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود حالات کے دباؤ میں سرکاری ذرائع ابلاغ اور بی بی سی جیسا موثر میڈیا اس قسم کے پروپیگنڈہ میں پیش پیش ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ فرقہ وارانہ فساد میں پاکستانی ہاتھ کی سب سے پہلی کہانی مراد آباد میں ۱۹۸۰ء میں ہوئے پولیس فائرنگ کے بعد سامنے آئی تھی جہاں پی اے سی کے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے یہ کہانی گھڑی گئی تھی کہ مسلمان عیدگاہ میں ہتھیار لے کر آئے تھے اور اس میں پاکستان ملوث تھا۔ گویا عیدگاہ نہ ہوئی میدان جنگ ہوگیا یہی نہیں فرقہ پرستوں نے تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا تھا کہ پاکستان ہندوستان میں ایک اور پاکستان بنانا چاہتا تھا جس کی راجدھانی مراد آباد بننا طے تھا۔ لیکن عین وقت پر پی اے سی نے سازش ناکام بنادی۔ اس کے بعد پاکستانی ہاتھ کی کہانی علی گڑھ میں دہرائی گئی جہاں میں ایک "پاکستانی توپ" برآمد کرائی گئی اور لکھنؤ کی ایک مسجد سے ....۵۲ بم بھی برآمد کرا دیئے گئے۔ جبکہ حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ ان تمام تر افواہوں کو محض ہندوؤں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت اور غصہ پیدا کرنے کے لیے پھیلایا گیا۔ اور یہی کام آج ایک بار پھر ہو رہا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت اس پروپیگنڈہ میں فرقہ پرست تنظیمیں اور متعصب اخبارات شامل تھے اب اس میں ٹی وی جیسے

سرکاری ذرائع شامل ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس بات سے کون حقیقت پسند ناواقف ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں کونسی تنظیمیں بیرونی ایجنسیوں سے زیادہ سرگرم حصہ لیتی رہی ہیں اور کن تنظیموں نے اجودھیا کے مسئلہ کو کے پورے ملک کی فضاؤں میں نفرت کا زہر گھولا ہے لیکن اس کے باوجود ان سے یہ تک نہیں پوچھا جارہا ہے کہ ان کے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہے کہ غیر ملکی ایجنسیاں بھی کسی ملک میں تخریبی کارروائیاں کرتی ہیں جب اس ملک میں ان کے لیے زمین ہموار ہو اور یہ ساری زمین وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، آر ایس ایس اور شیو سینا جیسی تنظیموں نے پوری طاقت سے ہموار کی ہے لہٰذا وزیر اعظم اور ریاستی حکومتوں کو یہ بھی چاہیے کہ وہ عوام کے سامنے ان کالی بھیڑوں کو بے نقاب کریں۔ تاکہ دودھ اور پانی کا فرق سامنے آئے۔

فرقہ پرستی کی آگ

کانگریس نے لگائی ہے

مطبوعہ: ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ء

سنجے گاندھی کی بیوی مینکا گاندھی کہتی ہیں!

مانیکا گاندھی کے سیکولر ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ساتھ ہی مانیکا گاندھی بہت بہادر اور باہمت خاتون ہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ جب بھی ظلم ہوا ہے مانیکا گاندھی نے ان کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی ہے۔ آج بھی جنتا دل کے اندر بیٹھے ہوئے فرقہ پرست عناصر سے مانیکا کھل کر لڑ رہی ہیں انہیں نہ اس کی پرواہ ہے کہ انہیں کتنے ٹکٹ ملے اور کہاں سے ٹکٹ ملے اور نہ وہ اقلیت دشمن طاقتوں سے سودے بازی کر رہی ہیں۔ الیکشن کے وقت تو کٹر سے کٹر فرقہ پرست بھی اقلیتوں کی ہمدردی میں مگرمچھی آنسو بہاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مانیکا نے مسلسل فرقہ پرستی اور ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ ماضی میں مانیکا نے امیٹھی میں راجیو گاندھی سے مقابلہ کیا مگر وہ اب پیلی بھیت سے الیکشن لڑ رہی ہیں۔ ان کے مقابلے پر کانگریس

کے بھانو پرتاپ سنگھ ہیں۔ تمام سیکولر اور صاف ذہن لوگ مانیکا کے ساتھ ہیں۔ مانی نگر بھی پیلی بھیت کے عوام نے مانیکا کا ساتھ دیا۔ آج ان کے ساتھی اکبر احمد ڈمپی کانگریس میں ہیں مگر دل سے وہ بھی مانیکا گاندھی کے ساتھ ہیں بلکہ کہا جاتا ہے فرقہ پرستی کو شکست دینے کے لیے مانیکا جیسے بہادر سیکولر عناصر کو لوک سبھا میں لانا ازحد کی سخت ضرورت بن گیا ہے۔

سوال: مانیکا جی حالیہ الیکشن میں آپ کے نزدیک سب سے اہم موضوع کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک سب سے اہم موضوع ملک کا تحفظ ہے۔ لیڈروں کے لیے ملک کے تئیں سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اس کی حفاظت کریں۔ ملک کی حفاظت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ہم کرپشن اور فرقہ پرستی جیسی برائیوں پر قابو پائیں۔

سوال۔ اس وقت ملک کے سامنے سب سے اہم سوال فرقہ پرستی کا ہے اور ملک کا مستقبل داؤ پر لگ گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گی۔

جواب: فرقہ پرستی کی آگ کانگریس والوں نے لگائی ہے ایسا کر کے وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ووٹ حاصل کر لیں گے۔ اب جگہ جگہ فسادات کرا کر الیکشن کو ملتوی بھی کر سکتے ہیں۔ کانگریس اگر ہار رہی ہوتی ہے تو کچھ بھی کر سکتی ہے کانگریس کے لیے انسانی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کو ہر قیمت پر ووٹ چاہیے وہ انسانوں کو انسان کی نظر سے نہیں دیکھتے۔

سوال۔ تو کیا اپوزیشن والے انسان کو انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

جواب۔ سب سارے اپوزیشن والوں کے لیے یہ بات نہیں کہہ سکتی لیکن سارے کانگریس والوں کے لیے اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ سارے کانگریس والے ایک بندھوا مزدور کی طرح ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس صرف ایک ہی نیتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے سب ہی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں کسی ایک میں اتنی ہمت نہیں ہے جو کہ غلط کو غلط کہہ سکے۔ اپوزیشن میں بہت ساری آوازیں ہیں، بہت سے لیڈر ہیں جن کی اپنی الگ الگ رائے ہے

سوال۔ کیا ایسا نہیں کہ اپوزیشن میں ضرورت سے زیادہ لیڈر ہیں۔

جواب۔ اگر ملک کو اتنے لیڈروں کی ضرورت نہ ہوتی تو اتنے لیڈر نہیں ہوتے عوام نے ہی انہیں لیڈر بنایا ہے۔

سوال۔ آپ لوگ کانگریس پر فساد کرانے کا الزام لگاتے ہیں اور رہا تھا آپ بی جے پی سے مل رہے ہیں جس میں بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بندو پوا ہیں آگے آگے ہیں۔

جواب: یہ الزام بے بنیاد ہے اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس مرتبہ کانگریس بکل باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر وہ دوبارہ جیت کر آ گئی تو وہ لوٹ مار لوٹ کھسوٹ گئے پیمانے پر کر دے گی۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جن سیٹوں پر ہم مضبوط ہیں وہاں ہم الیکشن رہے ہیں تاکہ وہاں بی جے پی لڑے یا کوئی دوسری پارٹی لڑے لیکن جہاں اپوزیشن بہت ور ہے وہ ہم چھوڑ دیں گے چاہے وہاں سے بی جے پی آئے یا سی پی آئی، سی پی ایم، ارکھنڈ مکتی مورچہ، اینیقر پارٹی کوئی بھی آئے۔ جہاں تک انصاف پارٹی کی بات ہے کی بات الگ ہے میں اس بات کو شدت سے محسوس کرتی ہوں کہ بیشتر مسلمان لیڈر بیت کر پارلیمنٹ میں آتے ہیں انہوں نے ایک دھندہ بنا لیا ہے۔ یہ نمائندوں کی پارلیمنٹ میں نہیں آتے بلکہ یہ اپنی ذات کا استعمال کرتے ہیں اور نہ اپنے مکے لیے کچھ کرتے ہیں اس لیے میں یہ چاہتی تھی کہ شہاب الدین صاحب کے لیے با چھوڑ دی جائیں کیونکہ وہ اپنے فرقے کے لیے لڑتے ہیں۔

میں ان کو زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن بدایوں فساد کے بعد میں ان سے بیت کرنے ان کے گھر گئی اور ان سے وہاں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے ہا فساد کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا اور بتایا کہ اس میں مسلمان لڑکوں کی غلطی تھی پہلے لڑکوں نے جلوس نکالا اور نعرے وغیرہ لگائے اس کے بعد مسلم لڑکوں کو کلکٹریٹ نو جی میمورنڈم دینا تھا لیکن انہوں نے ہندو کالج کے باہر کھڑے ہو کر چلانا کر دیا۔ اور کانگریس آئی زندہ باد کا نعرہ لگانے لگے پھر ہندو لڑکوں سے

(۵)

ربیع کی بوائی شروع ہو گئی تھی۔ کسان دن رات کام میں مصروف تھے۔ سلیم بھی رات دن ایک کیے ہوئے تھا۔ غفور، گلشن اور کشور بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ایک روز دوپہر سے ذرا پہلے کشور سلیم کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی کہ اس کی ماں آ گئی۔ غفور اور گلشن سے ملنے کے بعد اس نے سجاد کو پیار کیا اور پھر آ کر کشور کے پاس بیٹھ گئی۔

کشور نے پراٹھے پر گھی لگاتے ہوئے پوچھا۔

"گھر میں خیریت ہے نا امی!"

"سب خیریت ہے، میں تو تمہیں لینے آئی ہوں۔"

"کیوں؟"

"لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تمہاری لڑکی عدت کے دن بھی پورے کر چکی پھر وہاں کیوں بٹھا رکھی ہے۔ کہیں اور شادی کر دو اسکی۔"

کشور غمزدہ اور پیلی ہو گئی۔

"کون کہتا ہے؟"

"سب ہی کہتے ہیں بیٹی! کسی کے منہ پر ہاتھ تھوڑا ہی رکھا جا سکتا ہے تم کام سے فارغ ہو اور آج ہی چلو میرے ساتھ۔"

کشور رو پڑی۔

"میں نہیں جاؤں گی امی!"

"کیوں نہیں جاؤ گی؟"

"تم نے بیاہ کر مجھے اس گھر میں بھیج دیا تھا۔ اب اس گھر سے میرا جنازہ ہی اٹھے گا۔ میں اس وقت تک اس گھر سے نہیں جاؤں گی جب تک باپو اور ماں اپنی زبان سے نہیں کہتے کہ چلی جاؤ۔"

"کس آس پہ یہاں بیٹھی رہو گی۔"

"بس یہ میرا گھر ہے مجھے اس کی ہر چیز سے پیار ہے۔"

"تو میں گلشن سے اس سلسلہ میں بات کر دوں۔"

کشور نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کر لو۔"

وہ اٹھ کر گلشن کے پاس آئی اور اس کے سامنے بیٹھتے [illegible] کہا۔

"میں کشور کو لینے آئی ہوں بہن! تمہارا کیا خیال ہے؟"

لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ سے آزاد ہو جائے تو وہ ہم کو ووٹ نہیں دیں گے۔ ہر وقت ووٹر کو دیکھنا ہے کہ وہ کس امیدوار کو ووٹ دے جو ان کے حقوق کے لیے لڑائی لڑ سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر پارٹی پر لگام لگانا ضروری ہے تاکہ وہ عوام کے لیے کام کریں۔

سوال: اگر کانگریس آئی ہارتی ہے تو کیا راجیو گاندھی اپوزیشن میں رہ کر لڑ سکیں گے؟

جواب - انہوں نے زندگی میں کبھی لڑائی لڑی نہیں۔ اگر وہ اپوزیشن میں رہ کر عوام کے لیے لڑائی لڑیں تو انہیں اس بات کا احساس ہوگا من کو کتنی طاقت ملتی ہے کتنا فخر حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بہر حال مجھے خوشی ہوگی کیونکہ راجیو گاندھی میرے خاندان کے سب سے بڑے رکن ہیں۔ سوچیے اگر میں سنجے کی بیوی نہ ہوتی تو مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ یہ دنیا ہے کیا۔ محلوں میں رہ کر ہمیشہ ان سے بندھی رہتی اور اس عمر تک میں پڑی ہی رہتی۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر وہ ہار جاتے ہیں تو انہیں تمام حقائق کا احساس ہوگا اور ہندوستان کی خدمت کرنے کا صحیح جذبہ پیدا ہوگا۔

سوال: اس ملک میں پسماندہ طبقوں شیڈولڈ کاسٹ اور قبائلیوں کے لیے ریزرویشن میں مسلمان نہیں آتا۔ مسلمان غریب ہیں، پسماندہ ہیں وہ نہ کمیشن میں آپاتا ہے اور نہ ریزرویشن میں تو اس صورت حال کو بدلنے کے لیے آپ کیا سوچتی ہیں۔

جواب: ریزرویشن ذات پات کے حساب سے نہیں اقتصادی حالت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اگر ریزرویشن کا وہی لوگ فائدہ اٹھا کر اوپر اٹھتے ہیں جو پچھڑے ہوئے ہوتے بھی نہیں۔ مثال کے طور پر جگجیون رام کے بچوں کو دیکھ لیجیے۔ ریزرویشن کے لیے مخصوص ذات کا ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ ان کی مالی حالت کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ان میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی لوگ ہو سکتے ہیں۔

سرکاری فرقہ پرستی

مطبوعہ: ۱۶ر جون ۱۹۸۸ء

قیام پاکستان کے ۴۰ سال بعد بھی ہندو ذہنیت کی حامل بزعم خویش بھارتی حکومت بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو بھارتی شہری تو کیا انسان کا درجہ دینے پر بھی یار نہیں ہے۔ مسلمانوں کو مختلف ہتھکنڈوں سے پریشان رکھنا اس حکومت کی فطرت ن چکی ہے جہاں ایک طرف پاکستان کے خلاف مسٹر راجیو گاندھی کوئی بھی بے بنیاد اور جھوٹا یام لگانے سے نہیں چوکتے وہاں ان کی حکومت کی یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ بھارت بسنے والے مسلمانوں کو بھی ہر حربے سے پریشان کیا جائے۔

بابری مسجد کی تاریخی اور اسلامی حیثیت کو یکسر نظر انداز کر کے اس پر غاصبانہ نے کے بعد بھارت میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کی لہر ابھی تک جاری ہے اور کی شدت میں جب کوئی کمی آنے لگتی ہے۔ ہندو ذہنیت کی حامل سیکولر حکومت لڑائی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر کے میدان کو گرم کر دیتی ہے حال ہی میں بھارتی وزارت نے ایک سرکلر جاری کیا ہے جس کی رو سے "سی آر الیف" کے مسلمان ملازمین کو داڑھی کی ممانعت کر دی گئی ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی پر انہیں ملازمت سے است کرنے کے علاوہ سزا دینے کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ میں اس سلسلے میں مسلمان ممبر پارلیمنٹ جی ایم بنات والا نے لی وزیر داخلہ مسٹر بوٹا سنگھ سے پارلیمنٹ میں سوال کیا تو انہوں نے اس بات کو کیا کہ سی آر پی الیف نے ۲۷ر جولائی ۸۷ء اور ۹ دسمبر ۸۸ء کو اسی نوعیت کے دو ات جاری کیے تھے جن کے تحت سکھوں کے علاوہ تمام پولیس ملازمین کو لمبے بال اڑھی رکھنے سے روک دیا گیا ہے۔

اس صورت حال کا مسلمان ممبران پارلیمنٹ نے بڑی سختی سے نوٹس لیا اور

آخر اُسے ایک ترکیب سُوجھی، اندر جاکر کشور سے لنگوٹا لیا اور پھر گھوڑی کھول کر باہر جانے لگا۔

غفور نے فوراً پوچھ لیا۔

"کدھر چلے ہو سلیم!"

"ذرا گھوڑی کو دوڑا لاؤں اور نہا بھی آؤں گا باپو!"

غفور مطمئن ہو گیا۔

"جلدی آنا بیٹے! مجھے تم سے ایک ضروری کام بھی ہے۔"

سلیم مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

کبڈی کھیل کر وہ واپس آیا اور گھوڑی باندھ کر وہ باپو کی نظر بچا کر لنگوٹا کشور کو دینا چاہتا تھا کہ غفور نے اسی وقت بلایا۔

"اِدھر آؤ سلیم!"

ایک ہاتھ میں لنگوٹا لے کر اسے پُشت میں چھپاتے ہوئے وہ غفور کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"جی باپو!"

کشور بھی اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ شاید وہ کچھ سوچ کر ہی آئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوئیں اور پھر باپو کی نظر بچا کر سلیم نے لنگوٹا کشور کو تھما دیا جسے وہ غفور کی نظر سے بچاتی ہوئی اندر لے گئی۔

غفور نے بیٹھنے کو کہا اور وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے سلیم!"

اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا باپو!"

"تمہاری اور کشور کی شادی کا۔"

کشور بھی ساتھ والے کمرے میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی امی اور گلشن باورچی خانے میں ہانڈی پکا رہی تھیں۔

سلیم فوراً کھڑا ہو گیا۔

"میں شادی نہیں کروں گا باپو!"

ساتھ والے کمرے میں کھڑی کشور اُداس ہو کر رہ گئی۔

"کیوں بیٹے!" غفور نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"میرے تین بڑے بھائی ہیں باپو! پہلے ان کی شادی ہو گی پھر میں شادی کروں گا۔"

"تمہیں کشور سے شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں۔"

سلیم کا سر جھک گیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر تم دونوں کا آج ہی نکاح ہو گا۔"

"بھائی کیا سوچیں گے باپو!"

"وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میں اُن کی شادی کا بھی بندوبست کر رہا ہوں یہ میرا فیصلہ ہے۔ تم جانتے ہو کشور کی امی اُسے لینے آئی ہے لوگ باتیں کرتے

• مُنّو میری ماں ۔ ہ ——— خدا پرانی عادت ہے نا۔"
گلشن بھی ہنس دی ۔

• کبڈی کھیلنے جانا ہوگا ؟"
• ہاں ؟"

ایسی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں تو لگتا کہ بد روحیں اور چڑیلیں آپس میں کوئی سازش کر رہی ہوں اور ایسے میں ماحول کی خوفناک خاموشی کو درہم برہم کرتا بم کا لرزہ خیز دھماکہ، پیڑوں سے اڑتے کوؤں کی کائیں کائیں، لوگوں کی سرگوشیاں اور پھر وہی ماحول کی خوفناک اور بے چین خاموشی۔

ویسے تو شہر میں بی ایس ایف کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں لیکن وہ سب بھی بہار پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ اقلیتی آبادی میں ایک طرف فسادیوں کے حملے کا خوف تھا تو دوسری طرف پولیس کی زیادتیوں کا ڈر۔ دیوالی کب کی ہو چکی لیکن کالی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ میں جب رکشے سے بستی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو باتونی رکشہ والا مجھے اپنی برادری کا سمجھ کر بتانے لگا "کالی ماں نے سپنا دکھایا ہے کہ میری پیاس ابھی بجھی نہیں ہے۔ مجھے ابھی مت بھسان (وسرجن) کرو، پہلے ان لوگوں کو جیسے گرم ریت والی برتن میں اناج بھونا جاتا ہے ویسے ہی بھونو تب مجھے بھسان کرنا۔ گھبرانا مت آگے آگے میں رہوں گی پیچھے پیچھے تم سب رہنا۔" میں نے پوچھا کہ کالی ماں اور بلیدان نا؟ ہے؟ اس پر اس نے زور زور سے ہامی بھرتی۔

اکا دکا راہ چلتے لوگ چاقو زنی کے شکار ہوتے رہے۔ ٹرین سے کھینچ کھینچ کر بے گناہوں کو مارنے جلانے کے واقعات بھی ہوتے رہے لیکن انتظامیہ کی طرف سے کوئی حفاظتی قدم نہ کیا گیا۔ تاتارپور چوک مسجد کے موذن نضیلت حسین کو سر راہ گولی مار دی گئی۔ انہیں محلے میں لایا گیا جہاں انہوں نے کچھ ہی دیر میں دم توڑ دیا۔ اس حادثے سے محلے میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ نوجوان انتقامی جذبے سے بے قابو ہو گئے لیکن محلے کے سربراہان شمس عابد، ناوغیرہ نے حالات کو مزید بگڑنے نہیں دیا۔ ایسے میں پتہ چلا کہ محلے کے آخری سرے پر پولیس پاسنا کھڑی ہے جو ہنگامے کی وجہ جاننا چاہتی ہے۔ ایک نوجوان کے ساتھ ان سے بات کرنے گیا۔ پولیس انسپکٹر اچھیتا پرشاد کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ سامنے ہمگت پٹی میں موذن صاحب کو گولی مار دی گئی ہے۔ اس وجہ سے لوگ جذباتی ہو رہے ہیں۔ اس پر اس انسپکٹر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ

ان سب سے کہنے کہ خاموش رہیں۔ ابھی تک ایک ہی جان گئی ہے۔ آدمی گھسا دوں تو سینکڑوں کی جان جائے گی۔ اتنے میں خون میں لت پت ایک نوجوان بھاگتا ہوا محلے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آٹو رکشہ پر اپنے محلے جا رہا تھا کہ کچھ فسادیوں نے ان سب پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران میں تاتارپور سیاولیہ مچھ اپنی کار میں بند دو ملاقاتوں کا دور دور تک نشان رہا۔

اسی شام جب زیادہ تر لوگ عشاء کی نماز میں تھے یک بیک ناتھ نگر محلے کے پچھلے حصے کی طرف سے بموں کے دھماکے اور جے شری رام کے نعرے گونجنے لگے۔ فسادی ہزاروں کی تعداد میں بم برساتے محلے کے آخری سرے پر واقع ایک سکول کی دیوار تک آ گئے۔ لوگ اپنا دفاع اینٹ پتھر سے کرتے رہے۔ بی ایس ایف کو اطلاع دی گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد فورس کے آنے کا ہنگامہ ہوا اور دنگائی پیچھے ہٹے۔ اسی دوران محلہ نرغہ پر بھی فسادیوں کا حملہ ہوا۔ پولیس آئی تو بے گناہوں کو بے تحاشہ زدوکوب کر کے ۵۷ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ محلہ ناتھ نگر پر تو شام میں دنگائیوں نے حملہ کیا تھا اور صبح پولیس نے چھاپہ مارا۔ گھر کا دروازہ توڑ کر پولیس گھسی اور سوئے ہوئے لوگوں کو بندوق کے کندوں سے مارتی گھسیٹتے لے گئی۔ ان میں بارہ برس کے مدرسہ میں پڑھتے ہوئے دو بچے بھی شامل تھے۔

بھاگلپور میں دوبارہ فساد کا ماحول بن گیا۔ شہر میں غیر اعلان شدہ کرفیو کی حالت تھی۔ شام ہوتے ہی فضا میں خوفناک سناٹا اور لوگوں کے دلوں میں عجیب سا خوف طاری ہو جاتا تھا۔ ایک رات محلہ ہزاری پر ہجوم نے بموں اور رائفلوں سے حملہ کر دیا۔ گنگا پار ہو شہر کے گولہ گھاٹ سے آئے فسادیوں نے محلے کے معزز حضرات وحید اور نذیر صاحب کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور بموں کی بارش سی کر دی گئی۔ عبدالبشیر صاحب کی گھڑی کی دکان ۲۴ تاریخ کے فساد میں پہلے ہی لوٹی جلائی جا چکی تھی۔ آدھے گھنٹے تک یہ اپنی چھت سے بموں کا جواب اپنی بندوق سے دیتے رہے۔ بی ایس ایف کے آنے سے فسادی بھاگے۔ محلے کے لوگوں کو اپنے دفاع کرنے کے جرم

(۷)

میدان میں تین ڈھول زور زور سے بج رہے تھے۔ ارد گرد کے اٹھارہ بیس گاؤں کے ان گنت لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ میدان کے وسط میں مٹی کے دو بڑے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ کبڈی کھیلنے والے لڑکے خوب تیل مل رہے تھے۔ غفور بھی مٹی کے ڈھیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا اور سلیم تیل مل رہا تھا۔

دونوں ٹیمیں میدان میں اتریں۔ آدم پور اور خود لتھی کے دو چودھری جج مقرر کر دیئے گئے تھے۔ سب سے پہلے جون پور کا رحمت موٹا کبڈی آیا۔ سگر کا ایک جوان اس کے سامنے آیا۔ دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو خوب طمانچے برساتے رہے۔ سگر والے نے اسے پکڑنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور رحمت موٹا جیت کر نکل گیا۔ ڈھول پہلے کی نسبت زور سے بجنے لگے تھے۔ سگر کا وہی لڑکا جو رحمت کو پکڑ

نہ سکا تھا مٹی کے ڈھیر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

اب سلیم کبڈی گیا۔ اس کے سامنے جون پور کا رحمٰن جندرہ آ کھڑا ہوا تھا۔ غفور نے اپنے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

"یہ کون سامنے آیا ہے سلیم کے؟"

"یہ رحمٰن جندرہ ہے" اس نے جواب دیا۔ "قینچی ایسی مارتا ہے کہ بالکل بے بس کر کے رکھ دیتا ہے۔ بڑی ستھری کبڈی کھیلتا ہے۔ پر تیرا پوتا تیز ہے اس سے بڑی پیاری کبڈی کھیلتا ہے۔"

غفور نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا، میں نے تو اسے کبھی کھیلتے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیسی کھیلتا ہے۔"

"بہت اچھی کھیلتا ہے۔ تجربہ ہے مجھے"

غفور خاموش ہو گیا۔ کیونکہ سلیم اور رحمٰن جندرہ ایک دوسرے پر تڑ تڑ طمانچے برسا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک جم کر وہ ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ پھر رحمٰن اسے قینچی مارنے کی کوشش کرنے لگا اور سلیم اس سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار سلیم نے الٹے پاؤں بھاگتے ہوئے بھاگنا چاہا مگر رحمٰن چھاتی تان کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ سلیم پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اسے چکمہ دے کر بائیں طرف سے بھاگ نکلا مگر رحمٰن بھی اس کے پیچھے بھاگا اور اسے جا لیا۔

عین اس وقت جب کہ رحمٰن بھاگتے ہوئے سلیم کو قینچی مارنا چاہتا تھا سلیم نے اپنے دائیں پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ساتھ ہی اپنا دایاں بازو

کیونکہ ہم ہندوستانی ہیں۔ یہ جلوس دلتوری محلے میں داخل ہوا اور جب لوٹا تو ایک بڑا بینر اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ہندو مسلم یکجہتی کے لیے بچوں سے نعرے لگوائے لیکن یہ سب فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہ بھایا اور آخر میں مجبور ہو کر بینر واپس بھیجنا پڑا۔ یہ کہتے ہیں کہ جہاں مسلم محلے میں ایک دو ہندو گھروں کی حفاظت مسلمانوں نے کی۔ وہیں فرقہ پرستوں نے زیادہ تر انہیں مظلومین کو نقصان پہنچایا جو اکثریتی علاقے کے محلے میں تھے۔ ایک سرکاری ملازم ریٹائر ہو کر دلتوری میں رہتے تھے لوگوں نے انہیں جانے نہ دیا۔ اب یہ عالم ہے کہ وہ اپنے گاؤں نہیں جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں میں اسی محلے میں محفوظ ہوں۔

اسی دوران کمشنر بھاگل پور نے ناتھ نگر تھانہ کے علاقے کے دونوں طرف کے لوگوں کو امن کی بات کرنے کے لیے بلایا دونوں طرف سے سمجھدار لوگوں نے منہ پر کی باتیں کہیں اکثریتی فرقے کے نمائندے نے جو امن قائم ہونے کے لیے اپنی بات رکھی اس کا لب لباب یہ تھا کہ سب سے پہلے تو کالی ماں کی پرتما جو ابھی تک کمرے میں ہے اسے اسی شان و شوکت سے بٹھا دیا جائے جیسا کہ باپ دادا کرتے ہیں۔ تب ہی کچھ شانتی ہو سکتی ہے اور مارکیٹ کھل سکتی ہے۔ کمشنر صاحب نے مداخلت کی کہ ہر طرح کے جلوس پر تو پابندی ہے آپ کچھ لوگوں کے ساتھ جائیں جلوس کے بغیر رکھ دیں اس کے لیے پولیس پورے حفاظتی اقدام کرے گی۔ امن کمیٹی کا نتیجہ صفر رہا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب تک کالی ماں کمرے میں ہیں تب تک اس بدنصیب شہر پر ایک بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

پتہ نہیں فرقہ پرستوں کی خونی پیاس اور کتنی جانوں کی قربانی لینے کے بعد ختم ہوگی بھی کہ نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے خون کی پیاسی چڑیلیں [illegible] بے بس و بے کس لٹے پٹے بے کس مظلوموں کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ فرقہ پرست ذہنیت کے وہ مسلم آبادی کا ایک حصہ نہیں بنا رہی ہے جو ابھی تک دنگائیوں کے تشدد سے بچی ہوئی ہے؟

ہفت روزہ نئی دنیا دہلی

مسلم انڈیا

مستقبل کا پیچ

مطبوعہ: ۱۶ر فروری ۱۹۹۰ء

بھارت دہشت گردی اور قتل و غارت گری کا دیس بن چکا ہے یہ ہے وہ مستند رائے جو عالمی رائے عامہ بھارت کے گزشتہ چند سال کے شب و روز کا جائزہ لینے کے بعد قائم کر سکتی ہے۔ مقبوضہ جموں کشمیر سے آسام تک لادینیت کے نام پر انسانی لہو بے دریغ بہایا جا رہا ہے اور برہمنی سامراج کی پیاس بجھ نہیں پائی حال ہی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس کمیشن کی طرف سے جو رپورٹیں چھپ کر سامنے آئی ہیں ان سب کا جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی مہذب انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بھارت میں انسانوں کا ایک خاص گروہ جس بے دردی سے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا خون بہا رہا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔

ان رپورٹوں میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ ۸۴ء میں جب بھارتی افواج نے سکھوں کے مقدس مقام دربار صاحب پر چڑھائی کی اور سکھوں نے پھر اس کا بدلہ لینے کے لیے وزیر اعظم اندرا گاندھی کو موت کی نیند سلایا ان دونوں واقعات میں بھارتی حکومت کے اعلان کے مطابق ۲ تا ۳ ہزار جانیں ضائع ہوئیں لیکن اس کے برعکس بھارت میں ہی موجود غیر جانبدار تحقیقی کمیشنوں نے جو رپورٹیں شائع کی ہیں ان کے مطابق ان دونوں حادثات میں ہندو فوج پولیس اور لیڈروں کے ہاتھوں مرنے والے سکھوں کی تعداد دس تا پندرہ ہزار کے درمیان ہے یہ صرف ۸۴ء کے ہنگاموں میں مارے جانے والوں کی تعداد تھی اس کے بعد سے آج تک جو ہزاروں سکھ برہمنی سیاست کی بھینٹ چڑھے ہیں ان کی بات الگ ہے۔

اسی طرح بھارت میں بسنے والی چھوٹی قومیں جو مذہب کے لحاظ سے تو ہندو ہیں مگر انہیں ہندوؤں کے مندروں میں جانے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی اور خود ہمارا

آسام اور یوپی میں جب ہندو کاشتکار چاہے ان کے گھروں اور املاک کو تباہ کروا دیتا ہے۔ ان لوگوں کی حیثیت ہندو سماج میں کبھی کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں رہی۔

بھارتی جریدہ انڈیا ٹوڈے اپنی ۱۵ جنوری کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ ۱۹۸۰ کی دہائی بھارت میں بلاشبہ قتل و غارت گری اور قدرتی آفات کی دہائی تھی آسام، ہزاروں کی تعداد میں بنگالی نژاد مسلمانوں کا ہندو آبادکاروں کے ہاتھوں قتل عام، آپریشن بلیو سٹار اس کے بعد اب تک جاری رہنے والا سلسلہ، بھارتی ائیر لائن کے جہاز کی سکھوں کے ہاتھوں تباہی جس میں ۳۲۹ مسافر مارے گئے تھے بھاگل پور میں مسلمانوں کا قتل عام اور ذات برادری کی بنیاد پر بہار میں اونچی اور نیچی ذات کے ہندوؤں کی آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جنگ، ۱۲ سو بھارتی فوجیوں کی سری لنکا میں ہلاکت بھارت میں لسانی مذہبی اور علاقائی بنیادوں پر پائی جانے والی نفرت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے اس دس سالہ دور نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بھارت میں ایک نیا سامراج جنم لے رہا ہے اور وہ ہے ہندو سامراج جس کی جڑیں بھارتی معاشرت میں اتنی گہری ہیں کہ انہیں اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہو گیا ہے اس صورت حال نے بھارتی حکومت کے سیکولرازم کے ڈھول کا پول کھول کر دنیا کے سامنے سیکولر بھارت کا اصلی روپ ننگا کر دیا ہے۔

جریدے کے مطابق ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہونے والے مذہبی فسادات کی تعداد ۴۵۰۰ سے زائد ہے ان فسادات میں ۷ ہزار سے زائد بے گناہ مارے جا چکے ہیں اس صورت حال میں جلتی پر تیل کا کام کرنے کے لئے اسی دہائی میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی جیسے مسئلے نے جنم لیا ہے اس مسئلے پر ملک کے کونے کونے میں انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کبھی ختم ہوگا یا نہیں۔

جہاں تک بھارتی آئین کی بات ہے تو اس کی پرواہ کون کرتا ہے عدالت کے فیصلوں کو خاطر میں نہیں لایا جا رہا اور ہندوؤں کی طرف سے واشگاف الفاظ میں یہ

اعلان متعدد مرتبہ دہرایا جا چکا ہے کہ وہ مسجد کو شہید کر کے یہاں ہر صورت مندر تعمیر کریں گے خواہ اس کی کچھ قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ اگر ہندو انتہا پسندوں نے کبھی اس کام کا آغاز کر بھی دیا تو بھارتی سیکورٹی فورسز نہیں روک لیں گی اس کی وجہ بھارت کے سیاسی اور لادینی حلقوں کے نزدیک یہی ہے کہ اب بھارت کی ایک بڑی سیاسی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی کھل کر ہندوازم کا پرچار شروع کر دیا ہے اور اس پارٹی کے انتخابی اعلانات میں یہ وعدہ سرفہرست تھا کہ برسر اقتدار آکر وہ بابری مسجد کی جگہ مندر تعمیر کروائیں گے۔

بھارتی جنتا پارٹی نے بھارتی سیاسیات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کھل کر ہندو کارڈ کھیلا ہے اس سے پہلے بھارت کی سیاسی جماعتیں جن میں کانگریس سرفہرست ہے ہمیشہ منافقت کی سیاست کیا کرتی تھیں اور بظاہر سیکولرازم کا نعرہ لگا کر مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کی جڑیں کاٹتی تھی اس کے علاوہ بھارت کے طول و عرض میں دوسری تنظیمیں ہندو انتہا پسندی کے ایجنڈا کے ساتھ سرگرم عمل ہیں لیکن قومی سطح پر پہلی مرتبہ جنتا پارٹی کی صورت میں ایسی جماعت سامنے آئی ہے جس نے مصلحتاً بابری مسجد کے مسئلے پر کوئی بیان مسلمانوں کے حق میں نہیں دیا اور پہلی مرتبہ کھل کر ہندی، ہندو اور ہندوستان کی بات کی ہے۔

ایل کے ایل اڈوانی کا کہنا ہے کہ اگر آپ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ایک ہندو پارٹی کہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہم ہندوؤں کی جو اس ملک کی آبادی میں اکثریت کی نمائندگی پر فخر کرتے ہیں جب بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کی اعلیٰ قیادت سے کسی نے پارٹی کے ہندوازم سے متعلق انتہا پسندانہ رویئے پر بات کی تو اس کو کچھ اسی قسم کا جواب ملا ہے۔

راجیو گاندھی اور اس کی آنجہانی ماں کے دور حکومت میں مذہبی بنیادوں پر بھارت کو جن اہم مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں شاہ بانو کیس جس میں مسلم پرسنل لاء زیر بحث آئے سکھوں کے مقدس مقام دربار صاحب پر ہندو فوج کا حملہ اور بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا تنازعہ ہے ان تینوں مسائل کی بنیاد مذہبی ہے شاہ بانو نامی ایک مسلمان عورت کو

پاس [illegible]

کو منجمد کرنے کا منصوبہ ایسی چیزیں بھی تو کبھی اور سنی جا رہی ہیں تو آخر ہم یہ کیوں
سوچتے کہ ہمارے دفاع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اب دفاع سے آگے بھی کچھ

نہیں آنے دینا چاہیے۔ بھارت اسلحہ کی خریداری اور ایٹمی تنصیبات کے بارے میں جو واویلا
کر رہا ہے میرے خیال کے مطابق ان کے پاس نیوکلیئر صلاحیت ہم سے زیادہ ہے لیکن

جس کی میگزین میں چھبیس گولیاں ہیں اور اس نے اپنے تہمد کا پیچ ٹٹولا۔ اور ریوالور!
یہ سب ہتھیار میں نے ایسے ہی لوگوں کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔

سلیم نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ اس کو ساتھ لے کر کھانے پر بیٹھ گیا اور دونوں کھانا کھانے لگے۔

(۹)

بیلوں کو ہانکتا ہوا جب وہ گھر داخل ہوا تو اس کی پھٹی ہوئی پیشانی دیکھ کر گلشن پریشان ہو گئی۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی بالٹی اس نے وہیں رکھ دی اور پریشانی سے پوچھا۔

"یہ چوٹ کیسے آئی بیٹا!"

سلیم تھوڑی دیر تک کچھ کہہ نہ سکا تھا۔ چہرے پر غم کی گہری چھاپ بھی لگ گئی تھی۔ غفور بھی قریب آیا اور بڑے اضطراب سے پوچھا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو بیٹا! کس سے جھگڑا ہوا؟"

سلیم کا سر جھکا ہوا تھا۔

"جھگڑا نہیں ہوا بابو!"

کارنامہ قرار دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کو بہلانے کی اور اپنی لیڈری چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ جنتا دل سے قربت کا دعویٰ رکھنے والا ہر مسلم لیڈر خود اپنی پیٹھ ٹھونک رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اس کے کہنے پر وی۔ پی۔ سنگھ نے اس چھٹی کا اعلان کیا حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو بہلانے کی ایک چال ہے۔ عام مسلمان اب اتنا باشعور ہو گیا ہے کہ وہ باتوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا

کچھ مسلم لیڈروں وی۔ پی۔ سنگھ پر یہ دباؤ بھی ڈال رہے ہیں کہ وہ انہیں وزیر بنا دیں یا پارٹی میں اہم عہدے دے دیں ورنہ مسلمان انہیں ووٹ نہیں دیں گے۔ اس کے لئے امام بخاری سے بھی دباؤ ڈلوایا جا رہا ہے جبکہ ماضی میں خود امام بخاری ایک بار نہیں ہزار بار کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کو پارلیمنٹ کی سیٹیں اور وزارتیں نہیں چاہئیں اس سے عام مسلمانوں کا کوئی بھلا نہیں بلکہ مسلمانوں کے نام پر چند نام نہاد مسلم لیڈر اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں۔ مگر آج بھی عام مسلمانوں کے نام پر اقتدار حاصل کرنے کا وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے جو ماضی میں کھیلا جاتا رہا ہے۔ کسی مسلمان کو وزیر بنانے یا کرسی دینے سے نہ ملک کا بھلا ہوگا نہ ملت کا لیکن مسلمانوں کے نام پر سیاست کرنے والے ان نام نہاد قائدین کا حلوہ مانڈا ضرور سیدھا ہو جائے گا۔

جنتا دل کے الیکشن کرانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عراق۔ امریکہ ٹکراؤ بن گیا ہے۔ آئندہ چند ماہ میں ملک میں پٹرول کی قیمت میں زبردست اضافہ ہوگا جس کے نتیجہ میں ہر چیز کے دام جو پہلے ہی آسمان کو چھو رہے ہیں بالکل بے قابو ہو جائیں گے پچھلے ۸ مہینوں میں مہنگائی نے اس طرح سے عوام کی کمر توڑ دی ہے کہ ان کے لیے سر اٹھانا مشکل ہو گیا ہے۔ اور مہنگائی کی یہ مار نہ ہندو دیکھتی ہے نہ مسلمان، نہ برہمن نہ ہریجن، نہ شہری نہ کسان۔ آج بنیوں کو، دکانداروں اور صنعت کاروں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے جب وی۔ پی۔ سنگھ راجیو کے وزیر خزانہ تھے تو ان بڑے بیوپاریوں پر خوب چھاپے مارتے تھے۔ مگر آج جب حکومت ان کے ہاتھ میں ہے اور یہ بیوپاری لوٹ مار مچا رہے ہیں تو ان کے خلاف رتی برابر کارروائی نہیں ہو رہی۔ بہرحال یہ مہنگائی اس سرکار کو بہت مہنگی پڑے گی۔

(نئی دنیا۔ دہلی)

مدھیہ پردیش کے مسلمان

مطبوعہ: ۲۴؍ اگست ۱۹۹۰ء

مدھیہ پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا اصل چہرہ اب کھل کر سامنے آ گیا ہے اور اس سے جو خوش فہمیاں تھیں وہ بھی دور ہو گئی ہیں، پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے سندر لال پٹوا کو ریاست کا وزیر اعلیٰ بناتے وقت کہا تھا کہ ہم مدھیہ پردیش کو ایک مثالی ریاست بنائیں گے۔ اور اسی کے ذریعہ دلی پر حکومت کرنے کی راہ ہموار کریں گے۔ لیکن گزشتہ دنوں کے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس نام نہاد مثالی ریاست کی تشکیل کے لیے شاید اقلیتوں کو خوفزدہ کرنا بھی بی۔ جے۔ پی کی حکومت عمل کا ایک اہم جز ہے۔ یہی وجہ کہ آج مدھیہ پردیش میں مسلم اور دیگر اقلیتوں کو مختلف طریقوں سے خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔

مسلمانوں پر سب سے زبردست وار اس وقت کیا گیا جب ۱۴ اضلاع میں ناجائز قبضہ ہٹانے کے نام پر بہت سے مکانوں کو مسمار کر دیا گیا۔ مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ کا کہنا ہے کہ اس میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا ہے اگرچہ ریاست میں کافی عرصہ سے کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا ہے لیکن حالات اتنے دھماکہ خیز ہیں کہ کسی بھی وقت فساد ہو سکتے ہیں۔ حکومت اور انتظامیہ کے دھمکی آمیز رویہ سے یہاں کی فضا کسی بھی وقت خراب ہو سکتی ہے۔ سرکار کے جانبدارانہ رویہ سے اقلیتوں میں زبردست خوف و ہراس اور بے چینی پائی جاتی ہے۔

چند دنوں قبل قبرستان کی زمین پر ایک تنازعہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی

مراد آباد نوحہ کناں ہے

مطبوعہ : ۲۴ اگست ۱۹۹۰ء

۱۹۸۴ء کے سکھ مخالف فسادات کے تین ملزموں کو کانپور شہر کی خصوصی عدالت نے عمر قید کی سزا دے دی ہے۔ مگر ۱۹۸۰ء میں مراد آباد کی عیدگاہ میں شہید کئے جانے والے سینکڑوں ہزاروں معصوموں کے لاشے ابھی تک بے گور و کفن پڑے ہیں۔ ان معصوموں کے قاتلوں کو سزا دینا تو کجا، آج تک ان کے مزاروں کی نشاندہی تک نہیں کی گئی ہے۔

دس سال پہلے وی پی سنگھ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے اور آج وہ ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ دس سال پہلے مراد آباد کے سانحہ پر وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کو تیار ہو گئے تھے مگر آج ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انھیں یاد بھی نہیں کہ کبھی مراد آباد میں کوئی انسانیت سوز حادثہ ہوا بھی تھا یا نہیں۔ وی پی سنگھ کی قیادت میں جب جنتا دل وجود میں آیا تو ہم ایسے کروڑوں مظلوموں نے اس کی تائید و حمایت کو اپنی جان پر ایک فرض تصور کیا۔ کمزور اور ناتواں ہاتھ اٹھے اور انھوں نے پل بھر میں سابقہ حکومت کا تخت الٹ کر پھینک دیا۔ ناواجب فرضوں کو ادا کیا۔ محض اس امید کے سہارے کہ ہمیں انصاف مل جائے گا۔ مگر انصاف آج بھی ہم سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ دس سال پہلے تھا۔ مراد آباد سے حاجی غلام محمد اور ڈاکٹر شمیم کو اپنے نمائندوں کے طور پر پارلیمنٹ اور اسمبلی میں پہنچانا اہل مراد آباد پر کوئی قرض نہیں تھا مگر انصاف کی ایک موہوم امید کے سہارے جنتا دل کے امیدواروں کے روپ میں ان کو ایوانوں کی رکنیت دلائی گئی۔

مگر افسوس ہنوز روز اول ہے۔ جن لوگوں کو پہلے ہر سال ۱۳ اگست کی یاد بہت تڑپاتی تھی اور جو ہر سال اس موقع پر کم از کم ایک اخباری بیان ہی جاری کر دیا کرتے تھے ان کو اب شہیدوں کی بوسیدہ ہڈیوں سے اتنا بھی پیار نہیں رہ گیا ہے کہ وہ صرف ایک بیان ہی جاری کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ ۱۹۸۰ء میں مرد، بچے بوڑھے اور جوان یوں ہی نہیں مر گئے تھے۔ ان پر باقاعدہ گولی چلائی گئی تھی ہزاروں افراد کے مجمع کو باقاعدہ پولیس سنگینوں سے روند کر رکھ دیا گیا تھا یہ واقعہ تھا جس نے چنگیز اور ہلاکو تک کی روحوں کو شرما کر رکھ دیا تھا جو لوگ اپنے رب کے حضور اپنی نیکیوں کا اجر اور اپنے روزوں کا ثواب طلب کرنے کے لیے عیدگاہ کے میدان میں سر بسجدہ تھے، ان کو غنڈہ، بدمعاش قرار دے کر ان کے سینوں کو چھلنی کر دیا گیا تھا اور یہ وہ ظلم تھا جس کی آج تک نہ کوئی داد ہے نہ فریاد زمانے بدل گئے۔ کانگریس کا دور ختم ہوا۔ وی پی سنگھ ملک کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے مگر وہ لہو جو ۱۳ اگست کو مراد آباد کی عیدگاہ میں بہایا گیا اس کی قسمت ابھی تک نہیں بدلی۔ کیا ہوا اس انکوائری کمیشن کا جس کو خود وی پی سنگھ نے بنایا تھا اس کی رپورٹ آج تک حکومت کے سرد خانے میں پڑی ہے، ہر سال اس رپورٹ کی فائل پر دھول کی نہیں بلکہ مظلوموں کے لہو کی تہیں مزید گہری ہوتی جاتی ہیں اور افسوس کسی کو فرصت نہیں کہ جسٹس سکسینہ کی دی ہوئی رپورٹ کو نکال کر اس پر عمل درآمد کرائے؟ ۱۹۸۴ء کے فسادات کے ملزموں کو سزائیں دی جا سکتی ہیں مگر ۱۹۸۰ء کی قیامت صغریٰ کے تمام خونخوار بھیڑیے آج بھی کھلے عام گھوم رہے ہیں۔ وہ سرکاری ملازم جن کے ہاتھ عیدگاہ مراد آباد کے لہو میں لتھڑے ہوئے ہیں، جن کے دامنوں پر آج بھی مظلوموں کے خون کے دھبے چمک رہے ہیں بڑی فرعونیت کے ساتھ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں، ان کے عہدوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ ان کی دولت، حشمت اور جاہ و ثروت روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے ... اور دوسری طرف آج تک کسی نے بے گور و کفن مظلوموں کے بے نام مزاروں پر ایک چراغ تک نہیں جلایا، ایک آنسو

تک نہیں بہایا! کیا یہی تقدیر ہے؟ کیا یہی انصاف ہے؟ - آج وی پی سنگھ کا گریبان ہمارے کمزور و ناتواں ہاتھوں سے بہت دور ہے کیونکہ ان کا تخت بہت اونچا ہے. اس کے پائے بہت مضبوط ہیں مگر ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کا تخت کتنا بھی اونچا کیوں نہ ہو ان معصوموں اور بے گناہ بچوں کی دلخراش آہوں سے کچھ دور نہیں جو ان کے لبوں سے عیدگاہ کے میدان میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے وقت نکلی تھیں. یہ آہیں اندرا گاندھی کو کھا گئیں. سنجے گاندھی کو نگل گئیں اور راجیو گاندھی کو انہوں نے بے اقتدار کر دیا پھر وی پی سنگھ کا تخت تو ہے کیا چیز! - تاریخ گواہ ہے کہ جب جب حکمرانوں نے مظلوموں کے بہتے ہوئے لہو کی جانب سے آنکھیں پھیر لی ہیں، تب تب حکمرانوں نے زوال کی طرف قدم بڑھائے ہیں، چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر جیسے طاقتور حکمراں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے. آج کل کے حکمرانوں کی تو بات ہی کیا!

آج ۱۲ اگست ۱۹۹۰ء ہے آج اس حادثہ فاجعہ کو دس سال پورے ہو گئے آج کے دن ہم اپنے شہیدوں کو یاد کرتے ہیں، ہمارا دل آج خون کے آنسو روتا ہے قطرہ قطرہ لہو جو ہر سال آج کے دن ہماری آنکھوں سے ٹپکتا تھا آج وہ بصورت سیلاب رواں ہے، ہاں ہم اپنے معصوم شہیدوں کو بھولے نہیں ہیں ہمیں ان کی قبروں کا پتہ نشان معلوم نہیں ہے، مگر ہم ان کی بے نام قبروں پر اپنے اشکوں کے چراغوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں!

اے خداوندا - !تو جبار و قہار ہے، تو منتقم حقیقی ہے، ہم آج کے دن تیرے حضور سر بسجود ہو کر دعا کرتے ہیں کہ ہمارے معصوموں کے قاتلوں کو ذلت کی موت دے، انہیں خاک اور خون میں لٹا دے ان کی باقیات کو بے نشان کر دے. تاکہ آئندہ پھر کبھی کسی ظالم و جابر کو کسی بے سہارا کے ساتھ ایسا ظلم کرنے کی ہمت نہ ہو۔

(نئی دنیا۔ دہلی)

میرٹھ اور ملیانہ کی چتائیں

مطبوعہ: ۶ / جون ۱۹۸۷ء

ملیانہ گاؤں جہاں پی اے سی کی ایک کمپنی نے مسلمانوں کا قتل عام کر کے لاشوں کو گنگا اور ہنڈوں میں بہا دیا تھا. ایک رپورٹ کے مطابق ملیانہ کے ۱۱۷ افراد لاپتہ ہیں جن کو مردہ تصور کر لیا گیا ہے جبکہ سرکاری رپورٹ کے مطابق صرف ۱۸ افراد ہلاک ہوئے ہیں. بہر حال نہتے افراد پر غیر قانونی فائرنگ کا حکم دینے والے پی اے سی کمپنی کے کمانڈنٹ ترپاٹھی کو ریاستی وزیر داخلہ کے بیان کے مطابق معطل کر دیا ہے لیکن کیا دکھاوے کے اس ایک اقدام سے مظلوموں کے آنسو خشک ہو جائیں گے؟ ہاشم پورہ، شاستری نگر، اسلام آباد۔ ذاکر نگر، املیان اور ملیانا میں شاید ہی سوال کسی کے دماغ میں آیا ہو گا. کیونکہ فساد زدہ لوگوں کے دل و دماغ ابھی قابو میں نہیں آئے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ لوگ ہنوز مخبوط الحواس ہیں. جیسا کہ املیان کی مردہ بیگم نے بلٹز کو بتایا کہ ابھی اسی بات کی فکر ہے کہ کس طرح دل و دماغ پر قابو پائیں؟

ملیانہ گاؤں میں جس کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، خون کی پیاسی پی اے سی کے جوانوں کے ہاتھوں قتل عام کے نتیجے میں پی اے سی کی اس کمپنی کے کمانڈنٹ ترپاٹھی کو معطل کیا گیا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ تنہا ہی مجرم ہے؟ اور کیا یہ قتل عام ملیانا تک محدود تھا؟ ان بے قصوروں کے متعلق کیا جو ہاشم پورہ میں پولیس کی حراست میں بھیڑ بکریوں کی طرح ہلاک ہو گئے؟ انسانی خون کی گنگا بہانے کی اس بھیانک

دو دستی بم اندر پھینک دیئے۔ چودھری حاکم کے پندرہ بیس حواری سب مر گئے تھے مگر وہ خود، اس کے دونوں بیٹے اور بیوی بچ گئے تھے کیونکہ جب وہ اوپر سے چھت میں سوراخ کر رہے تھے تو چودھری خطرے کی بو پا کر اپنے بیٹوں اور بیوی کے ساتھ درمیانی دروازے سے حویلی کے دوسری سمت چلا گیا تھا۔ ان تینوں نے چودھری کے گھوڑے کھولے اور راتوں رات حویلی سے باہر نکل گئے۔

تینوں بھائی گھر آئے۔ غفور اور گلشن سخت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ گلشن انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف بھاگی اور گلوگیر آواز میں ظفر سے بولی۔

"خیریت تو ہے نا بیٹے!"

ظفر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں ماں!"

"ہائے میرے اللہ!" گلشن دونوں ہاتھ ملنے لگی۔

"کچھ کر تو نہیں آئے ہو بیٹا!"

دکھ بھری آواز میں ظفر نے کہا۔

"ہاں ماں! ہم نے وہی کیا ہے جو ایک روز ہونا تھا۔ ہم ایک کئی قتل کر آئے ہیں۔"

گلشن رو دی۔

"اب کیا ہوگا بیٹے!"

ظفر نے اس کی ہمت بندھائی۔

"حوصلہ نہ ہارنا ماں!"

گلشن رو پڑی۔

"پولیس پکڑ کر لے جائے گی بیٹے!"

"نہیں ماں! ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"کہاں جاؤ گے بیٹے!" گلشن ہچکیاں لے رہی تھی۔

"جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا ماں! اب ہمیں اپنے آپ کو تقدیر پر چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ قتل ہم نہ بھی کرتے تو چودھری نے ہمیں سکون کی زندگی بسر نہ کرنے دینا تھی۔ وہ ایک عذاب کی صورت میں ہم غریبوں پر مسلط ہو گیا تھا۔ اب اس کا زور کم ہو جائے گا اور اگر وہ مر گیا ہے تو سکون ہی ہو جائے گا۔"

غفور بھی پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور غمگین غمگین سے جذبات تھے ہولے سے اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"زندگی میں کوئی ایسا غلط کام تو نہ کیا تھا جس کی ہمیں اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔ بہرحال خدا سے بہتری کی ہی امید ہے۔ تم تینوں بھائی کچھ عرصہ کے لیے روپوش ہو جاؤ۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ اندر گیا اور کچھ روپے لا کر ظفر کو تھما دیئے۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو اور وقت ضائع کیے بغیر دریا کے کنارے والے جنگل کی طرف نکل جاؤ اور اگر ممکن ہو تو بارڈر ہی پار کر جاؤ۔"

ظفر نے روپے لے لیے اور گلوگیر آواز میں کہا۔

سلیم اور کشور دونوں ہنس دیئے۔ کشور نے چور نگاہوں سے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا کیا ہے بابو! گھر سے جو کچھ آتا ہے وہی کھاتے ہیں"۔

سلیم نے شرارت کی:

"کشور کے ہاتھوں میں ہی کوئی رس ہے بابو!"

کشور شرما گئی۔ غفور نے بھی مسکرا کر کہا۔

"تم تو دن بھر دفتر رہتے ہو اور یہ بچاری گھر پر اکیلی پڑی پڑی گھبرا جاتی ہوگی"۔

"پہلے کچھ دن گھبرائی تھی بابو! پر اب اس کا بندوبست میں نے کر لیا ہے"

"کیا بندوبست کیا ہے تم نے"؟

"یہ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا تو پہلے ہی جانتی تھی۔ اب میں نے اسے خوب اچھی طرح لکھنا پڑھنا سکھا دیا ہے۔ پوری پوری رات اس پر محنت کرتا رہا ہوں۔ پہلے تو پڑھتی ہی نہ تھی۔ ایک دو بار میں نے اسے مارا بھی پھر جا کر کہیں اس نے پڑھنا شروع کیا۔ اب میں اسے کتابیں رسالے لا دیتا ہوں اور یہ پڑھتی رہتی ہے"۔

کشور مسکرا کر سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

غفور نے سختی سے کہا۔

"تم نے کیوں مارا بیٹے!"

کشور فوراً بول پڑی۔

"کہاں مارا ہے بابو! ایسے ہی مذاق کرتے ہیں۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں ہم تو کبھی آپس میں اونچا تک نہیں بولے نہ ہی آپس میں ناراض ہوئے ہیں۔ یہ تو پڑھاتے ہی نہیں تھے بابو! دفتر سے آتے ہی پلنگ پر گر جاتے تھے کہ میں تھک گیا ہوں۔ میں خود زبردستی ان سے پڑھتی رہی ہوں۔ رات کو مجھے پڑھاتے پڑھاتے میرے سامنے بیٹھے ہی سو جایا کرتے تھے اور ہاں بابو! میں نے کپڑے سینے کی مشین بھی لے لی ہے۔

ماں اور تمہارے لیے میں نے کپڑے بھی سی کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی بنیانیں، پاجامے اور شلواریں بھی میں خود ہی سیتی ہوں صرف پتلون کی ابھی تک صحیح سمجھ نہیں آئی۔ وہ بھی جلد ہی سمجھ جاؤں گی۔

یہاں ہمسائے میں ایک عورت سلائی کا سارا کام جانتی ہے۔ میں روزانہ اس کے پاس سیکھنے جاتی ہوں۔ یہاں درزی سلائی بہت لیتے ہیں بابو! پچھلے ماہ میں نے ان کے لیے ایک پتلون اور قمیض کا کپڑا لیا تھا اور جتنی اس کی قیمت تھی اتنی ہی درزی نے سلائی لے لی تھی۔

غفور بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"تو بازار سے سودا سلف تم خود خریدتی ہو"؟

کشور کی بجائے سلیم بولا۔

"ہر چیز یہی خریدتی ہے بابو! ویسے سودا بڑا زبردست کرتی ہے۔ جھگڑ جھگڑ کر قیمتیں کافی کم کرا لیتی ہے میں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میرے لیے بھی یہ کپڑے خود اپنی پسند کے خریدتی ہے۔ مجھے تو بس پہلے سلائے

آسام میں مسلمانوں کی حالتِ زار

مطبوعہ: ۱۰ر اگست ۱۹۹۰ء

آسام کی گن پریشد سرکار اپنے پنج سالہ دورِ اقتدار کے آخری لمحات گن رہی ہے۔ آئندہ دسمبر میں موجودہ سرکار کی آخری رسومات ادا کر دی جائیں گی۔ دسمبر میں اسمبلی کے لیے نیا انتخاب ہوگا یا پھر ریاست میں صدر راج لاگو کرنا پڑے گا۔ اگر نیا انتخاب ہوا تو بہت ممکن ہے اور موجودہ عوامی رجحان یہی عندیہ دیتا ہے کہ اس جانبدار، بدعنوان اور بداخلاق سرکار کی پارٹی گن پریشد کو آسام کے ستم خوردہ عوام پھر دوبارہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں عوام بے خوف و خطر اور بغیر روک تھام کے اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دے سکیں۔ اور آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کرنے کا ان کو موقع ملے۔

بدکردار، بداخلاق نوجوانوں کی اس سرکار نے گذشتہ پانچ سال میں اتنی بدعنوانیاں کی ہیں کہ آزادی کے گزشتہ چالیس سال میں بھی کسی حکومت نے اتنی بدعنوانیاں نہیں کی ہیں۔ اس گن پریشد سرکار نے آسام کے غریب، مفلوک الحال، مصیبت زدہ عوام کے لیے کچھ بھی نہیں کیا اگر کچھ کیا ہے تو صرف اپنے لیے کیا ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود اور اقتصادی اصلاح، ترقی کے لیے خرچ کرنے کے بجائے گذشتہ پانچ سال تک مختلف بہانے سے سرکاری خزانہ کو اپنی ہی جیب میں منتقل کرنے کی گن پریشد سرکار کے ہر شخص نے انتہائی بے شرمی اور دریدہ ذہنی سے کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی حالت بد سے بدتر اور ان کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی گئی۔ آج آسام گن پریشد کا ہر منسٹر جو

...ز لکھ پتی، کروڑ پتی بن گیا۔ اسکوٹر، موٹر سائیکل سے لے کر ماروتی جیپوں، کاروں اور ...بد گاڑیوں کے مالک وہ لوگ بھی ہو گئے ہیں جو کل تک اسکول کی فیس تک ادا نہیں ...تے تھے یا اخبارات یا ردی کاغذات فروخت کر کے اپنا جیب خرچ نکالتے تھے ...ے بعضوں نے تو دہلی میں بھی اپنے قریبی رشتہ داروں کے نام سے جائدادیں خرید ...گوہاٹی میں تو اکثر منسٹر اور ایم۔ ایل۔ اے (گن پریشد کے) نے جائیدادیں خرید کر کے ...ن مکانات بنا لیے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گن پریشد سرکار کے منسٹر اور ایم۔ ایل۔ اے کی بدعنوانیوں ...اری خزانہ کے ناجائز استعمال اور دہلی گوہاٹی میں جائدادیں خریدنے کی خبریں آجکل آسامی ...ذات یا آسام سے نکلنے والے انگریزی، ہندی اخبارات کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ہر ...ایسی خبریں مضبوط دلائل کے ساتھ جلی سرخیوں سے شائع ہوتی رہتی ہیں اور عوام ...لچسپی سے ان کو پڑھتے ہیں۔ یہی وہ اخبارات ہیں جن کی حمایت ہی کی وجہ سے ...ہی چند سال تک آسام میں مذہبی اور لسانی اقلیت کے فرقوں کے خلاف خونی تحریک ...اقلیت کے لوگوں کے خون سے آسام کی زمین سرخ ہو گئی تھی۔ ان کی لاشوں سے ...کا پانی سڑ گیا تھا۔ یہی وہ اخبارات ہیں جنہوں نے شروع میں گن پریشد سرکار کی مکمل ...اور تائید کی تھی اور اس نئی نسل پر پورا اعتماد کرتے ہوئے ان کی بڑی سراہنا کی تھی ...تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جب گن پریشد والوں کے اخلاق و کردار اور اعمال کا ...مشتہر ظاہر ہوا تو انہی اخبارات نے اس صورتحال کو بھی عوام کے سامنے بڑے واضح ...بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیش کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے عوام میں انکی ...ناپسندیدگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وہ آسامی عوام جن کو اس نئی نسل کی سرکار پر بے انتہا ...تھی۔ بے حد فخر تھا اور جنہوں نے اس نئی سرکار کے حلف لینے کے دن گوہاٹی ...ملد کے وسیع میدان کو انسانوں سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بنا دیا تھا۔ آج اس ...نام تک سننے سے نفرت کرتے ہیں۔ آسام کے کسی بھی طبقہ یا فرقہ کے لوگ اب ...اس سے خوش نہیں ہیں۔ ان کی نفرت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ بہت سے فرقہ

کے لوگ جیسے بڑو، کاربی، آہوم، برمی، مسنگ، راموننگ کوشح، راج بنگشی ہرارکر وغیرہ اب تو آسام نام کی ریاست تک میں رہنا پسند نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہر فرقہ اپنے لیے الگ ریاست چاہنے لگا ہے اور اس کے لیے سب نے تحریک بھی کافی زور و شور سے چلا رکھی ہے۔

گن پریشد والوں کو شروع ہی میں اسکا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی نا اہلیت اور بدعنوانیوں کی وجہ سے عوام کی حمایت وہ کھو بیٹھیں گے اور جس آسانی کے ساتھ برسر اقتدار آنے میں کامیاب ہو گئے تھے اس طرح آئندہ نہیں ہو پائے گا۔ بلکہ ناممکن سا ہو جائے گا اس لیے ان لوگوں نے آسام آندولن کے افراد پر مشتمل ایک دہشت گرد، جنگجو مسلح تنظیم بھی اپنے دور اقتدار میں قائم کر لی ہے جو الفا (U L F A) کے نام سے مشہور ہے الفا ممبر باہر جاتا ہے اور دہشت گردی کی مکمل تربیت حاصل کرتا ہے۔ اب تو الفا کی تربیت گاہیں آسام کے اندر بھی قائم ہو گئی ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ ایسی خفیہ تربیت گاہیں گوالپاڑہ کے پہاڑی علاقہ اور تیز پور میں قائم ہیں۔

الفا کو باہر سے جدید قسم کے ہتھیار ملتے ہیں۔ ناگالینڈ، منی پور وغیرہ کی دہشت گرد خفیہ تنظیموں سے ان کا گہرا رابطہ ہے۔ ساتھ ہی آسام کے ایک مخصوص فرقہ کے لوگوں نے بھی اپنا ہتھیار ان کو دینا شروع کر دیا ہے۔ کئی سو لوگ اب تک اپنی بندوقیں الفا کو دے چکے ہیں۔ یہ لوگ الفا کو اپنی بندوقیں دے کر پولیس کو اطلاع دیتے ہیں کہ الفا کے لوگوں نے زبردستی آ کر ہماری بندوقیں لے لی ہیں۔ الفا کے پاس اس وقت بے شمار دیسی اور غیر ملکی جدید اور قدیم قسم کے خطرناک ہتھیار موجود ہیں۔

الفا کا اصل مقصد آسام کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ پورے نارتھ ایسٹ زون ہی کو ہندوستان سے الگ کر دینا انکا وسیع تر مقصد ہے۔ اسی لیے الفا نے مشرقی ہند کی مختلف علاقوں کی خفیہ دہشت گرد تنظیموں سے مل کر ایک مشترکہ کمان اور لائحہ عمل تیار کرنے کا کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ الفا کی موجودہ کارروائیوں میں دولت مند لوگوں، بڑے بڑے تاجروں وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں چندہ وصول کرنا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے بڑے بڑے کاروباری لوگوں اور سرکاری اعلیٰ عہدہ داروں کا اغوا کرنا بھی شامل ہے اور آئے دن یہ لوگ یہی کر رہے ہیں۔

اندازہ ہے کہ الفا آئندہ عام انتخابات میں بھی بہت اہم پارٹ ادا کریگا۔ یعنی خوف و ہراس پیدا کر کے زبردستی اپنے لوگوں کو کامیاب کرانے میں ہر طرح کا حربہ استعمال کرے گا آزادی کے ساتھ لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے کا موقع بالکل نہیں دیا جائے گا۔ الفا اس وقت جس طرح شتر بے مہار ہے اسی طرح آئندہ بھی رہے اور اس کی روک تھام نہیں لگائی گئی تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ پارلیمنٹ کے الیکشن میں پر امن ماحول میں کوئی بھی آل انڈیا پارٹی حصہ نہیں لے سکے گی۔ بلکہ ہر حلقۂ انتخاب ہر پا نہ کا مبہم بن جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ابھی سے مرکزی حکومت اور الیکشن کمیشن کو اس طرف خصوصی توجہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ بندوقوں اور سنگینوں کے سایہ میں آسام میں الیکشن لڑنا یا قائم کرنا ہوگا۔ جس طرح بی جے پی مذہبی جنون پر پورے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتی ہے اسی طرح ایسا لگتا ہے الفا بھی بندوقوں کے بل بوتے پر آسام پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ مرکزی حکومت اس طرف خصوصی توجہ نہیں دیتی ہے تو مستقبل قریب میں آسام کے بھی پنجاب اور کشمیر بننے میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

خصوصًا ہندوستان کے مسلمانوں اور عمومًا تمام انصاف پسند حضرات کی اطلاع کے لیے یہاں اس حقیقت کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آسام کی گن پریشد سرکار کے بحیثیت دور اقتدار میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہے ہیں مسلمان۔ یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے کہ آسام اندولن کے دوران گن پریشد والوں نے مسلمانوں کے خلاف دل سے ہولی کھیلی تھی اور ایسا کرنے کے بعد ہی ۸۵ء میں ان کو اپنی سرکار قائم کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے شروع ہی سے ان کی یہ پالیسی رہی ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کی ہر خانہ میں مسلمانوں کو صفر کے درجہ میں رکھا جائے۔ اس لیے اگر کہا جائے کہ اس سرکار

کے زمانہ میں آسام کے مسلمانوں کو چوکیدار کی نوکری بھی نہیں ملی تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ جتنے بھی اقتصادی ترقی کے ذرائع ہیں ان سب کی راہیں منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کے لیے بند کر دی گئی ہیں اسمبلی میں جب اس پر سوال کیا جاتا ہے تو بڑے معصوم انداز میں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بنیاد پر کوئی کام نہیں کرتے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ مسلمان اپنے طور سے اپنی اقتصادی حالت کو سدھارنے کی جو کوشش کرتے ہیں اس میں بھی یہ لوگ دگن پرلشید والے روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں تاکہ مسلمان اپنے کاروبار میں بھی بدنام ہو جائیں اور ان کی پیشہ وارانہ تجارت بھی ٹھپ پڑ جائے، حال ہی میں ایسی ہی ایک سازش پکڑی گئی۔ یہ سازش انتہائی خطرناک تھی اور عالمگیر تھی اگر یہ سازش پکڑی نہ جاتی تو یقیناً آسام کا کاروباری مسلم طبقہ پوری دنیا میں بدنام ہو جاتا اور ان کا سارا کاروبار برباد ہو جاتا۔

آسام میں دوسرے اور علاقوں کی طرح ہوجائی (HOJAI) ایک ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں نسبتاً کافی خوشحال ہیں۔ اگر (عود ہندی) کی تجارت انکا مخصوص پیشہ ہے۔ اس تجارت کی وجہ سے یہ لوگ تقریباً تمام عالم اسلام میں خصوصاً عرب دنیا میں بہت مشہور ہیں۔

بمبئی ان کی اس تجارت کی مرکزی منڈی ہے۔ ہوجائی کے مسلمان جس طرح مالی اعتبار سے خوشحال ہیں اسطرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے جس طرح وہ دنیا کی دولت کماتے ہیں اسی طرح اس دولت سے وہ دین کی خدمت اور قوم و ملت کی فلاح و بہبود کے کام بڑے فراخدلی سے کرتے ہیں۔ آسام میں مدارس و مکاتب دینیہ کی خدمات، مساجد کی تعمیر اور رفاہ عام کے بے شمار کام مسلمانان ہوجائی کے مالی تعاون سے چل رہے ہیں۔ آسمانی مصائب ہوں یا دشمنان اسلام کے مظالم ہر موقع پر مظلوم اور مصیبت زدہ انسانوں کی خدمات کے لیے ہوجائی کے مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ خوشحالی ہمیشہ ایک مخصوص طبقہ کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ اگر کا یہ کاروبار چونکہ عرب ممالک سے ہوتا ہے اس لیے بھی مسلمانوں کا یہ کاروباری کچھ لوگوں کے بغض و عناد اور حسد و کینہ کا شکار بنا ہوا ہے۔ یہ لوگ آئے دن انکے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ یہ کاروبار بند ہو جائے۔

گذشتہ مورخہ ۲۹ جون کو ہوجائی کے ایک بڑے کاروباری آدمی کا لڑکا جو ہوجائی کالج کا ایک طالب علم ہے اپنے اسکوٹر سے گھر آ رہا تھا۔ اچانک ٹرافک پولیس نے اس کو روک کر اس کے اسکوٹر کی تلاشی لی۔ فرسٹ ایڈ بکس سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا بنڈل نکالا اور بتایا گیا کہ یہ ہیروئن ہے۔ فوراً پولیس کو بلایا گیا اور اس طالب علم کو مع اسکوٹر گرفتار کر لیا گیا اور بالکل ڈرامائی انداز میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں یہ خبر شائع کر دی گئی کہ ہوجائی کا ایک کاروباری آدمی کو ہیروئن کی ناجائز تجارت میں پکڑا گیا۔ اس کے یہاں سے جو ہیروئن برآمد ہوئی۔ اس کی قیمت کئی کروڑ روپیہ ہے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ سارے لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ یہ کیا ہوا کیا۔ یہ خبر اسقدر پھیلائی گئی اور اس انداز سے پھیلائی کہ ہوجائی کا مسلم تجارتی طبقہ خطرہ میں پڑ گیا تھا اور پوری دنیا میں بدنام ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو چیز اس لڑکے کے اسکوٹر کے بکس سے برآمد ہوئی تھی اس کی فنی جانچ کرانے سے پہلے ہی پولیس نے بڑی تفصیل سے اس خبر کو پورے آسام میں پھیلا دیا تھا اور اس کی قیمت کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گن پرلشید کے بعض مقامی ایجنٹوں کی خفیہ سازش تھی جو ان لوگوں نے پولیس سے مل کر کی تھی تاکہ ہوجائی کے "اگر" کے کاروباری مسلمانوں کو اسمگلنگ کے جال میں پھنسا کر برباد کر دیا جائے۔ فنی تحقیق اور جانچ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک معمولی نمکین پاؤڈر تھا۔ جس لڑکے کو پکڑا گیا تھا اس کا نام ہلال احمد تھا اور وہ بہت سنجیدہ اور محنتی طالب علم ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آسام گن پرلشید سرکار کا بنیادی نظریہ مسلمانان آسام کے بارے میں کیا ہے۔ اور اس طرح وہ مسلمانوں کو مالی اور اقتصادی میدان میں بھی اپاہج بنانا چاہتی ہے۔

(نئی دنیا۔ دہلی)

ترقی پسندی کے نام پر....

مطبوعہ: اگست ۱۹۹۰ء

سرسید کی روح اور مسلمانانِ ہند کے دل مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں احمد رشید شیروانی کا مضمون پڑھا۔ اشتیاق بڑھا کر علی گڑھ ملوں وہاں جاکر جو کچھ دیکھا سنا اور سمجھا وہ قارئین نئی دنیا کی عدالت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کیونکہ نئی دنیا کو ہی ملت کے درد کا صحیح ترجمان ہونے کا حق حاصل ہے۔

یوں تو علی گڑھ میں بھانت بھانت کے وائس چانسلر تشریف لائے مگر میں عوام کی رائے سے موازنہ محض چند کا کرنا چاہوں گا محترم طیب جی ایک آئی۔ ایس۔ آفیسر تھے اور سخت اڈمنسٹریٹر مگر عوام ان کو ملت کا ہمدرد و بہی خواہ مانتے ہیں عزت سے نام لینا پسند کرتے ہیں۔ محترم علی محمد خسرو جوکہ خالص تعلیمی میدان کے فرد تھے۔ انھیں لوگ حاکم وقت اور امیر خسرو کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور جمہوری قدروں کا علمبردار مانتے ہیں۔ جبکہ سید حامد صاحب اس یونیورسٹی کے طالب علم بھی رہے ہیں اور وائس چانسلر بھی۔ مگر لوگ ان کو علی گڑھ کی تہذیب کا قاتل شمار کرتے ہیں۔ جس کے ثبوت میں لوگ انھیں نئے لڑکوں کے لیے نئے ہوسٹل کا قیام اور لڑکوں کو الگ تھلگ رکھنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ جوکہ اپنے آپ میں بہت کچھ صداقت پر مبنی ہے کیونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وہ واحد ادارہ ہے جہاں جونیئر طالب علم اپنے سینیئر سے اُس روایتی تہذیب کا درس لیتا ہے جس کے لیے یہ یونیورسٹی مشہور بھی ہے۔ سید ہاشم صاحب سے پہلے یونیورسٹی کے چند شعبے ہی رشوت ستانی کے لیے مشہور تھے۔

مگر اب یہ طے کرنا دشوار نظر آتا ہے کہ رشوت کہاں نہیں پہنچی۔ وصی الرحمن صاحب کا نام سن کر لوگ منہ بسورتے ہیں جبکہ وہ اس یونیورسٹی کے پروفیسر بھی تھے۔ ان کے کارنامے نمایاں میں لوگ ان کے دوست رجسٹرار۔ ایس۔ ایم عثمان صاحب کی غیر قانونی تقرری اور پھر ان کے ذریعہ اپنی کنبہ پروری پر عوام کی رگِ ظرافت کچھ یوں پھڑکتی ہے کہ مسلمانوں کی اگر بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنا ہے تو سرکار ہر مسلمان کو ایک دن کے لیے ہی مسلم یونیورسٹی کا رجسٹرار بنا دے۔ ڈپٹی رجسٹرار سلیکشن اے۔ کے قاضی صاحب کو اقربا پروری کی لوگ ایک لمبی فہرست فراہم کرتے ہیں۔ جبکہ قاضی صاحب اپنے آپ کو سلامی گروپ کا فرد مانتے ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند گروپ کا بھی دامن اس وقت داغدار نظر آتا ہے۔ جبکہ انشاء اللہ فاروقی صاحب پر یونیورسٹی کے ۹۵ ہزار روپیہ کا بقایا معاف کراکر ان کو ہمیشہ کے لیے بیرونِ ملک جانے کا انتظام کرا دیا گیا بہرحال ایسا نہیں ہے کہ یہ کام کسی لاعلمی میں عمل میں آیا ہو بلکہ ترقی پسندوں کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں پر ایک گروپ تبلیغیہ بھی ہے جو پوری قوم کو فرشتہ بنانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

میرا مقصد کسی گروپ پر ذاتی تنقید نہیں ہے بلکہ اس تجزیہ سے عوام کے سامنے تصویر کا صحیح رخ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں ترقی پسند بھی ہیں، تبلیغیہ بھی ہیں، اسلام کے علمبردار بھی ہیں، کانگریسیہ بھی ہیں اور جنتائیہ بھی مگر قوم کے درد سے ہر قلب خالی ہے، مل سے عاری ہے سستی سیاسی شہرت۔ گروہی اقتدار ذاتی مفاد سے اوپر کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ گویا کہ حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سب سے زیادہ کسی کی مٹی اگر پلید ہے تو وہ غریب اسلام ہے اور مجبور عوام ہے۔ یہاں ترقی پسندی کا مطلب کسی غریب مسلمان کی قبر پر اپنے مستقبل کا محل تعمیر کرنا ہے۔ تبلیغ یہاں اسلام کے لیے نہیں بلکہ ذاتی پہچان کے لیے ہے۔ اسلام کا علم اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب کسی کے ذاتی مفاد پر ضرب پڑتی ہے۔ کسی کو قوم اور ملک و ملت کی پرواہ نہیں ہے کچھ نے اسلام کو پیشہ بنا لیا ہے تو کچھ نے ترقی پسندی کو دھندہ قوم اور قوم کے بچے جتنے کل تباہ حال تھے اتنے آج بھی ہیں۔ ویسے مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کی اجارہ داری سمجھی جاتی ہے

مگر یہاں ایسا کچھ بھی تو نہیں ہے۔ جب قوم کے بچے ہی تباہ ہو گئے تو ملک کا مستقبل کیسے محفوظ رہ سکے گا۔ یہ بات نہ کوئی سمجھ پاتا ہے نہ خود سمجھ پاتا ہے۔

بہرحال اس تمہید کے بعد تصویر کا اصل رخ پیش خدمت ہے۔

یونیورسٹی میں انتظام اور انتظامیہ نام کی چیز بھی باقی نہیں ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۷ مارچ ۱۹۸۵ء کے یو۔ جی۔ سی کے ایک ہی آرڈر کے آدھے حصے کا اطلاق ان لوگوں پر تو کر دیا گیا جو انتظامیہ کے مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے آدھے حصے کا اطلاق ابھی تک التوا میں جان بوجھ کر ڈال دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ آرڈر یونیورسٹی و عوام کے مفاد میں یو۔ جی۔ سی کا ایک اچھا اقدام ہے۔ افسوس تو اس پر ہے کہ آدھے حصہ کے اطلاق کے لیے کسی بھی یونیورسٹی کی مثال نہیں لی گئی دوسرے آدھے حصے کے لیے دلی یونیورسٹی کا منہ دیکھا جا رہا ہے۔ اندازہ ہوا کہ علی گڑھ کی خود مختاری اپنے آپ میں ایک سوال ہے۔

۲۔ سینئر سیکنڈری اسکول جسے طالب علم کے لیے ہر مقابلہ کے امتحان کا پہلا دروازہ مانا جاتا ہے وہاں کے تعلیمی معیار پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ اسکول کے پرنسپل کو میں نے محض ایک پڑھا لکھا کلرک پایا۔ سائنس کی پڑھائی کا انتظام شاید ان کے بس کا روگ بھی نہیں ہے اساتذہ پر محاسبہ کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں نہ ہی ایسا کوئی طریقہ کار ہے کہ طلبہ کے والدین یہ اندازہ کر سکیں کہ ان کے بچے کی تعلیم و ترقی کا کیا معیار ہے۔ اور اخلاقی پستی کہاں تک پہنچی ہے ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر اپنی ہی یونیورسٹی سے ہائی اسکول میں اول آنے والے طلبہ یا تو سیکنڈ کلاس پاس ہوتے ہیں یا پھر فیل۔

۳۔ طالب علم کے دماغ بنانے میں متوازی غذا کا بھی دخل ہوتا ہے اس امر پر کبھی بھی ہال کا پرووسٹ شاید متفق نظر نہیں آتا۔ ہوسٹل کی کمی نے لڑکوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

۴۔ عبداللہ گرلز اسکول کا عالم یہ ہے کہ وہاں کی استانی جو غلط نوٹس لکھا دیں اسی کو ازبر کر لو اگر اعتراض کیا تو بچیوں کی زندگی عذاب کر دی جائے گی یہ قوم کی ماؤں

کا حال ہے۔ گرلز کالج کا حال تو اور بھی دگرگوں ہے جس کے لیے اللہ سے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

۵۔ داخلوں میں بلاشبہ کہیں نہ کہیں سے رشوت داخل ہوئی ہے۔ جس کے واضح ثبوت و آثار پائے جاتے ہیں۔ خاص کر میڈیکل اور انجینئرنگ میں۔ اصل اعتراض رشوت پر نہیں ہے کیونکہ سارے ہندوستان کے مزاج سے الگ مسلم یونیورسٹی بھی نہیں ہے دکھ اس کا ہے کہ اپنی اس گھناؤنی حرکت کا الزام لوگ قوم و ملت کے ان معصوم بچوں کے سر دھر دیتے ہیں کہ مسلمان بچوں میں صلاحیت ہی نہیں ہے اس لیے میڈیکل اور انجینئرنگ میں ان کی فیصد کم ہو گئی ہے۔

۶۔ دراصل قوم کے قائدین ملت کے بھی خواد سارس کی طرح ریت میں سر گاڑ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ہم کسی کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو ہمیں بھی کوئی نہیں دیکھ رہا ہوگا میرے خیال میں قوم میں اب بھی ایسے ہونہار نونہال موجود ہیں جن کو کوچنگ۔ ٹیوٹوریل دے کر ملک و ملت کے لیے باعث فخر بنایا جا سکتا ہے۔

۷۔ مسلم یونیورسٹی کا میڈیکل کالج مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک واحد ادارہ ہے قوم کے درد میں مگرمچھ کے آنسو بہانے والے لوگوں سے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہال سے نکلا ہوا اگر ایک جونیئر ڈاکٹر ٹی۔ بی۔ کی وہ دوا جو دن میں محض ایک وقت کی جانی ہے۔ اسے اگر تین وقت کے لیے لکھتا ہے تو کمی کس کی ہے لڑکے کی یا استاد کی۔ ایسے نسخہ کا میں خود مشاہدہ کر چکا ہوں۔

۸۔ یونیورسٹی پیٹرول پمپ منافع کما کر غریب طلباء کی کچھ مالی مدد کر سکتا ہے اس میں کوئی سیاست نہیں ہے اور کسی کا مالی مفاد بھی نہیں ہے پھر اس طرف دھیان کون دے۔

۹۔ کہنے کو یہاں آئی اے۔ ایس کے لیے ادارہ کوچنگ اور گائیڈنس سینٹر بھی مگر کتنا تعمیری کام ہوا ہے کہ سید ہاشم صاحب کے دور میں آئی اے۔ ایس کا نتیجہ رہا یہاں ادارہ فروغ سائنس بھی ہے مگر کاغذی گھوڑے کی شکل میں۔

۱۰۔ جو بچے کالج اور اسکول کی پڑھائی سے مطمئن نہیں ہیں ان کے لیے کوئی معقول کوچنگ سینٹر بھی نہیں ہے۔

۱۱۔ ملازمین کے لیے مکان کی قلت سے ان کے بچوں کے داخلہ میں زحمت ہے جو سرکار اور یو۔جی۔سی دیتا ہے اس کا بھی اطلاق نہیں ہے۔

۱۲۔ اساتذہ میں دس، دس سال سے مستقلی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی وہ استاد کھلے دل سے کیا کام کرے گا جسے کل اپنی نوکری کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو۔

بہر حال درد بھی شدید ہے فہرست بھی لمبی ہے دور دور تک کوئی مسیحا بھی نظر نہیں آتا بقول محترم شیروانی صاحب کے یونیورسٹی ایگزیکٹیو کونسل میں بھی بہت اچھے لوگ ہیں اور کورٹ میں بھی افضل ترین لوگ ہیں اور دہلی سے یقیناً وائس چانسلر کے جو نام بھی تجویز ہوں گے وہ بھی بہت اچھے ہی لوگ ہوں گے مگر سوال یہ ہے کہ ان میں قوم کا درد کتنا ہے، ملت سے محبت کتنی ہے اور عمل کیا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نیا وائس چانسلر آئی۔اے۔ایس آفیسر، ہو یا اکیڈمیشین۔ سوال اس جذبہ صادق کا ہے جس نے اس یونیورسٹی کو جنم دیا میری دعا ہے کہ آنے والا وائس چانسلر حقیقت پسند ہو اور سرسید کے خواب عالی کا صحیح امین بھی (آمین)

کورٹ کی ۲۹ جولائی ۱۹۹۰ء کی میٹنگ کے بعد ہند کے مسلم عوام ایگزیکٹیو کونسل کورٹ کے اہل ممبران اور عزت مآب عالی جناب صدر جمہوریہ ہند سے یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا نئے وائس چانسلر کی تقرری نئے داخلوں سے پہلے ممکن ہو سکے گی؟

نئی دنیا۔ دہلی

تاملوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام

مطبوعہ: اگست ۱۹۹۰ء

سری لنکا کے کتھنکدی سرحدی قبضہ میں مسلمان حسب معمول پورے خشوع و خضوع کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور سربسجود تھے کہ تامل لبریشن ٹائیگرس آف تامل ایلم (ایل ٹی ٹی ای) کے ڈھائی سو سے زیادہ دہشت گردوں نے مسجدوں کو آگھیرا انہوں نے مسجدوں کے تمام دروازوں اور آنے جانے کے راستوں پر قبضہ کر کے نہتے بے قصور صف بستہ نماز میں مشغول مسلمانوں پر پشت سے اندھا دھند فائرنگ کی، بم پھینکے۔ آٹومیٹک ہتھیاروں سے سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کر دیا اور سینکڑوں کو زخمی کر دیا۔ وحشی دہشت گردوں نے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں شہر کی دو بڑی مسجدوں میرا اور حسینیہ میں اپنی درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ بموں کے نتیجہ میں مسجدوں کو بھی نقصان پہنچا۔ تامل وحشی چیتے آٹومیٹک ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ دہشت گردوں کے حملوں میں زخموں سے چور مسلمانوں نے بتایا کہ کچھ چیتے باہر راستوں میں کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ دو گاڑیوں میں سوار ہوئے اور جس راستہ سے آئے تھے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی راستہ سے جنگل میں روپوش ہو گئے۔

سری لنکا سے ہندوستانی امن فورس کی واپسی کے بعد تامل دہشت گردوں نے بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا ہے اگرچہ سری لنکا کے شمال مشرقی صوبہ میں

آباد یہ مسلمان بھی تامل نژاد ہی ہیں مگر یہ ایل ٹی ٹی ای کے دہشت گردوں کا ان کی دہشت گردانہ اور انتہاپسندانہ کارروائیوں میں ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ وہ پُرامن طور پر رہنا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے امن فورس کا خیر مقدم کیا تھا۔ جو تاملوں کو سری لنکا حکومت کی مبینہ زیادتیوں سے بچانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اور جس نے سبھی تاملوں سے کہا تھا کہ وہ ہتھیار ہمارے حوالے کر دیں۔ سری لنکا حکومت سے جو سمجھوتہ ہو چکا ہے اس کو لاگو کرنے میں تعاون دیں۔ امن فورس کی اپیل پر تاملوں کی دوسری تنظیموں نے ہتھیار اس کو سونپ دیئے تھے۔ ایل ٹی ٹی ای نے ان تمام تاملوں کا بھی قتل عام اور نسل کشی شروع کر دی جنہوں نے پرامن طور پر رہنے کے لیے امن فورس کا خیر مقدم کیا اور اس کی اپیل پر اس کے ساتھ تعاون کیا۔ اسی قصبہ میں ایل ٹی ٹی ای کے وحشی چیتوں نے دسمبر ۱۹۸۷ء میں ۷۰ سے زیادہ مسلمانوں کو شہید کر ڈالا تھا۔ نیشنل فرنٹ کے لیڈروں نے برسر اقتدار آنے کے بعد سابقہ حکومت کے ہر صحیح اور غلط فیصلہ و اقدام کو یکسر الٹ کر پھینک دینا اپنا بنیادی مقصد اور اہم مشن بنا لیا۔ چنانچہ دوسروں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے امن فوج کو واپس تو بلا لیا مگر ایل ٹی ٹی ای کے چیتوں کی درندگی سے ان بے گناہوں کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ سوچنے کی ذرا بھی ضرورت محسوس نہیں کی جنہوں نے اپنی جان۔ مال عزت آبرو کو داؤ پر لگا کر امن فوج کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ نیشنل فرنٹ حکومت نے امن فوج کو واپس بلا کر امن پسند تاملوں خصوصاً تامل مسلمانوں کو پوری طرح تامل چیتوں کے بیچ بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے جس سے خونی چیتے ان کی نسل کشی میں مصروف ہیں۔

سری لنکا سے امن فوج کی واپسی کے بعد سے سری لنکا میں آباد تامل مسلمان خاص طور پر تامل چیتوں کی درندگی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ انہوں نے مختلف گاؤں میں پوسٹر بھی چسپاں کئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ۱۰ اگست کے بعد علاقہ میں کوئی مسلمان نظر نہیں آنا چاہیے۔ مسلمان فوراً علاقہ خالی کر دیں۔ گذشتہ چند دنوں سے مسلمانوں کے خلاف تامل چیتوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ حریت ۱۵

کو ۱۷ مسلمان کسان اپنے کھیتوں سے واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے کہ تامل دہشت گردوں نے اچانک حملہ کر کے انھیں بھون ڈالا۔ سری لنکا مسلم کانگریس کے ایک ترجمان نے بتایا کہ مسلمانوں کی لاشوں پر پرچیاں بھی چسپاں پائی گئیں جن میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے گاؤں خالی کر کے چلے جائیں ورنہ قتل کے لیے تیار رہیں۔

ایک دوسری واردات میں تامل چیتوں نے اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے ۱۱ مسلم کسانوں کو دن کے گیارہ بجے بھنبھوڑ ڈالا۔ اس موقع پر بھی ۴۰ سے زیادہ مسلمان زخمی ہوئے تھے۔

ایل ٹی ٹی ای کے دہشت گرد چیتوں نے چند دن کے وقفہ سے پاس کے ایک گاؤں کی مسجد میں بھی مسلمانوں پر حملے کئے تھے۔ سری لنکا مسلم کانگریس کے ایک لیڈر مسٹر وفا فاروق کے مطابق دہشت گرد اس گاؤں میں فوجی وردی میں پہنچے اور لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کے لیے کہا۔ مسلمان انھیں فوجی سمجھ کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ تو انہوں نے گولیوں کی بوچھار کر ڈالی۔ ایل ٹی ٹی ای کی مسلمانوں کی نسل کشی کے واقعات سے علاقہ میں زبردست کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اور حکومت ہند و سری لنکا کے رویہ سے مایوس ہونے کے بعد شاید مسلمانوں نے اپنا تحفظ خود کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور اب ایک تازہ ترین اطلاع کے مطابق مسلمانوں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے ۳۵ تاملوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ انہوں نے شمالی کولمبو میں ایک مندر پر بھی حملہ کیا اور پجاری اور ایک شخص کو قتل کر دیا۔ اگرچہ سرکاری ذرائع سے ان خبروں کی تصدیق یا تردید نہیں کی گئی ہے۔ سری لنکا مسلم کانگریس کے ترجمان نے بھی یہی کہا ہے کہ اس طرح کے کسی واقعہ کی انھیں کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ خبریں صحیح ہیں یا غلط بہر حال مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اگر مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ نہ کیا گیا تو دیر سویر ایک دن لازمی طور پر وہ بھی اسی راستہ پر چلنے کے لیے خود کو مجبور محسوس کرنے لگیں گے۔

ایل ٹی ٹی ای کے بٹی کلوا ایریا لیڈر کریکلن نے مسلمانوں پر حملوں میں ایل ٹی ٹی ای کے چیتوں کا ہاتھ ہونے سے انکار کیا ہے اور الزام لگایا ہے کہ اس طرح کے قتل عام کی وارداتیں

خود حکومت سری لنکا دوسرے جنگجو گروپوں کے ذریعہ کرا رہی ہے تاکہ عرب ممالک سے حمایت اور تعاون حاصل کرسکے۔ ایل ٹی ٹی ای نے مسلمانوں کے قتل کے لیے تاملوں کے ہی ایک نئے تشکیل شدہ گروپ "ریڈ ۴" کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ جو ای پی آر ایل ایف اور پی ایل او ٹی کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ لیکن مسجدوں پر حملوں میں بچ جانے والوں کا کہنا ہے کہ یہ حملے ایل ٹی ٹی ای والوں نے ہی کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک مسجد پر حملہ میں شامل ایل ٹی ٹی ای کے ایک لیڈر رنجن اپاکو اور دوسری مسجد پر حملہ میں شامل رنجیت کو پہچان بھی لیا گیا۔ فوجی ذرائع کا کہنا ہے کہ خفیہ ایجنسیوں کی اطلاعات یہ ہیں کہ ایل ٹی ٹی ای لیڈروں نے اپنے لوکل یونٹوں کو حکم جاری کئے ہیں کہ وہ ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیں جو ان کی مخالفت کر رہے ہیں یا ان کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے۔

سری لنکا مسلم کانگریس نے الزام لگایا ہے کہ سری لنکا حکومت مسلمانوں کی حفاظت کے سلسلہ میں پوری طرح ناکام ہو گئی ہے۔ مسٹر ایم ایچ ایم اشرف نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ دہشت گرد چیتوں کے ہاتھوں معصوم شہریوں کا یہ بدترین قتل عام ہے جس میں انہوں نے مسجدوں میں گھسنے اور خدا کے دربار میں سربسجود نمازیوں کا قتل عام کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ سری لنکا حکومت سے بار بار اپیل کی گئی ہے کہ ایل ٹی ٹی ای کے حملوں سے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے انتظامات کئے جائیں لیکن حکومت نے اب تک اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔

ایل ٹی ٹی ای کی بربریت کی تمام دیگر تامل گروپوں نے بھی زبردست مذمت کی ہے۔ اپوزیشن سری لنکا فریڈم پارٹی نے بھی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے سخت ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند اور سری لنکا دونوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ جن مسلمانوں نے ایل ٹی ٹی ای کا ساتھ نہ دے کر پرامن طور پر رہنے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ وہ ان کا تحفظ کریں اور علاقہ میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن انتظامات کریں۔

(نئی دنیا۔ دہلی)

جانبداری اور غیر جانبداری

مطبوعہ: ۲۹ جولائی ۱۹۹۰ء

ایک طرف نیپال اس مسئلہ میں الجھا ہوا ہے کہ وہ ہندو ملک رہے یا نہیں اور دوسری طرف وہاں تبدیلی مذہب کا عمل عروج پر ہے واقف کار حلقوں نے دعویٰ کیا ہے کہ گزشتہ تین مہینوں کے دوران میں سے تیس ہزار ہندو عیسائی بنائے جا چکے ہیں۔ بھٹارائے کی طرف سے نیپال کے ہندو ملک کی حیثیت برقرار رکھنے اور وہاں مذہبی آزادی کے اعلان کے باوجود تبدیلی مذہب کے حق کا مطالبہ جاری ہے۔

نیپال میں عیسائیوں کے خاص نمائندے چارلس مینڈس نے نیپال کے دو سو چرچوں کو سرکاری منظوری دلانے اور ۱۹۶۲ء کے تبدیلی مذہب سے متعلق قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ نیپال کے قانون کے مطابق اگر کوئی ہندو مذہب تبدیل کرتا ہے تو اسے ناقابل تسلیم سمجھتے ہوئے اس کو ہندو ہی مانا جائے گا۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو چھ سال قید تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ غیر ہندوؤں کے لیے اب اس قانون کو ختم کرانے کا مسئلہ وقار کا سوال بن گیا ہے۔ اس مطالبہ کی حمایت ہند نیپال سرحد پر ۵۰۰ کلو میٹر کے علاقے میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے علاوہ ہمالیہ سے متصل منگول نسل کے بودھ لاماؤں نے بھی کی ہے۔ حالیہ دنوں میں کٹھمنڈو میں لاماؤں کے جلوس نکل رہے ہیں کٹھمنڈو کی جامع مسجد کے شاہی امام مولانا حیات حسین مکی نے نیپال کی مسجدوں کو سرکاری منظوری دینے، اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے مسلمانوں کے تہواروں پر سرکاری چھٹیاں دینے اور ملازمت میں اقلیتوں کے لیے ریزرویشن تک کا

مطالبہ کیا ہے وہ تبدیلی مذہب کے حق کا مطالبہ بھی کر چکے ہیں۔

دوسری طرف عبوری سرکار میں بھی مذہبی غیر جانبداری بنام ہندو راشٹر کے سوال پر پارلیمنٹ کے ممبران چالیس اور آٹھ فیصد کے فرق سے کھینچ تان کر رہے ہیں۔ نیپالی کانگریس کے ایک وزیر مارشل شاکیہ اپنے دوروں کے دوران مذہبی غیر جانبدار ملک بنائے جانے کی یقین دہانی کرا رہے ہیں۔ جبکہ مہاراجہ کی طرف سے نامزد ایک دوسرے وزیر اچیوت راج نے نیپال کو ہندو راشٹر قرار دینے کا اعلان نہ کرنے پر مرن برت کی دھمکی دی ہے۔ بائیں بازو کا محاذ مذہبی غیر جانبداری کے نظریہ پر متفق ہے مہاراجہ کی حامی پنچایتی پارٹی آئندہ انتخابات میں اس مسئلہ کا فائدہ اٹھانے کی تاک میں ہے۔

حال ہی میں ٹنڈ یکھیل کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بودھ بھکشو ترانند نے کہا کہ "ہندوؤں کے اوپر نامناسب الفاظ کے تیر چلانا ہی جمہوریت میں مذہبی غیر جانبداری کی پہلی شرط ہوگی"۔ اس بیان پر نیپال کے ہندوؤں اور بودھوں کے درمیان لفظی جنگ جاری ہے۔ دوسری طرف گزشتہ دو مہینوں کے دوران عیسائی لیڈروں کے نیپال کے دوروں کی وجہ سے بھی ہنگامہ برپا ہے ہندو دھرم سرکشنی سنگھ کے جنرل سیکرٹری بھولا ناپوگی اور تنظیم کے مشیر ڈاکٹر ورسی لال نے الزام لگایا ہے کہ مذہبی غیر جانبداری کے مسئلہ پر ویٹیکن سٹی سے پوپ تک نے خط بھیجا ہے۔

نیپال میں عیسائی لیڈروں کی پراسرار موجودگی کے سبب ہندو تنظیموں میں گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ گذشتہ دنوں برطانیہ کی ایجنسی انٹرنیشنل کے ممبروں نے کٹھمنڈو جاکر تبدیلی مذہب کے اختیارات سے متعلق بھٹارائے کو ایک یادداشت پیش کی ہندو تنظیموں نے ہندوستان کے ایک وزیر کی طرف سے رکسول سے کٹھمنڈو تک بڑی ریلوے لائن بچھانے میں خصوصی دلچسپی کو عیسائی دباؤ کی سیاست کا ایک حصہ قرار دیا ہندوؤں کے ایک بڑے مذہبی لیڈر ریوگی بربہری ناتھ نے امریکی کانگریس کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا ہے جس میں مذہبی غیر جانبداری کے مطالبہ کی مخالفت کی گئی تھی۔

حال ہی میں جیل سے رہا ہونے والے نیپال میں عیسائیوں کے لیڈر چارلس مینڈس نے اپنے فرقہ کے لیے ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ دینے کی بات کہی ہے۔ جبکہ تبدیلی مذہب، مذہبی تبلیغ اور چرچوں کی تعمیر کے کاموں پر اب تک ستر لاکھ ڈالر سالانہ سے زیادہ خرچ نہیں کئے گئے۔ بہت سے پسماندہ علاقوں میں جہاں غربت اور بے روزگاری بہت زیادہ ہے عیسائیوں کی آبادی ستر سے اسی فیصد ہے۔ اس کے علاوہ گورکھا پالین میں بھی عیسائیوں کا یہی تناسب ہے۔ نیپال میں عیسائی مذہب اختیار کرنے والوں میں خاص طور سے منگول نسل کے لوگ ہی ہیں اور عیسائیت کی تبلیغ بھی اسی نسل سے تعلق رکھنے والے پادری زیادہ کرتے ہیں ان سے روشن خیال نوجوان زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ عیسائی تنظیمیں نیپال میں ایک لاکھ یہودیوں کی آبادی ہونے کو تسلیم کرتی ہیں لیکن سرکاری ذرائع کے مطابق عیسائیوں کی تعداد سوا دو لاکھ ہے اور جس رفتار سے تبدیلی مذہب کا عمل جاری ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتخابات تک ساڑھے تین لاکھ عیسائی ووٹ دینے کے لیے تیار رہیں گے۔

مُکّے بازی کی سیاست

مطبوعہ : جولائی ۱۹۹۰ء

ایک بھارتی اخبار نے اس ماہ کے اوائل میں ایک کارٹون شائع کیا جس میں راجیو گاندھی کو مکہ تانے ہوئے تمام برائیوں سے لڑنے کا عہد کرتے دکھایا گیا ہے "میں نے جنوبی افریقہ میں نسل پرستی، امریکہ میں رنگ ونسل پر مبنی تعصبات اور لاطینی امریکہ میں جبر کے خلاف جنگ کی ہے ہم ایمنسٹی انٹرنیشنل کے خلاف جنگ کریں گے۔

بالکل یہی کچھ راجیو گاندھی اپنے اقتدار کے پانچ سالہ دور میں کرتے رہے ہیں اور اب بھی جبکہ وہ اپوزیشن کے لیڈر ہیں، یہی کر رہے ہیں۔ اس ماہ کے شروع میں یوتھ کانگریس والوں نے بمبئی کے اہم ہوائی اڈے پر اپنی تحریک شروع کی جس کا مقصد دنیا میں انسانی حقوق کی اس سب سے بڑی تنظیم کے عہدیداروں کو ملک میں داخل ہونے سے روکنا تھا۔ موصوف نے اپنی گھن گرج کے ساتھ کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں آپ لوگوں کے ساتھ اس جدوجہد میں براہ راست شامل ہو کر دھرنے پر بیٹھوں گا۔

اندرا کانگریس کے اس شور وغل کا سبب وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ کا یہ اعلان تھا کہ حکومت ہندوستان میں ایمنسٹی کی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھا رہی ہے حالانکہ یہ اعلان مشروط تھا۔ مثلاً اعلان میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ ایمنسٹی کے عہدیداروں کو اپنی ذاتی حیثیت سے۔ یا پھر عمومی مسائل پر حکومت سے گفت وشنید کی غرض سے ہندوستان آنے دیا جائیگا۔

راجیو گاندھی نے کہا کہ ایمنسٹی کو اجازت دے کر حکومت نے ہندوستان

کے اقتدار اعلیٰ اور علاقائی سالمیت کا سرپٹا سودا کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "حکومت بین الاقوامی دباؤ کے مقابلہ میں نرم ہو گئی ہے" اور یہ کہ امریکہ معاشی تحدیدات کے ذریعہ ہندوستان پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

وزارت خارجہ کے ایک سرکردہ عہدیدار نے تصدیق کی کہ امریکی کانگریس (پارلیمنٹ) کے ۵۰ ارکان نے وی پی سنگھ کو لکھا ہے کہ انسانی حقوق کے اداروں کو ہندوستان میں آنے دیا جائے ان میں سے ۲۶ ہندوستان مخالف ارکان نے تو امریکی کانگریس میں ایک بل تک پیش کر دیا جس میں کہا گیا کہ اگر حکومت ہند ایمنسٹی والوں کو ہندوستان آنے کی اجازت نہیں دیتی تو ہندوستان کی امداد بند کر دی جائے۔ تاہم اس بات کی تردید کی گئی کہ پابندی ہٹانے کا امریکی دباؤ سے کوئی تعلق ہے۔

بالآخر ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بارے میں تمام شور وغل سائے سے لڑنے کے مترادف نکلا۔ ہندوستان کے ایک دوست امریکی سینیٹر اسٹیفن سولارز نے اس فیصلہ کو بے مدعا بتایا جبکہ ایمنسٹی والوں کو خوشی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ہندوستان کا دورہ کرنے کی اجازت شروط تھی اس معاملہ میں تنظیم کے ضابطے سخت ہیں جو کسی حکومت کی کھلی اجازت کے بغیر کسی مقام پر اس کی تحقیقی ٹیموں کو جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

امریکہ کے ایشیا واچ اور ایسے دوسرے اداروں کے برخلاف جن کو ہندوستان آنے کے لیے درحقیقت اجازت بھی نہیں لینا پڑی۔ ایمنسٹی کو ہندوستان کی گڑبڑ والی ریاستوں میں ہر مقام پر جانے کے لیے حکومت کی پیشگی منظوری لینا پڑے گی۔ تب جا کر وہ ملک کو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں کوئی مفصل رپورٹ تیار کر پائے گی۔

ہندوستان میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اتنی مخالفت کیوں ہو رہی ہے! اس کی پالیسی سخت ضابطوں کے ایک پورے مجموعہ کی رہنمائی میں طے ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ کوئی غیر ذمہ دار یا ایسی تنظیم نہیں ہو سکتی جو کسی کے زیر اثر ہو۔ جیسا کہ اس کو بعض اوقات ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں خصوصی رول ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ان قیدیوں کو رہا کرانے کی سعی کرتی ہے جن کو ان کے خیالات کی بنا پر

گرفتار کیا گیا ہو (بشرطیکہ وہ تشدد کا عمل یا پرچار نہ کرتے ہوں) یہ سزائے موت اور قیدیوں کو ایذائیں دینے کی مخالفت کرتی ہے۔

یہ بات عجیب ہے کہ ایسے وقت جب کیوبا، ایران اور پاکستان جیسے ممالک جن کو "بند" سماج کہا جاتا ہے ایمنسٹی اور ایسے دوسرے بین الاقوامی گروپوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اور سوویت یونین نے تو ایمنسٹی کو اپنے یہاں دفتر کھولنے کی پیشکش کی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اپنے یہاں انسانی حقوق کے تحفظ کے گروپوں کو آنے کی اجازت دینے میں متامل ہے۔ ایمنسٹی کے ذرائع نے دعویٰ کیا ہے کہ اس ادارے ساتھ ہندوستان کی حکومت نے کبھی خوشدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی ٹیموں کو ہمیشہ ویزا کے مسئلہ کا سامنا ہوا اور ریڈیو جیسے سرکاری ذرائع نشر و اشاعت کو اس ادارے کی سرگرمیوں کے بارے میں گمراہ کن اطلاعات پھیلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر بھی عام لوگوں کی مایوسی میں یہ امید کی کرن کی مانند ہے۔ لندن میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سکریٹریٹ کو ہزاروں خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں خصوصاً بچوں اور کمسنوں کی رہائی کے لیے اس کی مدد طلب کی جاتی ہے۔

کشمیر میں تو صورت حال یہ تھی کہ حقوق انسانی کی ایک ہندوستانی تنظیم کے نمائندے جب وہاں پہنچے تو ہزاروں افراد نے گھیر لیا وہ سمجھے کہ بالآخر ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ان کی صدائیں سن لی ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران ایمنسٹی نے جنیشور مصرا، مدھو ڈنڈوتے مرارجی ڈیسائی اور ایل کے اڈوانی جیسے سیاستدانوں کی رہائی کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ ایمرجنسی کے بعد جب مختصر سے عرصہ کے لیے مسز اندرا گاندھی کو جیل بھیجا گیا تو ایمنسٹی ہی تھی، جس نے ان کی رہائی کے لیے کوششیں کیں۔ شاید اسی وجہ سے مسز اندرا گاندھی نے اپنے آخری برسوں میں اس ادارے کے بارے میں اپنے خیالات بدل دیئے تھے ایمنسٹی کے ایک عہدیدار نے کہا کہ ہم کو امید تھی کہ نئی حکومت اندرا کانگریس کے مقابلہ میں زیادہ جمہوریت پسند ہوگی گو کہ ہمارے کئی ارکان مرلی چند بھنڈاری اور ایم۔ ایل سنگھوی اس پارٹی سے نزدیک ہیں، حیرت کی بات ہے وہ ہم کو یہاں نہیں آنے دینا چاہتی

وزیر اعظم مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے منڈل کمیشن کی سفارشات کو تسلیم کر لینے کے اعلان کے لیے جو وقت چنا اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے عدم مساوات کے مسئلہ سے زیادہ سیاسی مسئلہ تھا۔ مسٹر دیوی لال کو نائب وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کرنے کے بعد ان کو ان پس ماندہ طبقات کی حمایت کی سخت ضرورت تھی جو ابھی تک جنتا دل میں ان کے گروپ کے حلقہ اثر کے باہر سمجھے جاتے تھے۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو ان پسماندہ طبقات اور مسلمانوں پر مشتمل اپنا جو حلقہ اثر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی کاٹ بھی اس لیے ضروری تھی کہ ماضی میں مسٹر یادو مسٹر دیوی لال کے طرفدار رہے ہیں اور حالیہ معاملات میں ان کا رویہ زیادہ سے زیادہ غیر جانبداری کا رہا ہے۔ اجگر اور مجگر کی سیاست اس وقت عروج پر ہے اور اسی گندے پانی میں وزیر اعظم کو اپنے ہاتھ بھی دھونے تھے اسی لیے بر وقت منڈل کمیشن کی سفارشات کو تسلیم کرنے کے لیے ان کے نقطہ نظر سے یقیناً مناسب وقت تھا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ایک بنیادی سماجی و معاشی مسئلہ کو محض گروہ بندی کی سیاست کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

بابری مسجد

ایک اور ڈرامہ

مطبوعہ: ۱۰/ اگست ۱۹۹۰ء

بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعہ دن بدن ابتری کی طرف گامزن ہے نئی حکومت جس نے ملک کو درپیش بحرانوں سے چھٹکارا دلانے کی قسمیں کھائی تھیں اور گھنٹوں دنوں مہینوں میں چٹکی بجا کر مسائل حل کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ اس وقت خود اپنے دام میں ایسی گرفتار نظر آتی ہے کہ اس کی نجات آسان نہیں ہے۔ سیاسی سطح پر ہر روز ایک نیا ڈرامہ رچایا جا رہا ہے۔ اور عوام مسلسل حالات کے دباؤ میں پستے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات کا فائدہ اٹھا کر جارح فرقہ پرست طاقتیں اپنی اپنی دوکانوں کو سجانے اور دوکانداری کو بڑھانے میں حد درجہ مصروف ہیں۔ حکومت کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ حالات کی سنگینی کا اندازہ کرے اور عوام کو راحت پہنچائے۔ اسی لیے مسئلہ کشمیر ہو یا پنجاب بابری مسجد ہو یا مہنگائی کا بڑھتا ہوا سیلاب سب کی طرف حکومت کی نظر ایک فریب نظر سے زیادہ نہیں ہے۔

بابری مسجد تنازعہ سے نپٹنے میں اگرچہ یوپی کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کا رویہ بہت مثبت اور حقیقت پسندانہ ہے لیکن وی پی سنگھ کی مرکزی حکومت اس معاملہ میں جو کچھ کر رہی ہے وہ یا تو مسلمانوں کو اپنی شرائط پر راضی کرنے کی حکمت عملی ہے یا پھر عوام کو یہ دھوکہ دینا ہے کہ حکومت اس معاملہ میں خاموش نہیں ہے اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کا اندازہ گزشتہ ہفتہ اس وقت ہوا جب وزیر اعظم وی پی سنگھ اور مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ سبودھ کانت سہائے نے علیحدہ علیحدہ بابری مسجد رابطہ کمیٹی

اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کی تفصیلات جاننے کے بعد اور رابطہ کمیٹی کے بعض ممبران سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ لگانے میں قطعاً دیر نہیں لگی کہ مرکزی حکومت اس معاملہ کو یا تو وشو ہندو پریشد کے حق میں ختم کرنا چاہتی ہے یا پھر اسے یونہی لٹکائے رکھنا چاہتی ہے تاہم اس کا منشاء یہ ضرور ہے کہ بات چیت کا دروازہ بند نہ کیا جائے اور وقتاً فوقتاً بات چیت کا ڈرامہ کر کے عوام کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ حکومت اس معاملہ میں بہت فکرمند ہے اور وہ مسلسل متعلقہ فریقوں سے رابطہ استوار کر کے اس تنازعہ کو گفتگو کی میز پر حل کرنے کی خواہش مند ہے۔

گزشتہ ۲۰ جولائی کو پہلے تو مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ مسٹر سبودھ کانت سہائے نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی تحریک سے وابستہ لیڈروں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور اس کے بعد اگلے دن یعنی ۲۱ جولائی کی رات کو سیاسی ہنگامہ خیز لیے کے طوفان میں وی پی سنگھ نے فریقین سے گفتگو کی۔ جب اس گفتگو کے بارے میں متعلقہ لیڈروں سے معلومات حاصل کی گئیں تو اکثر نے ناامیدی کا اظہار کیا۔ مسٹر سبودھ کانت سہائے نے اس میٹنگ کے لیے جو دعوت نامے ارسال کئے تھے وہ محض تحریک کے لیڈروں کو نظر میں رکھ کر جاری نہیں کئے گئے تھے بلکہ بعض سماجی اور مذہبی شخصیات کو بھی انفرادی طور پر مدعو کیا گیا۔ میٹنگ میں مدعو کئے گئے لوگوں میں کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے نمایاں ارکان شامل نہیں تھے۔ اس لیے ایکشن کمیٹی کو اس پر اعتراض ہوا اور انہوں نے یہ کہتے ہوئے میٹنگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ ایکشن کمیٹی کا کوئی رکن یا عہدیدار انفرادی طور پر گفتگو میں شریک نہیں ہوگا۔ ایکشن کمیٹی کے عہدیداروں کی شرکت اسی وقت ممکن ہے جب تمام عہدیداروں کو مدعو کیا جائے۔ رابطہ کمیٹی کے کنوینر سید شہاب الدین نے وزارت داخلہ سے بات کر کے کمیٹی کے تمام ارکان کے نام دعوت نامے حاصل کر لیے لیکن اس معاملہ میں ایکشن کمیٹی نے اخباری بیان دینا ہی مناسب خیال کیا۔

رابطہ کمیٹی کے اہم رکن مولانا سید احمد ہاشمی نے جو کہ ۲۰ جولائی کو مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ مسٹر سبودھ کانت سہائے سے تقریباً دو گھنٹہ طویل گفتگو میں شریک تھے میٹنگ

تجویز ہیں کی کہ تمام عبادت گاہوں کی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء والی پوزیشن بحال رکھنے کے سلسلے میں یک مرکزی قانون بنایا جائے جس پر وزیر اعظم نے کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تاہم وزیر اعظم نے اتنا ضرور کہا کہ حکومت بابری مسجد کے معاملے میں کافی الرٹ ہے اور وہ اپنی ذمہ داری نبھائے گی۔ مولانا احمد علی قاسمی نے وزیر اعظم سے گفتگو کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت گفتگو کا سلسلہ محض اس لیے جاری رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنے حرکت و عمل کا احساس دلا سکے ورنہ حکومت اس معاملے میں کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے حتیٰ کہ وہ عدالتی عمل کو تیز کرنے پر بھی بظاہر آمادہ دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے کہا کہ فی الحال اس بات کا کوئی امکان موجود نہیں ہے کہ حکومت ۳۰ اکتوبر تک عدالت یا گفتگو کے ذریعہ اس مسئلہ کا کوئی حل نکال پائے گی۔ انہوں نے کہا کہ معاملہ کو طول دیکر کانگریس نے جو غلطی کی تھی وی پی سنگھ کی حکومت بھی ایسی غلطی کو دوہرا رہی ہے۔ تاہم سید شہاب الدین وزیر اعظم کی گفتگو سے پر امید نظر آتے ہیں وزیر اعظم نے بھی اپنی گفتگو میں رابطہ کمیٹی کے ارکان پر اس بات کے لیے زور دیا کہ اس مسئلہ کا گفتگو کے ذریعہ کوئی حل سوچا جائے بظاہر بابری مسجد تحریک کے لیڈروں سے وزیر اعظم اور وزیر مملکت برائے داخلہ کی یہ گفتگو بھی ناکام رہی ہے اُدھر دوسرا فریق اپنی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ مندر تعمیر کرنے کے مقام اور اس کی تاریخ پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں مسلم لیڈروں پر یہ دباؤ ڈالا جانا کہ وہ اس مسئلہ کا کوئی حل تجویز کریں محض بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ مسلمانوں کو داؤ میں لینے کی سیاست ہے۔

اس کے علاوہ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے حکومت کے تئیں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ بھی ناقابلِ فہم ہے۔ ایکشن کمیٹی سے وابستہ بیشتر افراد حکومت کے خاصے قریب سمجھے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وی پی سنگھ پر ان کا خاصا اثر ہے لیکن بابری مسجد تنازعہ کے تصفیہ کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنا اثر استعمال کرنے سے گریز کر رہے ہیں جبکہ دوسرا فریق بی جے پی کے ذریعہ حکومت پر مسلسل دباؤ بنائے ہوئے ہے اور حکومت اس دباؤ کے آگے بہت حد تک

جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف رابطہ کمیٹی کے بعض ارکان وی پی سنگھ سے نہایت متاثر ہیں جس کا اندازہ ۲۱ جولائی کی میٹنگ کے دوران ہوا اس میٹنگ میں رابطہ کمیٹی کے ان ارکان کا انداز عاجزانہ اور بڑی حد تک خوشامدانہ تھا رابطہ کمیٹی کے ان ارکان کا رویہ بھی اتنا ہی ناقابلِ فہم ہے جتنا ایکشن کمیٹی کے لوگوں کی ناسمجھ میں آنے والی حکمت عملی۔

وشو ہندو پریشد نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت یکم اگست سے اپنی ملک گیر تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ اس تحریک کا مقصد اجودھیا کی متنازعہ عبادت گاہ پر رام مندر تعمیر کرنے کے لیے ہندو عوام کے ذہنوں کو تیار کرنا ہے تاکہ آئندہ ۳۰ اکتوبر کو جب وشو ہندو پریشد بابری مسجد کے مقام پر رام مندر تعمیر کرنے کے لیے قدم آگے بڑھائے تو پورے ملک کے ہندو اس کے ساتھ ہوں۔ اس سلسلے میں جو حکمتِ عملی تیار کی گئی ہے وہ رام شلا پوجن کے اس پروگرام سے زیادہ خطرناک اور زہریلی ہے جو گزشتہ برس ۹ نومبر کو اجودھیا میں ہوئے شیلا نیاس سے پہلے تیار کی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں ملک میں مسلمانوں کے خلاف زبردست نفرت پھیلائی گئی تھی اور جگہ جگہ فساد پھوٹ پڑے تھے — اب ایک بار پھر وشو ہندو پریشد اور دیگر انتہا پسند ہندو تنظیمیں عوام کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ خطرناک اور زہریلے نعرے لے کر منصوبہ بند طور پر میدان میں نکلی ہیں لیکن مرکزی حکومت اس سلسلے میں بار بار توجہ دلانے کے باوجود خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ تاہم یہ ایک اطمینان بخش بات ہے کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس جو رام مندر تحریک میں گمراہ ہو جانے کے بعد اقتدار سے گمراہ ہوئی تھی اس نے وشو ہندو پریشد کے پروگراموں کو کاؤنٹر کرنے کا اعلان کیا ہے اور تاریخ سے سبق سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یوپی میں وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں جنتا دل نے وشو ہندو پریشد کے اس پروگرام کو بے اثر بنانے کے لیے اپنے ورکروں کو میدان میں اتارنے کے لیے کہا ہے یہ دونوں باتیں خوش آئند ہیں۔

برکت نے زیادہ دیر نہ لگائی تھی۔ جلدی ہی وہ واپس آگیا تھا۔
اس کے ساتھ اس کے دو محافظ بھی تھے [illegible]

کچھ دیر تک وہ شہر کی جانب جانے والے راستے پر چلتے رہے پھر نواب اور اس کا ساتھی بائیں طرف دریا کی سمت مڑ گئے۔

برکت نے اپنے پیچھے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے اعتراض کیا۔
ادھر کدھر جا رہے ہو۔
سلیم نے اس کی تسلی کرنا چاہی۔
ہمارے کچھ ساتھی دریا کے کنارے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں انہیں بھی ساتھ لینا ہے۔
برکت اپنے ساتھیوں کے ساتھ رک گیا۔
میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔ سیدھے شہر کی طرف چلتے ہو تو چلو، ورنہ میں واپس جاتا ہوں۔
نواب اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لینے لگا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی بھی مستعد ہو گئے تھے۔

چلو بھائی سیدھے ہی چلو۔ ساتھ ہی اس نے ہوا میں اپنی پانچ انگلیاں بھی لہرا دیں۔

برکت اور اس کے محافظ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اپنے اپنے ہتھیاروں سے ہاتھ اٹھا لیے۔ گھوڑوں نے جونہی پانچ قدم آگے بڑھائے نواب تیزی سے پلٹا اور شاہین کی مانند برکت پر جھپٹ پڑا۔ اسی لمحہ سلیم نے چیتے کی سی تیزی سے جست لگائی اور برکت کے دونوں محافظوں کو گھوڑے سے نیچے گرا کر ان پر سوار ہو گیا۔ ان کے دونوں ساتھی بھی ویسی ہی تیزی اور پھرتی سے آگے بڑھے اور ان تینوں سے ہتھیار چھین کر اپنے قبضے میں کر لیے۔ پھر انہوں نے تینوں کے ہاتھ اور منہ باندھے اور گھوڑوں پر سوار کر کے وہ انہیں دریا کنارے لے آئے۔

گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے برکت اور اس کے ساتھیوں سے ہاتھ اور منہ کھول دیئے۔ برکت نے قہر آلود نگاہوں سے سلیم کی

جاکر دفن ہوگئی ہیں جو مسلمانوں کی ایک ایک جھینک کو بھی حب الوطنی اور وفاداری کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ اگر اسی طرح جارح فرقہ پرستوں کی تمام باتوں کو یوں ہی برداشت کیا جاتا رہا تو ایک دن یہ ملک دشمن عناصر ملک کا بیڑہ غرق کر دیں گے یہ بات طے ہے۔

ملک کو ایک صاف ستھری اور پاک وشفاف حکومت دینے کا دعویٰ کرنے والے وی پی سنگھ آہستہ آہستہ خود اپنے ہی جال میں گرفتار ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور ان کی قلعی کھل رہی ہے۔ ایک جانب جہاں جنتا دل کے اندرونی انتشار نے ان کے اندرونی اتحاد کے تمام دعوؤں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے انتظامی اور سیاسی سطح پر بعض ایسے اقدامات کئے ہیں جو ان کی صاف ستھری امیج پر سوالیہ نشان ثبت کرتے ہیں فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے لیے ان کے دل میں نرم گوشے کا احساس تو اسی دن ہو گیا تھا جس دن انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر بی، جے پی جیسی فاشسٹ جماعت سے ہاتھ ملایا تھا اس کے بعد وشو ہندو پریشد کے لیے ہمدردی کا اظہار انہوں نے اس کے نام پر جاری کئے گئے انکم ٹیکس نوٹس کو انتہائی بھونڈے انداز میں واپس لے کر اور نوٹس دینے والے افسر کو معطل کر کے کیا تھا۔ سلسلہ یہیں تمام نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل کے بھائی کو سینئر بورڈ کا چیئرمین نامزد کیا گیا اور اب خود وزیر اعظم وی، پی سنگھ نے اپنے دفتر میں ایک ایسے فرقہ پرست اور مسلم دشمن شخص کو جوائنٹ سکریٹری نامزد کیا ہے جس نے گزشتہ سال بہار میں ہوئے مسلم کش فسادات میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کی حیثیت میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔ اس آئی اے ایس افسر کا نام جے شنکر کانت سنہا ہے۔

مشہور صحافی اور کانگریس کے ترجمان مسٹر ایم جے اکبر (ایم پی) نے اس انتہائی عجیب وغریب تقرری پر گہری تشویش ظاہر کی ہے اور سیکولر عوام کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔ مسٹر ایم جے۔ اکبر کے مطابق گزشتہ برس نومبر میں بھاگلپور فسادات کے بعد ریاستی حکومت نے رام شلا پوجن کے جلوسوں پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی مسٹر شنکر کانت

سنہا اس وقت پٹنہ ڈویژن کے ڈویژنل کمشنر تھے۔ انہوں نے ریاستی حکومت کے سخت احکامات کے باوجود ضلع روہتاس کی انتظامیہ کو مجبور کیا کہ وہ ضلع میں رام شلا پوجن کے جلوس نکلنے کی اجازت دے اور مقامی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس پی نے ریاستی حکومت کے فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس جلوس میں حصہ لیا اور سہسرام میں جلوس کو نکالنے کی اجازت دے ڈالی۔ یہی نہیں انہوں نے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکنے سے روکنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے سہسرام میں فساد پھوٹ پڑا اور اقلیتی فرقے کے درجنوں لوگ ہلاک ہوئے اس فساد میں مسلمانوں کا تقریباً دس کروڑ کا نقصان ہوا۔ مسٹر ایم جے۔ اکبر کا کہنا ہے کہ یہ تعجب کی بات ہے کہ سنہا جیسے فرقہ پرست شخص کو وزیر اعظم کے دفتر میں نامزد کیا گیا جس کا ریکارڈ بہت گندا ہے ایم. جے اکبر نے مطالبہ کیا ہے کہ وزیر اعظم سیکریٹریٹ جیسے حساس دفتر سے مسٹر سنہا یا ان جیسے دوسرے فرقہ پرست عناصر کو بلا تاخیر ہٹایا جائے اور ایسے عناصر کو عبرتناک سزا دی جائے۔

(نئی دنیا۔ دہلی)

ہنگامہ آرائی کا پس منظر؟

مطبوعہ: ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ء

پاکستان کے ایک بڑے شہر کی بھری پری شاہراہ کے ایک معروف چوک میں ایک ویگن رکتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ویگن سے ہاکیوں اور لوہے کے سریوں سے مسلح چار نوجوان باہر نکلتے ہیں ان کا رخ ویگن کے نزدیک بس سٹاپ کے ایک کونے میں موٹر سائیکل پر موجود نوجوان کی طرف ہے جو اپنے ایک دوست سے محو گفتگو ہے۔ حملہ آور مغلظات بکتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہیں نوجوان کو گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی بمشکل مل پاتی ہے جب حملہ آور اس پر پل پڑتے ہیں اس کا ساتھی حملہ آوروں کو دیکھتے ہی جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھتا ہے۔

حملہ آور موٹر سائیکل سوار کو مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں جب وہ نیم بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے تو پہلے سے سٹارٹ ویگن میں سوار ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ شہر کے اس معروف چوک میں عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دور سے یہ نظارہ دیکھتا رہتا ہے کوئی مداخلت نہیں کرتا کوئی مددگار نہیں آتا۔ ان تماشہ دیکھنے والوں میں پولیس کانسٹیبل بھی شامل ہیں جو اتفاقاً یہاں ڈیوٹی پر موجود ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی منظر ہے شہر کے ایسے ہی بارونق علاقے میں وہی ویگن رکتی ہے۔ پستولوں سے مسلح نوجوان برآمد ہوتے ہیں سڑک کے ایک کونے میں کھڑے ایک نوجوان کو اس کی چیخ و پکار سے لاپرواہ ہو کر مغلظات بکتے ہوئے ویگن میں زبردستی سوار کرتے ہیں۔ مغلوب مدد کے لیے چلاتا ہے کوئی مدد کو نہیں آتا اور حملہ آور اسے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ سفر کا اختتام

ایک کالج کے ہوسٹل پر ہوتا ہے۔ ہوسٹل کے ایک کمرے کے سامنے ویگن رکتی ہے اور اس نوجوان کو دھکے دیتے یہ لوگ کمرے میں لے جاتے ہیں۔ یہ ان کا "انٹروگیشن سنٹر" ہے۔ یہاں وہ اپنے "شکار" کے جسم پر سگریٹ داغتے ہیں۔ اس کی ہڈیاں توڑ دیتے ہیں اور یہی ویگن بے ہوش نوجوان کو سڑک کے کسی کونے میں کوڑا کرکٹ کی طرح پھینک آتی ہے۔

شہر کے معروف چوک میں کسی کالج یا یونیورسٹی کی دو لبیں رکتی ہیں غیظ و غضب سے بھرے نوجوان طالب علموں کا گروہ باہر نکلتا ہے دو چار بینر وہ اپنے سامنے پھیلا کر ہائے ہائے کے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں ان کے کچھ ساتھی پہلے سے اپنے پاس موجود ٹائروں کو سڑک کے درمیان رکھ کر آگ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ سڑک کے چاروں طرف ٹریفک جام ہو جاتی ہے نوجوان کچھ دیر تک نعرہ بازی کرتے ہیں اور جلتے ٹائر چھوڑ کر جن بسوں میں آئے تھے ان میں بیٹھ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اپنے پیچھے وہ جلتے ٹائر دھواں اور دہشت چھوڑ جاتے ہیں کوئی اس آگ کو بجھانے کی ہمت نہیں کرتا جلتے ٹائروں کے دائیں بائیں سے راستہ بنا کر ہارن بجاتے لوگ گاڑیاں کسی نہ کسی طرح نکال کر لے جاتے ہیں ٹائر آخری لمحے تک جلتے رہتے ہیں۔ انہیں بجھانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔

ہاتھوں میں پستول لہراتے گولیاں برساتے طلبا ہوسٹلوں میں مورچہ بند طلبا مخالف تنظیموں پر دشمنوں کے سے انداز میں جھپٹنے والے طلبا۔ درسگاہوں کو ہنگامہ آرائی کی بھینٹ چڑھانے والے طلبا کیا یہ ہے ہمارا مستقبل۔

مستقبل کے ان معماروں کے ہاتھوں سے کتابیں چھین کر یہ کس ظالم نے ان کو آتشیں اسلحہ تھما دیا۔ ان سیدھے سادے نوجوانوں کو درندگی کا روپ دھارنے پر مجبور کرنے والے خفیہ ہاتھ کس کے ہیں؟ کون سے ہیں؟ ان پتلیوں کو نچانے والے مشاق ہاتھوں پر کس نے پردہ ڈال رکھا ہے؟ درسگاہوں میں آکر علم کی پیاس بجھانے والے اپنے مستقبل کے لیے فکر مند غریب سفید پوش والدین کی اولاد ان نوجوانوں کو کس نے اس راہ پر ڈال دیا۔ کیا سیاسی جماعتیں اس کی ذمہ دار ہیں؟

جاؤ بلا لاؤ کسی خصم کو ہم اس سے بھی نمٹ لیں گے ۔

عورت نے تھوک نگلتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

میرا کوئی ہوتا تو ضرور لے آتی ۔

سلیم گھوڑے سے اُتر پڑا۔

میری طرف دیکھو بہن ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے ۔ میں تمہارا بھائی ہو
ان سے بات کروں گا۔

عورت اپنے آنسو پونچھنے لگی ۔

بھائی !

سلیم آگے بڑھ آیا۔

ہاں ۔ گھبراؤ نہیں ، بتاؤ کیا بات ہے ۔

عورت نے اپنے سر پر دوپٹہ درست کیا اور کہنا شروع کیا۔

میرا نام بلقیس ہے بھیا! میرا اس دُنیا میں سوائے اللہ کے کوئی
نہیں ۔ نہ ماں ، نہ باپ ، نہ بہن نہ بھائی ۔ ایک شوہر تھا وہ بھی میری بدقسمتی
تین سال ہوئے مر چکا ہے ۔

یہ زمین جس میں تم کھڑے ہو میری ہے ۔ یہ میں نے ان دونوں بھائ
کو آج سے دو سال قبل حصے پر جوتنے کو دی تھی ۔ اس دو سال کے عرصہ میں انھو
نے مجھے زمین کی آمدنی سے کچھ بھی نہیں دیا ۔ سب کچھ خود ہی کھا جاتے رہے ۔
میں نے ان کی بہت منت سماجت کی مگر انھوں نے میری کوئی بات
سُنی ۔ میں بھوکی مرتی رہی ۔ لوگوں کا کام کر کر کے گزارہ کرتی رہی مگر ان پر کچھ ا

ہوا ۔ اب میں نے انہیں کہا ہے کہ میری زمین چھوڑ دو میں کسی اور کو حصے پر
دیتی ہوں مگر یہ پھر بھی نہیں ٹلتے ۔ کئی دن سے منت کر رہی ہوں مگر انھوں
نے آج پھر زمین جوت لی ہے ۔ میں منع کرنے آئی تو میرے ساتھ جھگڑا شروع
کر دیا اور اُلٹا مجھے مارنا شروع کر دیا ۔

وہ بھاری پھر رو پڑی

سلیم ان میں سے ایک کے قریب آیا۔

تم کیوں اس کی زمین نہیں چھوڑتے اور تم نے اس بے کس پر ہاتھ
کیوں اُٹھایا ۔

اس نے مونچھیں پھڑ پھڑاتے ہوئے کہا۔

جاؤ جاؤ کھسکا کھاؤ یہاں سے ۔ آیا بڑا ہمدرد بن کر ۔

سلیم اور قریب آگیا۔

سیدھی طرح بات کرو۔

میں نے تمہارے جیسے بہت بدمعاش دیکھے ہیں ۔ ساری بدمعاشی
دہری کر کے جیب میں ڈال دوں گا ۔

تم زمین نہیں چھوڑو گے ۔

نہیں چھوڑیں گے ۔

جھگڑا کرنا چاہتے ہو۔

کرلو ۔ رُک تو گئے ہو۔

سلیم کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

فریقین کو انصاف ملنا چاہیئے۔ مسلمان کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ اسے سیاسی مصالحت کی بھینٹ چڑھادیا جائے۔ اس معاملے میں حکومت کی نرمی یا نرم پالیسی سے ممکن ہے سیاسی نتائج تو اچھے مرتب ہوجائیں لیکن سماجی طور پر یہ بڑا تباہ کن معاملہ ہے۔ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اب پانی سر سے گزرنے لگا ہے اور حکومت کو اس معاملے کو سیریس لینا ہوگا۔

طالب علم وہ ہے جو علم کی طلب کے لیے گھر سے نکلتا ہے۔ جس طالب علم کے پاس کلاشنکوف آجائے اور وہ اپنے ہم مکتبوں کے خون سے ہولی کھیلنے لگے اسے طالب علم کہنا علم کی توہین کے مترادف ہے۔ یہ نوجوان ہمارا مستقبل ہیں اور کوئی حکومت یا قوم اپنے مستقبل سے لاتعلق رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔

عورتیں مجرم کیوں بنتی ہیں

مطبوعہ: ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۸۹ء

پاکستان میں ایک نظریاتی اسلامی ملک ہونے کے ناطے خواتین کو معاشرے میں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے آج بھی اگر آپ کو عام بس میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کے مشاہدے میں آیا ہوگا کہ کسی خاتون کے احترام میں عموماً لوگ اٹھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنی سیٹ اس کے لیے خالی کردیتے ہیں۔ آپ کو اس قسم کی بے شمار مثالیں آج بھی معاشرے میں ملیں گی جو اس امر کا ثبوت ہے کہ ہمارے یہاں عورتوں کے لیے مرد کے دل میں احترام کا پیدائشی جذبہ موجود ہے۔

جب ایسے معاشرے میں یہ سننے کو ملتا ہے کہ فلاں جگہ پولیس نے یا کسی بااثر شخص نے کسی مظلوم اور بے گناہ عورت کے خلاف کوئی غلط حرکت کی ہے اس پر ہر ایک ہے تو جہاں اس خبر کا شدید ردعمل ہوتا ہے وہاں بنیادی سوال یہ بھی جنم لیتا ہے کہ ہمارے یہاں کیا واقعی عورت کی تذلیل ہوتی ہے۔ لیکن یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے آیئے آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھادیں۔

آج دنیا سمٹ کر ایک شہر کی صورت اختیار کرگئی ہے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب سے ایک معاشرے کا دوسرے معاشرے کی اچھائیوں اور برائیوں کا اثر قبول کرنا کچھ ایسی عجیب بات بھی نظر نہیں آتی۔ دنیا میں جرائم جس نکتہ عروج پر ہورہا ہے اور خصوصاً مغربی ممالک میں خواتین جرائم کی دنیا میں جس تیزی سے داخل ہورہی ہیں اس کا اثر کیا ہمارے معاشرے کی خواتین نے بھی قبول کیا ہے؟

ہمارے ہاں کس نوعیت کے جرائم میں خواتین ملوث ہوتی ہیں اور اس معاشرہ خصوصاً وہ حالات جن میں وہ سانس لے رہی ہوں کس حد تک عمل دخل رکھتے ہیں۔ اس صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے کرائمز برانچ کے ڈپٹی آئی جی چوہدری نثار احمد کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں خواتین کا کردار جرائم میں ثانوی ہوتا ہے۔ یعنی وہ عموماً کسی کی آلہ کار بن کر کسی کے انگیخت پر ہی کسی جرم میں ملوث ہوتی ہیں۔ میری زندگی میں شاید ایک ایسی عورت آئی ہے جس نے اپنے آشنا کی خاطر اپنے پانچ بچوں اور ان کے باپ کو قتل کیا اور یہ سارا منصوبہ اس نے اپنے ذہن سے تیار کیا تھا۔

یہ ۵ء کی بات ہے میں ان دنوں ملتان میں ایس ایس پی تھا۔ ملتان سے قریباً پچیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں سے ایک عجیب بات سننے میں آئی کہ وہاں جنات رانی نامی ایک عورت کے بچوں کو ایک ایک کرکے مار رہے ہیں۔ واقعات کچھ اس طرح ہوتے تھے کہ رانی کے مکان کے ایک خاص کمرے میں جن آتے تھے اور وہ اس کے کسی بچے کو مار ڈالتے تھے۔ جنات کا خوف ایسا تھا کہ عام آدمی تو کیا پولیس بھی ڈر کے مارے ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔ جنات نے پہلے اس کے خاوند کی جان لی پھر ایک ایک کرکے اس کے بچے مرتے گئے۔ جب جنوں نے اس کے پانچویں بچے کو بھی مار ڈالا تو میں نے کیس کی سنگینی کے پیش نظر براہ راست مداخلت کا فیصلہ کیا۔ میں خود اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ میری آمد پر نزدیک و دور کے دیہات سے بھی خاصے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ جن کس جگہ رہتے ہیں۔ دیہاتیوں نے ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ عین ممکن ہے کہ مسلسل بند رہنے کی وجہ سے یہاں سے زہریلی گیس کا اخراج ہو رہا ہو اور مقتولین اس کا شکار ہو گئے ہوں۔ میں نے کمرے کا دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ لوگوں پر جنات کی ایسی دہشت طاری تھی کہ خوف کی وجہ سے کوئی وہاں ٹھہرنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ بہرکیف دروازہ توڑا گیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا میں نے رانی کو گرفتار

کرنے کا حکم دیا۔

پندرہ منٹ کی تفتیش میں اس نے بتا دیا کہ وہ اپنے آشنا کی مدد سے اپنے خاوند اور تمام بچوں کو جنات کا ڈھونگ رچا کر ختم کر چکی ہے اس نے مجھے بتایا کہ اس کا آشنا اسے چوہے مارنے کی دوا لا کر دیتا تھا جس کو وہ پیس کر مقتولین کو پلا دیتی تھی۔ میں نے گاؤں والوں کے سامنے اسے سارے ڈرامے کو دہرانے کے لیے کہا۔ اس نے ڈھول بجانے والوں کو اکٹھا کیا اور وہ سارا منظر دہرایا گیا کہ یہ لوگ کس طرح یہ گھناؤنا کھیل رچا رہے تھے۔

آپ اندازہ کیجیے کہ اتنا خطرناک منصوبہ بھی براہ راست رانی نے نہیں بلکہ اس کے آشنا نے تیار کیا تھا۔

میرا تجربہ بتاتا ہے کہ عورت کا ذہن عموماً بغاوت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی معمولی سا واقعہ اس بغاوت کا سبب بن جاتا ہے۔ آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ایک عام گھریلو عورت اچانک فاحشہ بن جاتی ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔

یاد رکھیے کہ جتنی بہترین سکیم عورت تیار کر سکتی ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی قوت فیصلہ بے حد مضبوط بھی ہوتی ہے اور عورت جو قدم اٹھا سکتی ہے شاید کوئی مرد آسانی سے نہیں اٹھا سکتا۔ آپ مارگریٹ تھیچر کی مثال لیجیے۔ اس نے "فاک لینڈ" پر فوج کشی کا جو فیصلہ کیا تھا شاید کوئی مرد برطانوی وزیراعظم نہ کر پاتا۔ اس طرح مسز اندرا گاندھی کی مثال لیجیے اس نے جتنے اہم فیصلے کیے ہیں وہ شاید اور کوئی مرد بھارتی وزیراعظم نہیں کر سکتا تھا۔

عورت کی ایک کمزوری جسے خاص طور پر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ انتقام لینے پر آ جائے تو واقعی اندھی ہو جاتی ہے

انتقام لینے کی دھن میں وہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتی اور بہر صورت اپنی سی کر گزرتی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ پاکستان کے ایک بڑے شہر میں ایک بڑے گھرانے کی لڑکی نے اپنے منگیتر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا جب وہ

موجودگی میں ایک مجبور عورت پر ظلم ہوا۔

اسی لیے تو ہمارے ملک میں آئے دن چوریاں ہو رہی ہیں۔ بے جا ظلم ہو رہے ہیں۔ بے گناہ قتل ہو رہے ہیں۔ غریبوں پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں۔ انتظامیہ ہر جگہ تو موجود نہیں ہوتی نا۔ یہ صرف حکومت کا ہی کام نہیں کہ مظلوموں کی حفاظت کرے اور بے گناہوں کو ظالموں کے استبداد سے بچائے رکھے۔

یہ ہم لوگوں کا بھی کام ہے کہ ہم لوگ متحد ہوں۔

ایک آواز ہوں۔

ہم خیال ہوں۔

یک جان ہو کر ظالموں اور گناہ گاروں کے مقابلے میں چٹان بن کر کھڑے ہو جائیں تو کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ معاشرے میں غلط کام کرے اور پھر اس طریقے سے انتظامیہ کا کام بھی سہل ہو جاتا ہے اور وہ لوگوں کی حمایت اور اتحاد کے ساتھ اپنے کام کو پہلے سے کئی گنا بہتر انداز میں کر سکتی ہے۔

اور نمبردار جی آپ! آپ تو انتظامیہ کے ایک رکن ہیں۔ آپ لوگوں کو تو ایسے موقع پر مثالی کردار ادا کرنا چاہیے۔ اب دیکھیے نا آپ اس گاؤں کے نمبردار ہیں۔ لوگ آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔

نمبردار نے دکھ بھری سی آواز میں کہا۔

کہنا تمہارا تو ٹھیک ہے۔ پر کیا کریں۔ ہم لوگ بے بس ہوتے ہیں

کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر اس علاقے میں روز چوریاں ہو رہی ہیں۔ خود ہمارے گاؤں میں دو بار چوری ہو چکی ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بیس بیس پچیس پچیس گھوڑ سوار رائفلوں سے لیس ہو کر آتے ہیں اور سینکڑوں مال مویشی ہانک کر لے جاتے ہیں۔ اب ایسے موقع پر ایک نمبردار کیا کر سکتا ہے۔

قریب ہی کھڑے ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔

کیا کریں جی کتی چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

سلیم نے پریشانی سے پوچھا۔

کیا مطلب؟

مطلب یہی کہ علاقے کی انتظامیہ چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

یہ جھوٹ ہے اور اگر سچ بھی ہو تو آپ لوگ متحد ہو کر ان کے گٹھ جوڑ کو بڑی آسانی کے ساتھ ناکام بنا سکتے ہیں۔

وہ کیسے، طریقہ تم بتا جاؤ عمل اس پر ہم کر لیں گے۔

تو پھر تم لوگ ایسا کرو کہ گاؤں میں داخل ہونے کے جو جو راستے ہیں وہاں کے قریبی مکانوں کی چھتوں پر اینٹوں کے مورچے بنا لو اور ان میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر لگا دو اور ہر مورچے میں کم از کم دس آدمی بٹھا دو۔

اس طرح گاؤں میں چوکیدار کے گھومنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی مورچوں والے لوگ چوکس رہیں۔ اور جب وہ رائفلوں والے لٹیرے گاؤں

کیونکہ اس قماش کی مجرم عورتیں معصوم اور سیدھی سادھی عورتوں کو بلیک میل کر کے یا دھمکی کے ذریعے بھی اپنے ڈھب پر لے آتی ہیں۔

بچوں کے اغوا کی وارداتوں میں بھی عورتیں ملوث پائی گئی ہیں لیکن اس جرم پر ملوث عورتوں کو بھی ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خواتین کا کوئی ایسا مکمل گروہ موجود ہے جو براہ راست اس جرم میں ملوث ہو اور بچوں کو اغوا کر کے خود فروخت بھی کر دیتا ہو۔ مشاہدے میں یہی بات آتی ہے کہ عموماً بچوں کو اغوا کرنے والی خواتین اغوا شدہ بچے کو خاص مقام یا مخصوص گروہ کے ہاتھوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ انہیں مخصوص کمیشن دے دیا جاتا ہے۔

ہیروئن کی سمگلنگ میں ملوث پاکستانی خواتین کی تعداد بہت کم ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہرحال خواتین اس جرم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسی خواتین کو پاکستان میں کم اور غیر ممالک میں زیادہ گرفتار کیا جاتا ہے یا شاید پاکستان میں اس جرم میں گرفتار خواتین کے معاملات کو دبا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی پشت پناہی بڑے بڑے گروہ کر رہے ہوتے ہیں۔ شاید یہ واحد بین الاقوامی معیار کا جرم ہے جس میں پاکستانی خواتین ملوث ہوتی ہیں۔

پاکستان میں ہونے والے جرائم کا مجموعی جائزہ لینے کے بعد بہرحال یہ حوصلہ افزا بات ہے کہ پاکستانی عورتوں کا رجحان اس طرف بہت کم ہے اور زیادہ تر خواتین جو مختلف الزامات کے تحت گرفتار ہوتی ہیں انہیں یا تو دشمنی اور یا پھر غلط فہمی کی بنا پر گرفتار کیا جاتا ہے۔ عورتوں کے حقوق اور مسائل کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیموں خصوصاً عورت فاؤنڈیشن لیگل ایڈ کمیٹی وغیرہ کو اس معاملے کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ صرف عورت کو مظلوم کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اس مظلومیت کا پس منظر بھی ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

ہمارے یہاں خواتین کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے مختلف ایکشن فورم کام کر رہے ہیں لیکن ان کا مسئلہ بڑا عجیب ہے یہاں ہر بات پر جو کسی بھی خاتون سے

متعلق ہو صرف ایکشن لینا ہی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے معاشرتی اثرات کیا ہوں گے۔ اس کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ کوئی ایک خاتون جس کو پولیس کسی جرم میں ملوث جان کر گرفتار کرتی ہے (یہ الگ بحث ہے کہ اس کی گرفتاری صحیح ہے یا غلط) اور اس کے ساتھ ناروا سلوک کی شکایت ملتی ہے۔ خواتین کے متعلقہ انجمن اس خاتون تک رسائی حاصل کرتی ہیں اور اسے پولیس کی حراست سے چھڑا کر عوام کی عدالت میں لایا جاتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر معاشرے کی اپنی اقدار ہوتی ہیں۔ فرض کیجئے۔ جس عورت کی مدد کی جا رہی ہے وہ عام گھریلو عورت ہے اور پریس کے سامنے آنے سے اس کی گھریلو مشکلات میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس بات کی پرواہ نہیں کی جاتی اور مدد سے زیادہ تشہیر پر زور دیا جاتا ہے۔ پریس رپورٹرز کے سامنے مختلف سوالات کے ذریعے اس خاتون کی زبانی پولیس کے ناروا سلوک کی تفصیلات بیان کروائی جاتی ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ پولیس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے اور متعلقہ پولیس اہلکاروں کو جو اس میں ملوث رہے ہوں سخت سے سخت ترین سزا ملنا چاہیئے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک بے کس اور بے بس عورت جو پہلے ہی پولیس کے مظالم کا دکھ اٹھائے ہوئے ہے اسے تماشہ بنا دیا جائے۔

اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ متاثرہ خاتون کو قانونی امداد مہیا کی جائے اور قانونی طریق کار اپناتے ہوئے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

پاکستان میں عورتوں میں خصوصاً تعلیم کا نہ ہونا بھی ان کے مجرم ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ پاکستانی جیلوں اور حوالاتوں میں کئی ایسی خواتین موجود ہیں جنہیں اس بات کا بھی علم نہیں کہ اگر ان کے مرد انہیں طلاق دے دیں تو "عورت" کے مخصوص ایام گزرنے کے بعد ہی وہ دوبارہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ "عدت" کی شرط صرف بیوہ کے لیے ہی ہے حالانکہ "مطلقہ" کے لیے بھی یہ شرط ضروری ہے۔ جب کوئی مطلقہ خاتون اس قانون سے لاعلم ہونے کے سبب ایام عدت کے دوران

جی بیٹی!

ادھر ہی آجائیں نا ہمارے پاس۔

گلشن ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔

سلیم نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور ماں کی طرف بڑھائے۔

یہ رکھ لو ماں!

تم رکھو بیٹا! تمہارے کسی کام آئیں گے۔ اب تو زمین بھی حصے پر چڑھ گئی ہے۔ میرے اور کشور کے لیے بہت کچھ ہے۔ بھینسوں کے چارے کے لیے بھی محنت نہ کرنا پڑے گی۔

سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

زمین چڑھ گئی حصے پر۔

ہاں بیٹے! منشی امین نے چڑھا دی۔

چودھری حاکم نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔

اس بار تو نہیں بولا۔

کشور باہر نکلنے لگی۔

میں آپ کے لیے دودھ لے آؤں۔

گلشن نے اعتراض کیا۔

تم نواب کو بھی ساتھ لے آتے بیٹا!

وہ گاؤں سے باہر ہی کھڑا ہے ماں! میں نے بہت کہا۔ لیکن نہیں آیا۔ کہہ رہا تھا میں گاؤں سے باہر کھڑا ہو کر تمہاری چوکیداری

کروں گا۔

اچھا اس کے لیے جاتے ہوئے لے جانا۔

کشور اس کے لیے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں دودھ لے آئی۔ سلیم نے مکھن کھایا اور پھر دودھ پی لیا۔ کشور جب برتن لے جانے لگی تو سلیم نے کہا۔

نواب کے لیے اتنا ہی دودھ اور مکھن ڈھکن والے دو ڈبوں میں ڈال دو۔ میرے گھوڑے کی زین سے ایک تھیلہ بندھا ہوا ہے۔ اس میں ہی رکھ دینا۔

کشور برتن دھونے کے لیے صحن میں آئی تھی کہ بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی۔ برتن نلکے کے پاس رکھتے ہوئے کشور نے پوچھا۔

باہر سے آواز آئی۔

میں ہوں بیٹی حنیف۔

کشور نے دروازہ کھولا۔ ماسٹر حنیف تھے اور ان کے پیچھے منشی امین تھے۔ دونوں اندر آئے اور باری باری سلیم سے گلے ملنے لگے۔ حنیف نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

ہمارے لائق کوئی خدمت سلیم!

سلیم نے بڑے مشکورانہ سے انداز میں کہا۔

میرے لیے آپ جیسے مخلص اور ہمدرد انسانوں کی دعائیں کافی ہیں۔

ان دونوں میں سے ابھی کوئی جواب بھی دینے پایا تھا کہ باہر گلی

میں پھنس گئے۔ ان کے بیوی بچے بھی ہیں۔

ایک عورت جس نے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا ہے، انہیں تعلیم دلانی ہے اور بدقسمتی سے خاوند کے ناکارہ ہونے کے بعد معاشرے نے بھی جس سے منہ موڑ لیا اور اپنے گھر کا خرچ بھی اسی کو چلانا ہو تو ممکن ہے کہ اس پر حالات کی گرفت اتنی سخت ہو جائے کہ اسے مجبور ہو کر چوری کرنا پڑے یا خدانخواستہ مجبور ہو کر غلط پیشہ اختیار کرنا پڑے۔ اس عورت کو یوں تو مجرم ہی کہا جائے گا لیکن اس کے پس پردہ حقائق پر شاید بہت کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔

بدقسمتی سے ہماری معاشرتی اقدار کچھ ایسی قابل فخر نہیں رہ گئیں۔ خصوصاً ہمارے دیہاتوں میں جائیداد کے حصول کے لیے عورت کو نہ صرف مرد کی طرح قتل کر دیا جاتا ہے بلکہ ساری زندگی اس کو شادی کرنے کی اجازت بھی اس خوف سے نہیں دی جاتی کہ کہیں اس سے پیدا ہونے والی اولاد جائیداد میں اپنا حصہ نہ طلب کرے۔ ان حالات کا شکار عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔

واقعات کو دیکھنے کا، اندازہ لگانے کا اور فیصلہ کرنے کا ہمارا اپنا ایک انداز ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک شہناز قتل کیس سے پاکستان کے در و بام گونج رہے تھے لیکن شہناز بیگم کو ملک کی معزز عدالت نے بے گناہ جان کر بری کیا ہے اور آج وہ اتنی ہی معزز عورت ہے جتنی اس الزام سے پہلے تھی۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں حالات کا مکمل جائزہ لئے بغیر کوئی حتمی رائے دینا بھی غلط ہوگا۔

جب کراچی خون میں نہایا

کراچی آتش و آہن اور بے گناہوں کے خون میں ڈوب رہا ہے انسانی زندگی جتنی ارزاں آج کراچی میں ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال ایسی بگڑی ہے کہ اب سنبھالے نہیں سنبھلتی ہر طرف ایک طوفان بدتمیزی امڈ آیا ہے۔

پہلے کاروں اور بسوں کو جلایا جاتا تھا اب سواریوں کو موت کا ایندھن بنایا جا رہا ہے۔ بسوں کو روک کر اس میں موجود سواریوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کی خبریں اخبارات میں آ رہی ہیں کبھی پنجابی اور پٹھان مظلوم تھے اب مہاجر اور سندھی بھی مظلومیت کی تصویر بنے پھرتے ہیں جو جہاں ہے غیر محفوظ ہے۔ اپنے گھر سے نکل کر رزق کھودنے والے کے گھر والوں کے پاس اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ اب کبھی واپس بھی آئے گا یا نہیں۔

جانے کتنے بدنصیب ایسے ہوں گے کہ جو گھروں سے زندگی کمانے نکلے اور موت کا لبادہ اوڑھ کر واپس لوٹ آئے۔ ان کے لاشوں پر ان کے پیاروں نے ماتم کیا، اخبارات نے سرخیاں جمائیں، سیاستدانوں نے بیانات دیئے، مبصرین نے تبصرے کئے، حکام نے حسب روایت یقین دہانیوں کے دریا بہائے اور معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب لوگ قرآن پاک خدا اور رسول کا واسطہ دینے والوں پر گولیاں برسا رہے ہیں وہ کون ہیں؟ چونکہ یہ سیاسی قسم کا سوال ہے اور اس کا جواب ہر کوئی اپنے نقطہ نظر کے مطابق دے گا لیکن ایک بات سے سب اتفاق کریں گے کہ وہ مسلمان نہیں؟

اگر کبھی مسلمان تھے تو اب مرتد ہو چکے ہیں کیوں کہ قرآن خدا اور رسولؐ کو ماننے والا کتنا ہی بے غیرت اور ظالم ہو جائے اس کے دل میں کہیں نہ کہیں اچھائیاں اور سچائیاں زندہ رہتی ہیں اور اس کے لئے ان واسطوں پر شل ہو سکتے ہیں پھر یہ درندے کون ہیں جنہوں نے کراچی کو شہر نگاراں کو لہو لہان کر دیا ہے جنہوں نے انسانوں کی بستیوں کو وحشت نگر بنا ڈالا ہے۔ ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی درندگی پھیلانے والے اپنوں میں سے نہیں ہو سکتے یہ الگ بات ہے کہ وہ بیگانے اپنوں کا بھیس دھار کر ہم میں آملے ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کی بجا آوری کے لیے کبھی مہاجر کبھی سندھی، کبھی پنجابی اور کبھی پٹھان اور بلوچ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔

کراچی شہر میں جب اس درندگی کی ابتداء ہوئی تو ہنگامہ آرائی عموماً ٹریفک حادثات پر ہوا کرتی تھی جب کسی لاپرواہ ڈرائیور کی غلطی سے کسی بے گناہ کی جان چلی جاتی تو لوگ طیش میں آکر اس بس کار یا ویگن کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے اور اس نوعیت کی ہنگامہ آرائی عموماً کچھ علاقوں تک ہی محدود رہتی تھی۔

ذرا اندازہ فرمائیے کہ کس انداز سے اس تخریب کاری نے رواج پایا ہے اسکے بعد معمولی توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہوا اور لسانیت اور علاقائیت کے حوالے سے ہونے والے جھگڑوں نے رواج پایا۔ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جس کی بس ویگن یا ٹیکسی جلی اس کی قومیت کیا ہے لوگ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزیوں اور بعض عاقبت نااندیش ٹرانسپورٹروں کی کارروائیوں سے اتنے تنگ آچکے تھے کہ احتجاج کے لیے انتہائی اقدام پر مجبور رہتے تھے لیکن اس دور میں ہی اندازہ کیا جا رہا تھا کہ تخریب پسند ان ناراض لوگوں میں داخل ہو چکے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔

تخریب کاروں کو کراچی جیسی زرخیز زمین اپنی مذموم سرگرمیوں کے لیے اور کہاں میسر آسکتی تھی جہاں ہر دسویں میل پر زبان اور صوبے کے نام پر ایک نئی جماعت کا بورڈ لٹکتا نظر آجاتا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق لسانیت کے حوالے سے جتنے گروپ سیاسی لحاظ سے کراچی کے مختلف اداروں میں سرگرم عمل رہے ہیں اتنے شاید سارے

پاکستان میں بھی نہ رہے ہوں۔

پاکستان کی کون سی ایسی یونیورسٹی ہے جہاں تمام صوبوں کے نوجوان تعلیم حاصل کرنے نہیں آتے۔ کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں جہاں سرائیکی پنجابی بلوچ پختون مہاجر اور سندھی کے نام پر طلباء نے اپنی الگ الگ تنظیمیں بنا رکھی ہوں لیکن کراچی میں ایسا ہوا۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت نے اس رجحان کی کھل کر حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ اس کے بجائے ہر سیاسی جماعت کی کوشش یہی رہی ہے اسے کسی نہ کسی پریشر گروپ کی ہمدردی ضرور حاصل ہو جائے اور اس کے حصول کے لیے ہر غیر سیاسی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا بجائے اس کے کہ اصلاح احوال کی صورت پیدا کی جاتی ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے آج بھی جب کہ کراچی خون میں نہا چکا ہے کوئی بھی جماعت اپنی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں کیطرف سے ایک دوسرے پر الزامات کا سلسلہ جوں کا توں جاری ہے۔

آل پارٹیز کانفرنس جو آج بلائی گئی ہے اس کی ضرورت آج سے پہلے کیوں محسوس نہ کی گئی؟ کیا ہم ہمیشہ پانی کے سر سے گزر جانے کے بعد اس کے سامنے بند باندھنے کی فکر کیا کریں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایسی کانفرنسیں طوفان کی آمد کا اندازہ کرتے ہی بلا لیا کریں اس طرح ایک تو ہر ایک کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جایا کرے اور دوسرے ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے آگاہی ہو جایا کرے۔ خدا کرے آل پارٹیز کانفرنس جس مقصد کے لیے بلائی گئی تھی اس میں کامیابی مل جائے لیکن بظاہر ایسے آثار نظر نہیں آتے کیوں کہ کراچی کی ایک بڑی جماعت نے اس میں شرکت نہیں کی اور ایک فریق کی اس صورتحال میں جسے بہر حال ایک اہم فریق کی حیثیت حاصل ہے کانفرنس میں شرکت نہ کرنا اس کے مقاصد کی کامیابی کو مشکوک بناتا ہے اور عملاً بھی دکھائی دیتا ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس ناکام رہی ہے۔

یہاں ایک اور اہم بات جس کی طرف حکومت کی بار بار توجہ مختلف حلقوں کیطرف سے دلائی جاتی رہی ہے کہ آخر کراچی میں موجود انٹیلی جنس ایجنسیوں کا مصرف کیا ہے۔

آئے روز پراسرار کار سواروں کی طرف سے فائرنگ کی خبریں مل رہی ہیں۔ یہ لوگ بڑی دیدہ دلیری سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اپنے گھناؤنے مقاصد پورے کرنے کے بعد پھر بڑی آسانی سے فرار بھی ہو جاتے ہیں کراچی شہر کے تقریباً ہر چوک میں سیکورٹی فورسز نے مورچہ بندیاں کر رکھی ہیں۔ انٹیلی جنس کے لوگ بھی یہاں موجود ہیں اور مقامی پولیس بھی لیکن مقام حیرت ہے کہ آج تک انتظامیہ نے کسی ایسی کار کو گرفت میں نہیں لیا جبکہ ان واقعات کا سلسلہ جاری ہے کبھی کبھی عوام کی اشک شوئی کے لیے یہ ضرور کہہ دیا جاتا ہے کہ پولیس نے ایسی فلاں کار کا سراغ لگا لیا ہے لیکن بعد میں علم ہوتا ہے کہ یہ سراغ بیانات کی حد تک ہی لگایا گیا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں؟ آج تک ایسے دعوے تو سرکار کی طرف سے سنے گئے ہیں کہ کار سوار گرفتار ہو گئے لیکن وہ کہاں گئے؟ کون تھے؟ ان پر مقدمہ چلایا گیا؟ سزا کہاں اور کب ہوئی۔

جب ایسی کسی بات کا جواب نہ مل رہا ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ یہ عوام کو مطمئن کرنے والی بات ہے ممکن ہے سرکاری طور پر یہ عذر پیش کیا جائے کہ فی الوقت ناموں کا افشا ممکن نہیں لیکن اسی "فی الوقت" کا وقفہ کتنا طویل ہے۔ بعض ملزمان جن کی گرفتاری کا وعدہ آج سے ایک دو سال پہلے کیا گیا تھا کم از کم ان کے ناموں کا اعلان کر دینے یا واقعات کی اصلیت سے آگاہ کر دینے میں تو کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر اس طرح کی غلط بیانی سے حکومت کس کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔ گزشتہ تین چار سال کے دوران ملک کے ممتاز اخبارات میں سینکڑوں انٹرویو اور خبریں مستند لیڈروں کی ایسی ملیں گی۔ ان میں برسر اقتدار اور اپوزیشن دونوں کے لوگ شامل ہیں کہ سندھ میں مداخلت کار بھارت کی طرف سے داخل کئے جا رہے ہیں یا سندھ میں "را" تخریب کاری کروا رہی ہے۔ سندھ کے سرحدی اضلاع میں بھارتی کرنسی کی کھلے عام گردش، سرحدوں کے دونوں اطراف آباد ہندو دیہاتیوں کا ادھر ادھر عام آنا جانا۔ سندھ کے سکولوں میں ہندو اساتذہ کی خلاف پاکستان سرگرمیاں۔ سکولوں میں بھارت ازم

اور ہندو ازم کا پرچار وغیرہ وغیرہ ان بیانات اور انٹرویو دینے والوں میں ہر طرح کے سیاسی لیڈر شامل ہیں۔ مذہبی سماجی غرض ہر طبقہ زندگی کے لوگوں کی طرف سے ان باتوں کی تکرار جاری ہے پھر حکومت آخر کیا چاہتی ہے۔

اگر ملک کے وزیر اعظم سے عام شہری تک اس بات پر متفق ہیں کہ بھارتی حکومت نے کشمیر کی جدوجہد آزادی کو سبوتاژ کرنے اور پاکستان پر اپنا دباؤ بڑھا کر اسے بلیک میل کرنے کے لیے سندھ میں تخریب کاری کروائی ہے تو ظاہر ہے ان خبروں کا ذریعہ معمولی نہیں ہوگا۔ پاکستان میں امریکہ سے زیادہ سیکورٹی ایجنسیاں موجود ہیں یہ خبریں بھی ان کے ذریعے ہی ارباب اقتدار تک پہنچتی ہوں گی لیکن آج تک ایسی کوئی خبر نہیں آئی کہ ہمارے ہونہار انٹیلی جنس افسران نے کسی بھارتی تخریب کار گروہ کو گرفتار بھی کر لیا ہے یا بھارتی کرنسی کا کھلے عام کاروبار کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے جس شدت سے سندھ کی موجودہ گڑبڑ میں بھارت کے ملوث ہونے کے دعوے کئے جا رہے ہیں اور بھارتی حکمرانوں نے جو زبان اختیار کر رکھی ہے اس کے بعد اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ اس شورش میں بھارت کا ہاتھ نہیں ہے البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ پھر سیکورٹی فورسز کی اس فوج ظفر موج کا مصرف کیا ہے؟ جب سیاسی زعما کی طرف سے ایسے بیانات پڑھنے کو ملتے ہیں تو ہر پاکستانی اپنے زخموں پر نمک گرتا محسوس کرتا ہے وہ یہ سوچ کر لرز جاتا ہے کہ جب حکومت کو واقعات کا علم ہے اور وہ صاحب اختیار بھی ہے تو آخر قباحت کیا ہے؟ اس کے باوجود آئے روز ان واقعات میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے

حیدرآباد میں قیامت کے ۷۲ گھنٹے

مئی ۱۹۹۰ء

۲۶ مئی کو حیدرآباد میں پولیس اور ایگل سکواڈ پولیس فورس نے اندھا دھند فائرنگ اور لوٹ مار کی اور ۷۲ گھنٹے تک شہریوں کو محصور کرکے پانی اور بجلی کی لائنیں کاٹ دیں۔ اس سفاکانہ کارروائی کے دو دنوں میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۱۰۰ افراد ہلاک اور ۲۵۰ سے زائد افراد زخمی ہوگئے ہیں۔ ہلاک ہونے والے ۱۰۰ افراد میں سے تقریباً ۵۰ افراد کی تو تصدیق ہو رہی ہے۔ لیکن بقیہ لاشوں کے بارے میں غیر مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ انہیں رات کی تاریکی میں دفن کر دیا گیا جبکہ حکومت نے یا انتظامیہ نے اب تک کوئی تردید جاری نہیں کی۔

حیدرآباد میں ۲۴ مئی سے کرفیو نافذ تھا اور ۲۱ مئی کو دن کے ۳ بجے لطیف آباد کے علاقوں میں بھی ناگزیر صورتحال کی بنا پر کرفیو نافذ کیا گیا۔ شہر میں اتنی کشیدگی پائی جا رہی تھی کہ مسلسل ۴۸ گھنٹے تک کرفیو میں وقفہ بھی نہیں دیا گیا۔ جس کی وجہ سے شہری کھانے پینے کی اشیاء نہ ملنے کے سبب فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے اور صورتحال اس حد تک پہنچ گئی کہ لوگ گھروں میں آٹا ختم ہونے کے سبب فلور ملوں اور چکیوں کے تالے توڑ کر آٹے کی بوریاں اٹھا کر لے گئے۔ بعض مقامات پر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ کرفیو کے دوران یہ کارروائی کرنے پر مجبور ہو گئے حیدرآباد کے ایک علاقہ میں جب ایک چکی کا تالا توڑ کر بعض افراد آٹے کی دو بوریاں لے کر جا رہے تھے۔

تو رینجرز کے ایک افسر نے انہیں پکڑ لیا جس پر انہوں نے کہا کہ ہمارے بچے

بھوک کے مارے رو رہے ہیں۔ اس لیے ہم تالا توڑ کر چکی میں سے دو بوری لے کر جا رہے ہیں۔ لیکن یہ آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس آٹے کی رقم ہم چکی والے کو ادا کر دیں گے جس پر کہا جاتا ہے کہ وہ افسر انسانیت کے ناطے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اس وقت اپنے اعلیٰ افسران اور مقامی انتظامیہ سے ملا اور ان کو مجبور کیا کہ فوری طور پر وقفہ دیا جائے۔ ورنہ حالات مزید بگڑ جائیں گے جس کے نتیجہ میں ایک گھنٹے کے بعد اچانک ریڈیو پر اعلان کر کے کرفیو میں ایک گھنٹے کا ہنگامی وقفہ دیا گیا۔

۲۲ مئی کو اطلاع ملی کہ سندھی جو کہ گاڑی کھاتہ، ریشم بازار، متصلہ فقیر کا پڑ اور چھوٹی گھٹی کے علاقوں میں رہائش پذیر ہیں کرفیو کے دوران پولیس کی گاڑیوں میں محفوظ مقامات پر منتقل ہو رہے ہیں۔ یہ صورتحال ۲۵ مئی تک جاری رہی اور سندھی اور مہاجر خوف کے مارے محفوظ مقامات پر منتقل ہوتے رہے۔ البتہ لطیف آباد میں بعض علاقے ایسے ہیں۔ جہاں سندھی خاندان اپنے آپ کو مہاجروں کے درمیان زیادہ محفوظ تصور کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک لطیف آباد کے ان علاقوں میں مہاجروں کے ساتھ رہ رہے ہیں جہاں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ جبکہ ایک واقعہ لطیف آباد میں سامنے آیا ہے جہاں ایک بنگلے کو لوٹا گیا اور آگ لگائی گئی ہے جبکہ دیگر سندھی خاندانوں کو مہاجروں نے تحفظ دیا ہوا ہے۔ ایسے واقعات بھی موجود ہیں کہ لطیف آباد سے بعض سندھی خاندان نقل مکانی کر کے قاسم آباد چلے گئے تھے۔ بعد میں وہاں کی صورتحال بہتر ہونے پر واپس لطیف آباد آگئے۔ جہاں انہوں نے اپنے آپ کو محفوظ تصور کیا۔

۲۶ مئی کو قلعہ، گاڑی کھاتہ، ریشم گلی، شاہی بازار اور چھوٹی گھٹی پر دن کے بارہ بجے اچانک پولیس اور ایگل سکواڈ فورس جو کہ چار روز قبل کراچی سے منگوائی گئی تھی۔ دو ہزار افراد پر مشتمل پولیس اور ایگل فورس نے ان علاقوں کا چاروں طرف سے محاصرہ کر کے گلی کوچوں اور متصلہ گراؤنڈ جہاں پر ۲۰ ہزار سے زائد نچلے طبقے کے افراد رہائش پذیر ہیں۔ اچانک فائرنگ شروع کر دی جس سے گلیوں اور بازاروں میں بیٹھے ہوئے افراد اور چھوٹے چھوٹے بچے جو کہ گلیوں میں کرکٹ اور کیرم وغیرہ کھیل رہے تھے اس اچانک صورتحال سے پریشان

سلیم غصّے میں برس پڑا۔

کیوں کیا تھا۔

اس نے پھر چودھری کو ٹوکے سے ٹھوکر لگائی۔

اِدھر میری طرف دیکھو۔

چودھری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مَیں ہوں وہ سُرخ طوفان جس کی میرے باپو نے تمہیں دھمکی دی تھی۔

تم میرا بل روکتے رہے۔

مَیں چپ رہا۔

تمہارے آدمی مجھے مارتے رہے۔ حالانکہ وہ میرا ایک ایک ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے مگر مَیں نے شرافت سے کام لیا۔

تم نے میرا بھائی قتل کر دیا۔ میرا بازو کاٹ دیا۔ مَیں پھر بھی امن پسند رہا۔

تم نے میرے دوسرے تین بھائیوں کو معاشرے کا مجرم اور قاتل بننے پر مجبور کیا۔ مَیں پھر بھی صبر شکر کیے رہا اور شہر جا کر ایک پُر امن شہری کی مانند نوکری کرتا رہا۔

مگر تمہارا اطمینان نہ ہوا۔

تمہارا جی نہ بھرا۔

بھیڑیے! تمہاری خون کے چاٹ کی عادت نہ گئی۔

تم نے اپنی شرپسند عادت نہ بدلی۔

چودھری حاکم اس کے پاؤں پر گر گیا۔

مجھے معاف کر دو سلیم! مَیں تمہارا مجرم ہوں۔ تمہارا گناہ گار ہوں۔

مَیں نے تمہارے بھائی کو قتل کرایا۔

مَیں نے تمہارے باپو کو قتل کرایا۔

مَیں نے تمہارے بھائیوں کو بغاوت پر مجبور کیا۔

مَیں تمہارا گھر اُجاڑنے کا ذمہ دار ہوں۔

مَیں اندھا ہو گیا تھا سلیم! دولت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اس نے اپنا سَر سلیم کے پاؤں پر رکھ دیا۔

مجھے معاف کر دو سلیم! آئندہ کوئی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

سلیم نے اسے گردن سے پکڑ کر اُٹھایا اور ایک زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ چودھری حاکم بُری طرح سامنے والے درخت سے ٹکرا گیا۔ سلیم نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

تمہیں معاف کر دوں۔

اپنے باپو اور بھائیوں کے قاتل کو چھوڑ دوں۔

تم ——— تم انسانیت کے دشمن ہو۔

شرافت پر گندہ داغ ہو۔

پُر امن شہری زندگی کے لیے ایک عذاب ہو۔

عذاب

اور وہ بھی شیطانی عذاب۔

ہلاک ہو گیا جو کہ ہماری گاڑی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا. جبکہ ہمارا ڈرائیور شدید زخمی ہوا ہے. جس کو ہسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔

صوبائی سیکرٹری اطلاعات حکومت سندھ نبی بخش کھوسو کراچی سے ۲۷ مئی کو صحافیوں کی ایک پارٹی لے کر حیدرآباد آئے تھے ان صحافیوں کو صرف لیاقت میڈیکل ہسپتال سٹی برانچ پر لے جایا گیا جہاں صرف ایک پولیس کانسٹیبل کی لاش لائی گئی تھی لیکن انہیں اصرار کے باوجود بھٹائی ہسپتال نہیں لے جایا گیا جہاں ۵۰ سے زیادہ لاشیں اور ۲۵ سو کے قریب زخمی لائے گئے تھے۔ ۲۹ مئی کو وزیراعظم کے پریس سیکرٹری اور وفاقی سیکرٹری اطلاعات جناب شاہ جہان کریم صاحب بھی فوج کے ایک خصوصی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ حیدرآباد تشریف لائے تھے ان کے ہمراہ ائی ایس پی آر کے آفیسر اطلاعات میجر صولت رضا بھی تھے دن کے ۲ بجے کراچی کے صحافیوں کو ٹیلی ویژن کی ٹیم کے ہمراہ بھٹائی ہسپتال لطیف آباد لے جایا گیا. صحافیوں کی ٹیم کے ساتھ جناب شاہ جہان کریم اور صوبائی سیکرٹری اطلاعات سندھ نبی بخش کھوسو بھی موجود تھے. جب یہ ٹیم بھٹائی ہسپتال پہنچی تو ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا. ہسپتال میں موجود افراد ٹیلی ویژن کے کیمرہ مینوں کو دیکھ کر مشتعل ہو گئے. انہوں نے کہا کہ قیامت دو روز سے مچی ہوئی ہے. تم لوگ آج آئے ہو جب تمام لاشیں جا چکی ہیں چلے جاؤ یہاں سے۔ اس اثنا میں بعض افراد نے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا. جس کے نتیجہ میں ٹی وی والے اور صحافی مشکل سے نکل کر سرکٹ ہاؤس پہنچے وہاں سے انہیں ایک مقامی ہوٹل لے جایا گیا. جہاں کراچی کے صحافیوں کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام تھا. ظہرانے میں حیدرآباد کے صحافیوں کو بھی بلایا گیا تھا. حیدرآباد کے صحافی ہوٹل میں آ تو گئے لیکن انہوں نے بے گناہ افراد کی ہلاکت کے سوگ میں کھانا نہیں کھایا ظہرانہ کے دوران سیکرٹری اطلاعات شاہ جہان کریم اور نبی بخش کھوسو سے صورتحال پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ وفاقی وزیر اطلاعات جناب شاہ جہان کریم نے وعدہ کیا کہ وہ ساری صورتحال سے وزیراعظم کو بھی آگاہ کریں گے. واقعی یہ بڑا سنگین واقعہ ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

روس کا مستقبل؟

مطبوعہ: ۱۶ راگست ۱۹۹۰ء

سوویت یونین میں پندرہ آئینی جمہوریت شامل ہیں جہاں سو سے زیادہ لسانی گروہ آباد ہیں. دنیا کی آخری استعماری طاقت ہے جو روئے زمین پر باقی رہ گئی ہے. سوال یہ ہے کہ یہ کتنی دیر تک باہم متحد رہ سکتی ہے؟ لاس اینجلز ٹائم نے چند ماہرین سے جو روسی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں یہ سوال کیا کہ وہ اپنی مدبرانہ رائے کا اظہار کریں کہ روسی استعمار ۵ سال میں ختم ہو جائے گا یا اسے منتشر ہونے میں دس برس لگیں گے.

الیکس الیکسروسنیئر تجزیہ نگار برائے روسی معاملات انیڈ کراپ کہتا ہے آخری یورپین ایمپائر کے اختتام کے بارے میں جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی ایمپائر سے فوائد کا حصول ممکن نہ رہے تو پھر اسے ختم ہو جانا چاہیے اور یہ تاریخ کا فیصلہ ہے جبکہ روسیوں نے دوسری شہنشاہیت سے بہت زیادہ اقتصادی اور معاشی نقصانات برداشت کئے ہیں اور تہذیبی طور پر انہیں اور زیادہ نقصانات سے سابقہ پڑا ہے بہت سے روسی اب یہ سوچنے لگے ہیں کہ وہ دوسری قومیتوں سے علیحدہ ہو کر زیادہ فائدہ میں رہیں گے اور یہ کہ وہ اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے جب تک وہ دوسروں کی آزادی کی مخالفت کرتے رہیں گے۔ اس صدی کے اختتام تک روس جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں اپنی موجودہ صورت میں باقی نہیں رہے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا. ہو سکتا ہے یہاں پر ایک کنفیڈریشن وجود میں آجائے اور اس میں روس کے کچھ حصے مثلاً سوویت ری پبلک بائلو رشا اور یوکرائن شامل ہو جائیں گی۔ مگر حقیقت کچھ یوں ہے کہ موجودہ

نواب نے رسّی سے اس کے ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے ۔ اس کی آنکھوں پر اپنی چادر باندھ دی اور دونوں گھوڑے سرپٹ دوڑاتا ہوا وہ بستی میں آیا ۔ رشید اور اعظم کی مدد سے اس نے انسپکٹر کو تہ خانے میں اُتارا ۔

شام تک وہ بھی تہ خانے میں ہی رہا ۔ پھر رشید اور اعظم کو انسپکٹر کی نگرانی پر چھوڑ کر وہ باہر نکلا ۔ بستی میں آکر اپنا گھوڑا لیا اور عشاء کے بعد وہ بڑی احتیاط سے کام لیتا ہوا سلیم کے گاؤں سگر آیا اور اس کی حویلی کے دروازے پر دستک دی ۔

کافی دیر بعد گلشن نے دروازہ کھولا اور اندھیرے میں اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے نواب سے پوچھا ۔

کون ہے ؟ !

اس کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ روتی رہی ہے ۔

میں نواب ہوں ماں جی !

گلشن ایک طرف ہٹ گئی ۔

اندر آجاؤ بیٹے ! تمہارا اس طرح باہر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ۔

نواب اندر آگیا ۔ اس نے دیکھا برآمدے میں کشور بیٹھی سسک کر رو رہی تھی ۔ مکان میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا ۔ کوئی دیا بتی وغیرہ نہ جلائی گئی تھی ۔

نواب نے منت کے انداز میں گلشن سے کہا ۔

ماں ! خدا کے لیے بھابی سے کہو چُپ ہو جائے ۔

گلشن نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا

بہت کہا ہے بیٹے ! مگر نہیں سنبھلتی وہ ۔ اس گھر میں تو اب ہمیشہ کے لیے ہی تاریکی ہو گئی ہے سلیم کو پولیس نے کیا پکڑا ہم دونوں تو جیتے جی ہی مر گئی ہیں ۔ تم کھڑے کیوں ہو بیٹا ! بیٹھ جاؤ نا چارپائی پر ۔

نہیں ——— میں بیٹھنے نہیں آیا ۔ میں اب لوگوں کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں سلیم کو ضرور واپس لاؤں گا ۔

گلشن نے مایوسی سے کہا ۔

کیسے لاؤ گے بیٹا !

نواب خلاؤں میں کھو گیا ۔

ضرور لاؤں گا ماں ! اس کی خاطر خواہ مجھے عدالت میں کیوں نہ کودنا پڑا میں کود جاؤں گا ۔ اس کی سلامتی اور رہائی کے لیے میں ہر کام کر گزروں گا ۔

نواب جذباتی ہو گیا ۔

اس کے بغیر نواب نامکمل ہے ۔

اس کے بغیر میرا جینا ادھورا ہے ۔

وہ میرا بازو ہے اور میں اپنے بازو کو کٹنے نہ دوں گا ۔ میں اُسے لاؤں گا اور ضرور لاؤں گا ورنہ خود بھی ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا ۔ نواب باہر نکلنے لگا ۔ میں اس لیے آیا تھا کہ آپ لوگ حوصلہ رکھیں ۔ میرا دل کہتا

یہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہیں گی جبکہ دوسرے رہنماؤں کا خیال ہے کہ روس کی موجودہ شہنشاہیت قائم رہنی چاہیئے۔

روس کے ان دونوں طبقات میں مضبوط قیادت موجود ہے، ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو روس میں شہنشاہیت کا احیا چاہتا ہے اور قدیم چرچ کی بالادستی کا خواہاں مگر اس طبقے کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اور نہ یہ طبقہ متفق و متحد ہے۔ اگر روس میں ایک مرکزی روسی جمہوریت کا قیام عمل میں آجاتا ہے تو روس کے لیے یہ بہتر ہوگا۔ اور اس سے روس میں استحکام پیدا ہوگا۔ اگر روس میں یہ مرکزی جمہوری حکومت قائم ہو جائے تو یہ روس میں قائم دوسری جمہوریتوں سے بہتر تعلقات استوار کر سکے گی اور یہ صورت اقتصادی اعتبار سے بھی بہتر ہوگی سائبیریا میں تیل کے ذخائر وسیع پیمانہ پر موجود ہیں مگر ان تک رسائی ایک دشوار مرحلہ ہے۔

آرچی براؤن سیاسی استاد۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کہتے ہیں کہ سوویت یونین ایک ایسی ریاست بن چکی ہے جس کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرنا دشوار ہے۔ گوربا چوف کا خیال ہے کہ ایک نئے انداز کے وفاق میں روس کی ساری جمہوریتوں کو متحد رکھا جا سکے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان جمہوریتوں میں سے بعض ضرور علیحدہ ہو جائیں گی اور یہ کہنا سخت دشوار ہے کہ روس میں کس قدر استحکام رہے گا۔ اس کا زیادہ تر دارومدار اس پر ہے کہ موجودہ روس میں اقتصادی نظام کیا شکل اختیار کرتا ہے اگرچہ روس معدنیات کے اعتبار سے ایک بہت مالا مال ملک ہے اگر روس اقتصادی میدان میں اقدامات کرے اور اپنی معیشت کو استوار کرنے کی کوشش کرے تو روس ایک خوشحال ملک بن سکتا ہے اگرچہ چند برسوں میں خوش حالی اور فارغ البالی ممکن نہیں۔

گوربا چوف کا مسئلہ یہی ہے کہ مشکلات اور مسائل بے انتہا ہیں اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ تمام مسائل کو حل کر سکے روس میں ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ موجود جمہوریتوں کا ایک کنفیڈریشن بنا دیا جائے جن میں بالٹک کی ریاستیں شامل نہ ہوں۔ اگرچہ بالٹک کی ریاستوں کے ساتھ قریبی

اقتصادی تعلقات قائم رکھے جائیں اس طرح ممکن ہے کہ موجودہ سوویت یونین کا وجود باقی رہ جائے بشرطیکہ اس وفاق میں شامل تمام جمہوریتوں کو پورے طور پر اقتصادی آزادی حاصل ہو۔ میرے خیال میں آزاد خود مختار حکومتوں کی جگہ ایک کنفیڈریشن زیادہ مناسب رہے گا۔ یوں روسی جمہوریت بھی باقی رہ جائے گی بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو مرکزی حیثیت نہ دے اور دوسری جمہوریتوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح ایک نیا کنفیڈریشن ممکن ہے۔ بہتر اقتصادی حالات پیدا کرنے کا سبب بنے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بہت سی جمہوریتوں میں عوامی، قومی اور سیاسی امیدیں کنفیڈریشن جیسی سکیم سے بہت بلند ہیں اور ان کو ہموار کرنے کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت کی ضرورت ہے۔

مارک کارسنز ریسرچ فیلو براؤن یونیورسٹی سینٹ فارن پالیسی ڈویلپمنٹ سینٹر ہارورڈ یونیورسٹی تحقیقاتی مرکز کا خیال ہے کہ سوویت یونین چھوٹا ہو جائے گا مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس وقت روس کے زیر اہتمام تمام جمہوریتوں کو اپنے قبضے میں رکھ سکے گا؟ کیا یوکرائن اس کی بالادستی قبول کرے گا؟ اگر بالٹک بارجیا۔ آذر بائی جان۔ مالدیغیا وغیرہ روس سے علیحدہ ہو جاتی ہیں تو پھر دوسری جمہوریتیں بھی یہی راہ اپنائیں گی۔ ان کی آبادیاں ان کی معدنی دولت ان کی زراعت ان کی صنعتیں روس سے بہت زیادہ ہوں گی اور روس پس منظر میں چلا جائے گا۔ نیز یوکرائن کے بغیر ایک آزاد روس کا تصور بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں یہ کوشش کی جائے کہ ایک بہت ڈھیلا ڈھالا فیڈریشن بنایا جائے جیسا کہ برطانوی نظام میں ہے۔ مگر وہ آزاد ریاستیں نہ ہوں یہ نظام ممکن ہے بعض جمہوریتوں کو قابل قبول ہو کہ اس طرح انہیں مرکز سے اقتصادی امداد ملنے کی امید ہو مگر میرا خیال ہے کہ بہت سی جمہوریتیں اس تصور کو سرے سے رد کر دیں گی۔ اور روس کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ ان جمہوریتوں کو فوجی طاقت سے اپنے قبضے میں رکھ سکے یا نئے قوانین بنا کر انہیں علیحدہ ہونے سے روک سکے۔

سلیم نے رائفل وہیں پھینک دی اور دونوں بھاگتے ہوئے
مسجد کے قریب سے گزرے اور گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد
اسے کھیتوں میں سے اندھا دھند ایک طرف پوری رفتار سے
بھگانا شروع کر دیا تھا۔

سپاہیوں نے شور کرنا شروع کر دیا تھا۔

قیدی بھاگ گئے۔ پکڑو پکڑو ــــــ

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں قیدی کھیتوں کی آڑ میں کافی
دُور نکل گئے تھے۔

نواب بچتا بچاتا مسجد سے نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے گلی
میں گھسا۔ وہاں سے نکل کر وہ کھیت میں داخل ہوا اور پھر ہسپتال
کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آیا۔ ایک
درخت کے نیچے کھڑے ہو کر تھوڑی دیر انتظار کیا۔ پھر بس آتی
دکھائی دی۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے بس رکوائی اور اس
میں بیٹھ گیا۔

دوسری طرف سلیم اور دوسرا قیدی دریا کے کنارے والے
جنگل میں جا ٹھہرے۔ دونوں گھوڑے سے نیچے اُترے۔ دوسرے
قیدی نے سلیم سے پوچھا۔

اب اس ہتھکڑی کو کاٹنے کا کیا بندوبست کریں۔ دن کے
وقت ہم کسی لوہار کے پاس بھی نہیں جا سکتے۔

سلیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

یہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تم جاؤ گے کہاں ؟

دوسرے قیدی نے اپنی کلائی پر ہتھکڑی درست کی۔

میں تو مچھرالہ جاؤں گا۔

سلیم نے حیرت اور پریشانی سے پوچھا۔

مچھرالہ۔

ہاں مچھرالہ۔ کیوں کیا بات ہے۔

تمہارا نام کیا ہے ؟

نام تو میرا شفیع ہے۔

شفیع ؟

ہاں ــــــ

سگر کے چودھری حاکم کے داماد ہو تم۔

ہاں ــــــ پر تم اتنی گہرائی میں کیوں جا رہے ہو۔ تم کہاں جاؤ گے

میں تو کہیں بھی نہ جاؤں گا۔

پھر بھی کہیں تو تمہیں جانا ہی ہو گا نا۔

یہیں جنگل میں میرا مسکن ہے اور یہیں مجھے رہنا ہے۔

تمہارا نام ؟

میرا نام سلیم ہے۔

شفیع نے پریشانی سے پوچھا۔

دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

سلیم پھر بولا۔

پورا زور لگا لینا شفیع! میں کھینچنے لگا ہوں تمہیں اپنی طرف

اس کے ساتھ ہی وہ زور سے چلایا۔

ہا ——

ایک سخت جھٹکا لگا اور شفیع سلیم کی چھاتی سے آ لگا۔ زنجیر سلیم نے اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر جب زور لگایا تو شفیع کا سانس بند ہو گیا۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ ختم ہو گیا۔

سلیم نے لاش کو ٹھوکر ماری اور وہ دور جا گری۔ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ خشک کیا۔ پھر وہ لاش کو کھینچتا ہوا دریا کے کنارے آیا اور نواب کو آواز دی۔

نواب! نواب!

چند ہی لمحوں بعد نواب جنگل سے نمودار ہوا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے اپنے پیچھے کوئی اور آدمی بھی بٹھا رکھا تھا۔ سلیم کے پاس آ کر اس نے گھوڑا روکا اور نیچے چھلانگ کر وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور سلیم کو گلے لگا لیا۔ لاش پر نظر پڑتے ہی سلیم چونک سا پڑا۔

اس نے یہاں تمہارے ساتھ جھگڑا کرنے کی کوشش کی ہو گی؟

سلیم نے لاش کی طرف دیکھا۔

یہ پھر الرکا شفیع ہے۔

نواب نے حیرت کا اظہار کیا۔

یہ ہے شفیع!

ہاں!

چلو اچھا ہوا یہ بھی ختم ہوا۔

سلیم نے ہتھکڑی کی طرف اشارہ کیا۔

پہلے اس کا کچھ کریں۔

نواب مسکرا دیا۔

گھبراتے کیوں ہو۔ میں اپنی بستی کا لوہار چاچا ساتھ لے کر آیا ہوں۔

نواب کے ساتھ آئے ہوئے اس بوڑھے لوہار نے اپنے اوزار زمین پر رکھے اور تھوڑی دیر کی محنت کے بعد وہ ہتھکڑی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

تینوں پھر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دریا کے کنارے کنارے نیچے کی سمت بڑھنے لگے۔

اور اس کے بعد جگ موہن نے رکنیت کا حلف لیا۔ راجیہ سبھا کے چیئرمین ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے جیسے ہی جگ موہن سے حلف لینے کے لیے کہا ویسے ہی ایوان میں کانگریس آئی کے لیڈر پی شیو شنکر نے کہا کہ جگ موہن کی نامزدگی تمام سیاسی اصولوں اور اقدار کے منافی ہے۔ اور یہ نامزدگی صرف بی جے پی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس کے بعد کانگریس آئی کے ممبران جگ موہن کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے واک آوٹ کر گئے۔ جب جگ موہن انگریزی میں حلف لے چکے تو بی جے پی کے اٹل بہاری باجپئی نے کانگریس کے ممبروں کے رویہ پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں نے درمیان میں ہماری پارٹی کا نام بالکل غیر ضروری طور پر لیا۔

اس سے ایک روز قبل دوشنبہ کے روز جگ موہن کے استعفیٰ کے معاملے میں راجیہ سبھا میں بی جے پی اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے ممبروں کے درمیان جھڑپیں ہوئی تھیں۔ وقفہ سوالات کے فوراً بعد بی جے پی کے جے پی ماتھر نے کہا کہ وزیراعظم وی پی سنگھ نے اخباروں سے یہ کہہ کر کہ جگ موہن نے خود استعفیٰ دیا ہے جھوٹ بولا ہے اور ان کے اس کہنے پر بی جے پی اور بائیں بازو کے ممبروں میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ بائیں بازو کے ممبروں کا کہنا تھا کہ بی جے پی کے ممبر کو وزیراعظم پر ایسا ریمارک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جھڑپ میں مداخلت کرتے ہوئے ڈپٹی چیئرمین نجمہ ہیبت اللہ نے کہا کہ بی جے پی کے ممبر کو صرف جگ موہن کے استعفیٰ پر بولنے کی اجازت دی گئی تھی اس لیے ان کو وزیراعظم پر ریمارک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بی جے پی کے مسٹر مہاجن نے بائیں بازو کے مسٹر داس گپتا کے اس ریمارک پر احتجاج کیا کہ انہوں نے مبینہ طور پر جگ موہن کو "آدم خور" کہا ہے۔ ماتھر نے حکومت سے سوال کیا کہ کیا اخباروں کے مطالبہ پر اور وہ بھی غلط مطالبہ پر جگ موہن کو ہٹانا مناسب تھا آخر حکومت نے کس کے دباؤ میں آکر جگ موہن کو برطرف کیا۔ امریکہ کے یا پاکستان کے دباؤ سے۔

حد تو یہ ہے کہ جگ موہن کو راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کرنے کی مخالفت خود برسر اقتدار جنتا دل کے تین ممبروں نے بھی کی ہے ان ممبروں نے وزیراعظم مسٹر وی پی سنگھ کو ایک

مکتوب بھیجا ہے جس کی نقول اخباروں کو بھی دی گئی ہیں۔ اس مکتوب میں کہا گیا ہے کہ گورنر جگ موہن نے کشمیر کے معاملے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کے بارے میں اگر م سے کم کہا جائے تو بھی یہ کہنا پڑے گا کہ ان کا رویہ اختلافی تھا۔ میر واعظ مولوی فاروق ے جنازہ میں شریک لوگوں پر فائرنگ جگ موہن کے دور حکومت میں ہی ہوئی اور ن کو عوامی دباؤ کے تحت گورنر کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا اور اب راجیہ سبھا کی رکنیت کے لیے جگموہن کی نامزدگی سے ان کے جذبات اتنے مجروح ہوئے ہیں وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ وزیراعظم کو بھیجے گئے اس مکتوب پر درج ذیل ممبروں ے دستخط ہیں۔ جنتا دل کے لیفٹیننٹ سنہا۔ کمل مرارکا اور ستیہ پرکاش مالویہ۔ سی پی ئی کے گرو داس داس گپتا۔ آر ایس پی کے سریندر جھا چاریہ اور فارورڈ بلاک ے دیبا برنا بسواس۔

ہو سکتا ہے کہ جگ موہن کی گورنری کے دوران ان کی سخت گیر پالیسیوں نے ریاست میں کچھ استحکام پیدا کیا ہو لیکن قومی سطح پر جگ موہن کی پالیسیوں کو جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے اس کے نتیجے میں کشمیر دوسرا پنجاب بن کر رہ گیا ہے۔ جگ موہن ہی کے حکومت میں دیواروں پر ایسے نعرے لکھے ہوتے دیکھے گئے کہ "ہندوستانی کتو واپس ضرورت تھی کہ جگ موہن کو بہت پہلے ہٹایا جا چکا ہوتا جگ موہن کی پالیسیوں اسلامی بلاک میں ہندوستان کے روایتی دوستوں تک کو بدظن کر دیا اور حد تو ہ کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے کشمیر میں نیم فوجی فورسز کے اقدامات کی مذمت جگ موہن کی پالیسیوں سے صرف بی جے پی کو فائدہ پہنچا ہے اور سری نگر سے کشمیری زل کے ہٹنے سے بی جے پی کے ہندو راشٹر پلیٹ فارم کو استحکام پہنچا ہے ان باتوں کے باوجود بھی جگ موہن کو گورنری سے شاید ابھی نہ ہٹایا جاتا اگر میرواعظ محمد فاروق کے جلوس جنازہ پر نیم فوجی فورسز نے فائرنگ کر کے ۲۷ افراد کو ہلاک کر دیا ہوتا۔

گورنر کی تبدیلی کے باوجود کشمیر کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ "آسمان سے گرا

کمور میں اُلکا یعنی جگ موہن کے مستعفی ہونے کے بعد جموں وکشمیر کا نیا گورنر را ر کے سابق چیف گریش چندر سکسینہ کو مقرر کیا گیا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر سے متعلق مرکزی حکومت کی پالیسی میں تبدیلی نہ ہوگی۔ مسٹر سکسینہ انڈین پولیس سروس کے سابق آفیسر ہیں اور ایمرجنسی کے دوران اندرا گاندھی سے جڑے رہے ہیں۔ اور اُس دوران سینیئر ریسرچ اینڈ انالیسس ونگ آفیسر کی حیثیت میں انہوں نے بنگلہ دیش کی جنگ میں اور سکم کے الحاق کے معاملے میں نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ ابتدا میں ایسی باوثوق اطلاعات تھیں کہ جگ موہن کا جانشین ایک اور سابق آئی۔ پی ایس آفیسر کے الیف رستم جی کو مقرر کیا جائے گا جو کشمیر سے متعلق بالکل مختلف پالیسی کے حامی ہیں۔ گذشتہ ہفتہ رستم جی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے وادی کشمیر میں حکومت کے اقدامات پر کئی سوالات اٹھائے تھے۔ رستم جی کا ایک سوال تھا کہ جو سخت رویہ مسلح باغیوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہیے کیا وہی رویہ ان شہریوں کے ساتھ جن میں عورتیں بچے بوڑھے سبھی شامل ہیں اختیار کیا جانا چاہیے جو صرف ان کے نعروں سے متاثر ہیں۔ اور کیا کشمیریوں کو ان کے خیال کی سزا ملنی چاہیے کہ ہندوستان نے ان کے معاملے میں غلط اقدامات کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس بات پر بھی توجہ دلائی تھی کہ غریب عوام پر مسلسل کرفیو کے مصائب خیز اثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا رہا۔ جنوری کے مہینے میں بھی جموں وکشمیر کی گورنری کے لیے رستم جی کا نام لیا گیا تھا لیکن جگ موہن کے مقابلے میں ان کو مسترد کر دیا گیا تھا۔

اس رائے کے باوجود کہ گورنر کی تبدیلی سے کشمیر سے متعلق حکومت کی پالیسی بدستور رہے گی سیاسی ماہرین اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب نئے گورنر کی پالیسی کھل کر سامنے آئے اور اس سلسلے میں سیاسی ماہرین کا کہنا ہے کہ نئے گورنر کی آزمائش اس وقت شروع ہوگی جبکہ جنگجو نوجوان اپنی سرگرمیوں میں تیزی پیدا کریں گے۔

جن حالات میں میرواعظ مولوی فاروق کا قتل ہوا اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر کی انتظامیہ نے وہاں کے مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوئی واضح حکمتِ عملی سرے سے طے ہی نہیں کی تھی۔ عام حالات میں اگر اس قسم

کا واقعہ پیش آتا تو سینیئر حکام موقع پر دوڑ بھاگ کرتے نظر آتے لیکن اس معاملے میں پتہ نہیں کس مصلحت کے پیش نظر انہوں نے اپنے آپ کو دُور رکھا۔ یہ واضح رہے کہ میرواعظ مولوی فاروق صرف ایک سیاسی لیڈر ہی نہیں تھے بلکہ ایک مذہبی پیشوا بھی تھے لیکن حکام محض آپس میں مشورہ ہی کرتے رہ گئے یہاں تک کہ کسی نے سرکاری طور پر موقع پر جا کر تعزیت کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہیں شاید اس بات کا خدشہ رہا ہو کہ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جس میں جنگجو بھی شامل ہو سکتے ہیں انہیں جسمانی گزند نہ پہنچا دے۔ اس سلسلے میں ہندوستان ٹائمز کے نمائندے برج جار دواج نے جو رپورٹ تیار کی اس سے انتظامیہ کے نکمے پن کا احساس ہوتا ہے۔

مولوی فاروق کے قتل کی خبر جیسے ہی پھیلی لوگوں نے ہسپتال میں جمع ہونا شروع کر دیا جبکہ سرکاری ایجنسیاں ایک دوسرے سے صلاح مشورے کرتی رہیں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں۔ ہجوم نے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو کر لاش اپنے قبضے میں کر لی اور وہ ایک جلوس کی شکل میں مولوی فاروق کے آبائی مکان میرواعظ منزل کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک حکام اسی بات پر غور و خوض کرتے رہے کہ کرفیو نافذ کر دیا جائے یا جنازے کے جلوس کو جانے کی اجازت دے دی جائے لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے یہی نہیں احتیاطی تدابیر کے طور پر جلوس کے آگے اور پیچھے حفاظتی فورس بھی نہیں تعینات کر پائے اور نہ ہی میرواعظ منزل تک راستے میں قائم حفاظتی چوکیوں کو ہی ہدایات جاری کیں۔ جلوس دو چوکیوں سے پُرامن طور پر گذر گیا لیکن جب اسلامیہ کالج کی طرف بڑھا جہاں سی آر پی الیف کا ڈویژنل ہیڈکوارٹر قائم ہے تب ہی شرمناک واقعہ پیش آگیا۔

سی آر پی الیف کے ہیڈکوارٹر میں اس وقت کوئی افسر موجود نہیں تھا۔ سی آر پی الیف کے لوگوں کو وائرلیس پر جو متضاد پیغام دیا گیا اس سے بھی وہ تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہجوم ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے تو ان میں خوف و ہراس پھیل گیا انہیں یہ ڈر پیدا ہوا کہ یہ ہجوم ہیڈکوارٹر میں موجود اسلحہ لوٹنے آ رہا ہے کیونکہ وہاں جدید اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ایک نان کمیشنڈ

نواب بھائی کہاں ہے ؟

میرے ساتھ آیا ہے۔ ادھر ساتھ والے کمرے میں ہے۔

نواب بھائی نے نکالا ہے آپ کو قید سے۔

ہاں —— ۔

اس نے واقعی اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ جب پولیس والے آپ کو پکڑ کر لے گئے تھے تو وہ ہم سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ یا تو سلیم کو واپس لے کر آؤں گا یا خود بھی ختم ہو جاؤں گا۔

ہاں کشور! وہ ایک مخلص دوست اور درد مند بھائی ہے۔

چلو اس کمرے میں ہی چلتے ہیں۔

کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

چلیے ——

دونوں دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کشور نے نواب کو

رکھی ہے۔ وہ چاندی کوٹ میں اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

ہاں! آپ کو ہم وہاں چھوڑ جائیں گے۔ رات آپ اس کے پاس ہی رہیں گی۔ ہاں کشور ہمارے ساتھ ہمارے ٹھکانے پر جائے گی اور رات سلیم کے پاس رہے گی۔ دوسرے روز شام کے قریب ہم اس کے گھر چھوڑ جائیں گے۔ اب آپ جلدی کریں، دیر ہو رہی ہے۔

ایک گھوڑے پر گلشن اور کشور سوار تھیں اور دوسرے پر سلیم اور نواب۔ اس حالت میں وہ چاندی کوٹ میں داخل ہوئے۔ سلیم نے دروازے پر دستک دی۔ نادر نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور سلیم سے لپٹ گیا۔

تم آگئے ہو ماموں۔ پھر وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور بلقیس کو جگایا۔

امی دیکھو تو سلیم ماموں آگئے ہیں۔

بلقیس تیزی سے اُٹھی۔ سلیم اس کے سامنے جھکا اور اس نے سلیم کی پیشانی چوم لی۔

مہاجر یا مجاہد؟

مطبوعہ: ۱۷ اگست ۱۹۹۰ء

فروری ۹۰ء کا ایک دن تھا جب سرینگر ائرپورٹ کے نزدیک چھانہ پورہ نامی قصبے پر پولیس نے اچانک دھاوا بول دیا۔ اس علاقے میں دختران ملت نامی مسلمان عورتوں کی تنظیم خاصی سرگرم تھی اور دختران ملت کے مسلسل احتجاجی جلوسوں نے بھارتی سامراج کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ کرفیو کے دوران بی ایس ایف اور بھارتی فوج چھانہ پورہ میں داخل ہوئی اور انہوں نے یہاں موجود تمام مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر لیا۔ جس گھر سے مزاحمت ہوئی اس کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑا۔ یہ مسلمان بچیاں تین روز کے بعد جب فوجی ٹرکوں کے ذریعے چھانہ پورہ میں پھینکی گئیں تو ان کے جسم زندہ لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ بھارتی درندوں نے ایسا وحشیانہ سلوک کیا تھا کہ کئی مسلمان بچیوں کے گالوں سے گوشت نوچا گیا تھا۔

ان کے جسمانی اعضا کاٹ دیئے گئے تھے جب ان بچیوں کو سورہ میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل کیا گیا تو ان کی جسمانی حالت دیکھ کر ڈاکٹروں کے دل پھٹ گئے اور ڈاکٹر عبدالاحد گورو نے جو اس ہسپتال کے انچارج ہیں احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ صورت حال اتنی سنگین تھی کہ پھر اس واقعے پر مقبوضہ جموں کشمیر کے تقریباً گیارہ سو مسلمان سرکاری ملازمین نے اخبارات میں اعلان کر کے استعفیٰ دے دیا اور اس ضمن میں دختران ملت نے تقریباً دو سو میمورنڈم لیڈی اور کے مقامی دفاتر میں پیش کئے۔

سرینگر کے محلہ زینہ کدل میں کرفیو کے دوران ۳ گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔ دکانیں

کھلیں تاکہ لوگ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کم از کم راشن تو اپنے گھر تک ڈال لیں۔ صوفی نان بائی کی دکان پر گاہکوں کا رش تھا اور ان کی دو نوجوان بیٹیاں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں کہ بی ایس ایف کی ایک پارٹی ادھر سے گزری۔ بدقسمت بوڑھے صوفی نان بائی نے نوٹ کیا کہ ان بدمعاشوں کی نیت لڑکیوں کو دیکھ کر خراب ہو رہی ہے اس وقت تو وہ کچھ نہ کر سکے اور لڑکیوں کو گھورتے ہوئے واپس چلے گئے۔ صوفی نان بائی کو شک گزرا کہ کرفیو لگنے پر یہ لوگ ضرور آئیں گے کیونکہ مسلمان بچیوں کو عموماً دوران کرفیو ہی اغوا کیا جاتا تھا۔

رات بارہ بجے صوفی نان بائی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے اپنی دونوں بچیوں کو تندور میں بٹھا کر اس پر ڈھکن رکھ دیا۔ تندور ابھی گرم تھا بھارتی درندے گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے مکان میں لڑکیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا جب لڑکیاں نہ ملیں تو صوفی سے ان کے متعلق دریافت کیا۔ بوڑھے کشمیری مسلمان نے کہا وہ کسی دوسرے شہر سے آئی تھیں اب واپس چلی گئی ہیں۔ بھارتی درندوں نے ان کی یہ بات تسلیم نہ کی اور وحشیانہ طریقے سے انہیں پیٹنے لگے۔ مسلمان زادیوں نے اپنے والدین کی چیخ و پکار سنی لیکن غیرت ایمانی نے انہیں کسی کمزوری کے مظاہرے سے منع رکھا جب موذی نامراد واپس لوٹے اور زخموں سے چور باپ نے تندور کا ڈھکن اٹھایا تو دیکھا اس کی دونوں بیٹیاں آپس میں بغلگیر ہیں اور جام شہادت نوش کر چکی ہیں۔ انہیں کتنی اذیت ناک موت نصیب ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کوئی بھی ذی شعور کر سکتا ہے لیکن سلام ہو ان عظیم بیٹیوں پر جنہوں نے مرتے دم تک اُف نہ کی کہ کہیں کسی موذی کے کانوں تک ان کی آواز پہنچا اور وہ انہیں اغوا کر کے لے جائیں۔

۲۲ جنوری ۹۰ء کو بھارتی فوج نے گورنر جگ موہن کی آمد کا جشن مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیل کر منایا تھا۔ ایک عینی شاہد نے مجھے بتایا کہ وہ دہلی سے جہاز کے ذریعے سرینگر آ رہے تھے اس پرواز سے سید علی شاہ گیلانی بھی سرینگر پہنچے تھے۔ ہوائی اڈے کو فوج نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جب یہ لوگ ائرپورٹ پر اترے تو وہاں صرف ایک پرائیویٹ

گاڑی تھی جس کے ذریعے کسی نہ کسی طرح وہ گمرل باغ سرینگر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں شہیدوں کی لاشیں لائی جا رہی تھیں۔

عینی شاہد نے بتایا اس حملے میں ۹ لاشیں لائی گئیں جن میں ایک ۹ سالہ پرویز احمد کی لاش تھی معصوم شہید نے اپنے ہاتھ میں پاکستانی پرچم تھام رکھا تھا جو شہادت کے بعد بھی اس کے ہاتھ سے الگ نہیں ہوا۔ علمائے کرام نے اس پاکستانی شہید کو جھنڈے سمیت دفنا دیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

اس روز جگ موہن کے حضور پانچ سو بے گناہ نہتے اور مظلوم کشمیریوں کے خون کا نذرانہ پیش کیا گیا۔

۱۸ جون ۹۰ء کو حزب المجاہدین کے مقامی کمانڈر محمد عبداللہ بنگرو نے اپنے مجاہدین کے ساتھ سرینگر کے آفیسرز میس پر حملہ کیا اور پہلے ہی حملے میں چھ آفیسرز کو مار ڈالا۔ بھارتی کمانڈوز نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے علاقے کو گھیرے میں لے لیا جب عبداللہ بنگرو نے دیکھا کہ اب معاملہ بس سے باہر ہے تو انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے ساتھیوں کو فرار کروا دیا اور خود بھارتی کمانڈوز کے سامنے ڈٹے رہے بھارتیوں کی ہر ممکن کوشش تھی کہ انہیں زندہ گرفتار کر لیں لیکن اس اللہ کے پُراسرار بندے نے جب دیکھا کہ اسلحہ ختم ہے اور دشمن سر پہ چڑھا آتا ہے تو دشمن کے زندہ ہاتھ آنے پہ شہادت کو ترجیح دی اور خود کو گولی مار کر شہید کر لیا۔

زینہ کدل ہی کے دو اور واقعات سن لیجئے کہ رمضان المبارک میں جب بھارتی حکام نے ۲۲ دن کا مسلسل کرفیو نافذ کیا تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ انہوں نے راشن ختم ہونے پر پانی سے روزہ رکھا اور افطار کیا۔ ایک روز کی بات ہے کہ ایک محلے کی مسجد سے دوران کرفیو اپیل نشر کی گئی کہ وہاں کے مسلمانوں کے پاس پینے کے لیے پانی بھی نہیں بچا کچھ مسلمانوں نے کوشش کی کہ کسی طرح اپنے بچوں کو بھوکا پیاسا مرنے سے بچایا جائے تو راشن پانی لے کر چند مسلمان جانیں ہتھیلی پہ رکھ کر اس محلے کے لوگوں کی امداد کو پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ موذیوں کی نظر میں آ گئے۔ جنہوں نے ان پہ فائرنگ شروع

کر دی۔ اس طرح یہ مسلمان اپنے بھوکے پیاسے مسلمان بھائیوں کی مدد تو کیا کرتے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

زینہ کدل ہی کا واقعہ ہے کہ بھارتی فوج نے مجاہدین کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا زبردست مقابلے کے بعد تین مجاہدین کو گرفتار کر لیا۔ چوتھے مجاہد کمانڈر نے چوتھی منزل سے چھلانگ لگائی تو نیچے موجود کشمیری مسلمان اسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ فوج نے چاہا کہ اس کی شناخت کرے لیکن مقامی پولیس نے جو مسلمانوں کی ساتھی ہے اس مجاہد کی غلط شناخت کی اور اسے عام کشمیری بتایا۔ اس اثنا میں یہ مجاہد ہسپتال پہنچایا جا چکا تھا۔ فوج کی انٹیلی جنس ہسپتال پہنچی کہ اپنے "ذرائع" کی اطلاع کے مطابق کہ زخمی دراصل کمانڈر لیلین ملک ہے اسے گرفتار کرے لیکن ڈاکٹروں نے فوجی انٹیلی جنس کی آمد سے پہلے ہی زخمی مجاہد کا بستر تبدیل کر دیا اس کو کسی دوسری وارڈ کے کسی اور بستر پر منتقل کر دیا جب متعلقہ وارڈ کے متعلقہ بستر تک انٹیلی جنس کے لوگ پہنچے تو ان کے مخبر کی اطلاعات کے برعکس وہاں کوئی عام کشمیری موجود تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ زینہ کدال والا زخمی یہی ہے اس طرح لیلین ملک فوج کی گرفت سے بچ نکلا۔ اگلے روز ڈاکٹروں نے اسے ہسپتال سے بھی فرار کروا دیا۔

قارئین کرام یہ واقعات جو آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے براعظم افریقہ یا آسٹریلیا کے نہیں بلکہ مقبوضہ جموں کشمیر کے ہیں جہاں مسلمان بوڑھوں بچوں اور عورتوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے جہاں عملاً فوج کی حکمرانی ہے۔ اس وادی جنت نظیر میں ہندو سامراج کی شیطانی حکومت بہیمیت کا ننگا ناچ ناچ رہی ہے۔

ساری وادی میں عملاً کرفیو نافذ ہے۔ کشمیر کے مرغزار، کوہسار، وادیاں مسلمانوں کے خون میں نہا گئی ہیں۔ ہر روز نہتے بے بس اور بے کس مسلمان سراپا احتجاج اپنے سینے تانے دشمن کے سامنے آتے ہیں اور پلک جھپکنے میں زندگی موت کا روپ دھار لیتی ہے۔ مسلمان بچیوں کو گھروں سے اغوا کر کے ان کی اجتماعی عصمت دری کی جاتی ہے دختران ملت کو سڑکوں پہ لٹا کر ان کے سینوں پر ٹرک گزار دیئے جاتے ہیں۔

جموں کشمیر آرمڈ پولیس جس کے بیشتر ملازمین کشمیری مسلمان ہیں کی بھارتی فوج

کے ساتھ باقاعدہ جنگ ہو رہی ہے۔ کشمیری مسلمانوں کو مبو کا پیاسا رکھنے کے لیے مسلسل کرفیو کا نفاذ جاری ہے۔ سری نگر ایئرپورٹ کے نزدیک ٹارچر کیمپ قائم ہیں جہاں مسلمان نوجوانوں کو گروپوں کی شکل میں لایا جاتا ہے۔ ان کے جسمانی اعضا ایک ایک کر کے الگ کیے جاتے ہیں اور آخر میں انہیں گولی مار کر دریائے جہلم میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ ان کی لاشیں جب پاکستانی آزاد جموں کشمیر میں داخل ہوں تو ان کے لیے دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

حالت یہ ہے کہ بھارتی گورنروں کو مقبوضہ کشمیر میں کوئی قابل اعتماد سیکرٹری میسر نہیں آتے انہیں اپنے پی اے بھی دہلی سے منگوانے پڑتے ہیں جس شدت سے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی حکومت کو مزاحمت کا سامنا ہے اس کے بعد سے بھارتی فوج نے کشمیری مخبروں پر اعتماد کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جو کشمیری مسلمان دہلی وغیرہ میں بزنس کے لیے جاتے تھے انہیں دہلی کے مسلم ہوٹلوں میں جگہ نہیں ملتی مقبوضہ کشمیر سے آنے والے کچھ کاروباری لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بتایا کہ وہ لوگ جو مدتوں سے فروٹ کے بزنس سے منسلک ہیں اور گزشتہ دس پندرہ سال سے مخصوص ہوٹلوں میں قیام کرتے آ رہے ہیں انہیں اب ان ہوٹلوں میں جگہ نہیں ملتی۔ اگر کوئی خطرہ مول لے کر کسی کشمیری مسلمان کو اپنے ہوٹل میں رکھ بھی لے تو اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ بے چارے کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

ایک مسلمان تاجر نے بتایا کہ وہ فروٹ کا کاروبار کرتے ہیں اور دہلی کے اکرم ہوٹل میں ان کا قیام رہتا ہے۔ انہوں نے ایک ہندو بیوپاری سے لاکھوں روپے قرض لینے تھے جب وہ دہلی پہنچے تو معمول کے مطابق اکرم ہوٹل گئے اس ہوٹل کے مالک سے ان کے ذاتی تعلقات بھی ہیں لیکن ہوٹل کے مالک نے انہیں کمرہ دینے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ انٹیلی جنس والے اس کی جان کو آ جائیں گے۔ انہوں نے ہوٹل کے مالک کو گزشتہ ۸ سالہ تعلقات کا حوالہ دیا اور زبردستی ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔

مسلمان ہوٹل مالکان کو روزانہ شام ساڑھے سات بجے تک آنے والے مہمانوں کی مکمل تفصیلات کا رجسٹر مقامی سی آئی ڈی آفس بھیجنا ہوتا ہے۔ جب رجسٹر یہاں گیا اور

ایک کشمیری مسلمان کا نام دیکھا گیا تو پولیس والے دندناتے ہوٹل میں گھس آئے ان صاحب نے اس ہندو بیوپاری کا نام لیا کہ جس سے انہوں نے لاکھوں روپے لینے تھے اور جو اس کشمیری مسلمان کی مدد کے لیے ہوٹل میں پہنچ گیا تھا لیکن انٹیلی جنس نے اس کشمیری مسلمان کو اتنا زچ کر دیا کہ اس بے چارے کو راتوں رات سری نگر واپس لوٹنا پڑا۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان ویزے پر پاکستانی کشمیر میں آتے ہیں واپسی پر انہیں انٹیلی جنس والے خصوصی تحقیق و تفتیش کے لئے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کے بدن کے سارے کپڑے اتروا کر ان کا جسمانی معائنہ کیا جاتا ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں انہوں نے پاکستان میں تربیت تو حاصل نہیں کی۔ ان کی کہنیاں اور گھٹنے خاص طور سے چیک کیے جاتے ہیں کہ دوران تربیت ان پر نشانات پڑ جاتے ہیں۔

مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں آنے والے ایک اور صاحب نے بتایا کہ جب سکھوں نے دلی میں مسز اندرا گاندھی کو قتل کیا اور جواب میں ہندوؤں نے سکھوں کے خون کی ہولی کھیلی ان دنوں کشمیری مسلمانوں کے فروٹ کے بے شمار ٹرک دلی آئے ہوئے تھے۔ ہندو بلوائیوں نے "گاڑی خالصتان کی"، "مال پاکستان کا" "جلا دو ..... مٹا دو" کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے ٹرکوں پر حملہ کر دیا اور لاکھوں روپے کا فروٹ لوٹ کر لے گئے۔

میں جب مہاجرین کے کیمپ دیکھنے کشمیر گیا تو وہاں موجود مقبوضہ کشمیر کے ہر شہری نے اس بات پر زبردست احتجاج کیا کہ ہم انہیں مہاجر کیوں کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم مجاہد ہیں مہاجر نہیں۔ ہم پاکستان میں دال چاول کھانے نہیں آئے۔ ہمیں آپ کے عنایت کردہ کپڑوں اور جوتوں کی ضرورت بھی نہیں۔ جن حالات میں آپ نے ہمیں رکھا ہوا ہے ہمیں اس پر بھی شکوہ نہیں ہم اس سے بدتر حالات میں زندہ رہ سکتے ہیں لیکن خدارا ہمارے مسلمان پاکستانی بھائیوں تک ہماری آواز پہنچا دیجئے کہ ہمیں جہاد کے لیے اسلحہ درکار ہے ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا پاکستان کے لیے ہے۔ ہماری ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی عصمت دری اس لیے کی جا رہی ہے کہ ہم پاکستانی ہیں ہم

پر زندگی کے تمام دروازے اس لیے بند ہیں کہ ہم پاکستان اور اسلام کے نام لیوا ہیں لیکن پاکستان کی حکومت نے ہمیں یہاں کینوس کے خیموں میں رکھ کر ہمارے سامنے راشن پھینک دیا ہے کیا ہم اس لیے پاکستان آئے ہیں۔

کپواڑہ کے ایک مجاہد نے جس کے پاؤں زخمی ہیں برف نے جس کے پاؤں کی انگلیاں کھالی ہیں مجھے بتایا کہ اس کی ماں اور بہن نے مکان سے کود کر جان دے دی۔ اس کے باپ کو بھارتی درندوں نے بندوقوں کے بٹ مار مار کر مار ڈالا۔ وہ پاکستان آیا ہے تاکہ واپس جا کر دشمن کو بتا سکے کہ ابھی مسلمان زندہ ہیں ان کی غیرت زندہ ہے لیکن یہاں اسے کیمپ میں ڈال دیا گیا ہے۔

میں نے آزاد جموں کشمیر میں سینکڑوں کشمیری مجاہدین سے ملاقات کی ہے۔ وہ لوگ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں کہ انہیں راشن نہیں اسلحہ چاہیئے۔ یہ وہ جیالے سرفروش ہیں جنہوں نے ہماری شہ رگ پر رکھے دشمن کے پاؤں کاٹ ڈالے ہیں! انہوں نے ہمارے جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھا ہے لیکن ہم نے پلٹ کر ان کی خبر نہیں لی۔

سرینگر سے آنے والے مجاہد نوجوان ہیں تعلیم یافتہ ہیں اور اسلامی الذہن ہیں۔ وہ حالات سے مایوس نہیں بددل ضرور ہو گئے ہیں لیکن انہیں امید ہے کہ اگر پاکستانی حکومت نے ان کی آواز پر کان دھرے تو پاکستانی قوم ضرور ان کی قربانیوں کا مول چکائے گی اور ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہم سب کندھے سے کندھا ملا کر سیسہ پلائی دیوار بن کر دشمن کے خلاف نبرد آزما ہوں گے اور کشمیر آزاد ہو گا۔

محمد یوسف صراف جموں کشمیر کی ۱۲ جماعتی انقلابی کونسل کے صدر ہیں ان کے ساتھ اس مسئلے پر جو گفتگو ہوئی وہ نذر قارئین ہے۔

سوال . . . پشاور کے شہریوں کا کہنا ہے کہ ۱۲ لاکھ کی آبادی والے شہر پر ۸ لاکھ افغان کے دباؤ نے اس شہر کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں جس تیزی سے مقبوضہ کشمیر سے مسلمانوں کے قافلے آ رہے ہیں کیا کل آزاد کشمیر کے لوگوں میں بھی یہی سوچ جڑ نہیں پکڑے گی۔

جواب . . . . پشاور والے حالات کا قیاس یہاں ممکن نہیں کیونکہ کشمیر کی سرحدیں اتنی آسان نہیں جتنی افغانستان کی ہیں۔ یہ مسئلہ بھی بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ آزاد کشمیر مقبوضہ کشمیر سے الگ نہیں اور پاکستانی اسے اپنا جہاد سمجھتے ہیں۔ جبکہ پشاور افغانستان کا حصہ نہیں ہے۔ ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی مذہبی تہذیبی اور خونی رشتے ہیں آپ کو علم ہے کہ ۴۸ء میں جب جہاد کشمیر جاری تھا ایسے موقعے پر سیز فائر ہوا جب کسی کو یقین ہی نہیں تھا کسی کا باپ ادھر تھا تو ماں اس طرف۔ بھائی ادھر تو بہن اس طرف اور بیوی ادھر تو خاوند ادھر۔ یہ بالکل غیر قدرتی تقسیم تھی جس نے بظاہر خونی رشتے بھی کاٹ ڈالے۔ اس لیے ہمارا اور یہاں کے مسلمان کا اتحاد فطری ہے اگر کسی تیسری ایجنسی نے یہاں تقسیم یا تفرقہ پیدا کی تو یہاں کے لوگ ہی اسے ختم کر ڈالیں گے۔

سوال . . . عالمی سطح پر معاہدہ شملہ کی تکرار عام ہے اور جب بھی پاکستان کی طرف سے بھارت کو مسئلہ کشمیر کا احساس دلایا جائے۔ بھارت اور دنیا کے دیگر ممالک اسے معاہدہ تاشقند، شملہ وغیرہ کے ذریعے حل کرنے پر زور دیتے ہیں ان حالات میں عالمی سطح پر کیا ہمارا استصواب رائے کے لیے یو این او کو رجوع کرنے کا معاملہ کمزور تو نہیں پڑ گیا۔

جواب . . . . اقوام عالم سیاسی تغیرات کی لپیٹ میں آتی رہتی ہیں۔ بالٹک ریاستیں یورپ وغیرہ میں حالات کی تبدیلی آپ کے سامنے ہے۔ کشمیر میں ایسی کسی تبدیلی کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھئے کشمیری نسل در نسل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آزادی ہمارا حق ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہم نے اس غیر قدرتی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کیا۔ کوئی باغیرت قوم اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا کرتی۔ یہ تمام معاہدے جو وقتاً فوقتاً ہوئے انہوں نے ہماری غیرت کا امتحان لیا ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے معاہدے کرنے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔ آج نہیں تو کل کامیابی ہمارا مقدر ہے اور ہم استصواب رائے کا طے شدہ حق حاصل کر کے رہیں گے۔

مفتی ضیاء الحق کشمیر فریڈم فرنٹ کے سربراہ ہیں اور کشمیر کے ایک بڑے مذہبی

خدا کرے ان کی یہ خواہش پوری ہو جائے کیونکہ آج ہر پاکستانی بھی خواہش کر رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ تحریک آزادی کا مزاج ۴۸ء اور ۶۵ء والی تحاریک سے بالکل مختلف ہے اور اس تحریک کو دنیا کی کوئی طاقت نہ دبا سکتی ہے نہ جھکا سکتی ہے۔

جناب غلام محمد صفی زادہ حزب المجاہدین کے امیر ہیں ان کے ساتھ جو گفتگو ہوئی وہ نذر قارئین ہے

سوال... صفی صاحب مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں سے متعلق یہ تاثر جڑ پکڑ چکا تھا کہ یہ کبھی اپنی آزادی کے لیے ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ لیکن مجاہدین نے بہت کم عرصے میں ساری دنیا کے پریس کو چونکا کر رکھ دیا اور اپنی دلیرانہ کارروائیوں کے ذریعے ساری دنیا کو اپنے حق خود اختیاری کا بھولا سبق یاد کروا دیا ہے آپ کے خیال میں یہ انقلابی تبدیلی کیسے آئی۔؟

جواب... جہاد کشمیر کوئی اچانک اٹھنے والی تحریک نہیں بلکہ گزشتہ ۴۲ سال سے مقبوضہ کشمیر کے مسلمان مسلسل اپنے حق کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ اس حق کے حصول کے لیے مقبوضہ کشمیر کا ہر فرد اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کب وہ اپنے اس حق کو دنیا کے کانوں تک پہنچائے کہ کشمیر کے لوگوں نے اپنا حق خود اختیاری بھلایا نہیں میں وثوق سے کہتا ہوں کہ ۴۲ سال میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب کشمیریوں نے کسی نہ کسی صورت اپنے حق کے لیے آواز بلند نہ کی ہو جس کے نتیجے میں انہیں پر غیر انسانی سلوک کا سامنا کرنا پڑا ہزاروں کشمیریوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے کئی تفتیش میں معذور ہو گئے۔ اور آج بھی آپ کو کشمیر میں سینکڑوں والدین ملیں گے جو سوچ رہے ہیں نہ جانے ان کے بچے کب واپس آئیں گے لیکن انہیں معلوم نہیں کہ ان کے بیٹے جانے کب کے کسی تھانے عقوبت خانے میں موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ کشمیری عوام کو امید تھی کہ جلسے جلوس کے ذریعے آئینی طریقے سے وہ اپنا حق حاصل کر لیں گے لیکن جب ہمیں یقین ہو گیا کہ بھارتی حکومت کسی بھی طرح ہمیں حق دینے کو تیار نہیں تو ہم نے پھر جہاد کا علم بلند کر دیا کیونکہ بھارت

اپنی قوت کے بل بوتے پر ہمیں غلام بنایا اور اپنی مرضی کی حکومت جموں و کشمیر میں دیکھنا چاہتا ہے وہ ہر طرح اپنے نظریات ہم پر ٹھونسنا چاہتا ہے مقبوضہ جموں کشمیر میں جب لوڈ شیڈنگ بھی ہوتی تھی ان دنوں بھی رامائن اور مہابھارت ٹی وی سے دکھائے گئے اور ان ڈراموں کے درمیان پاور سپلائی بحال رہتی۔

سوال .... جلسے جلوس کے علاوہ آپ نے احتجاج کا اور کیا طریقہ اپنایا؟

جواب... ہم نے جلسے جلوس ہی نہیں کیے بم کے دھماکے بھی کئے ہیں ہم نے کرکٹ میچ کے دوران اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے ویسٹ انڈیز کی طرف داری اسی طرح کی کہ عمران خان کا فوٹو لے کر گراؤنڈ میں داخل ہو گئے یہ میچ بھارت اور ویسٹ انڈیز کے درمیان تھا جب ہمیں شک ہوا کہ بھارت جیت جائے گا تو ہم نے میچ ہی خراب کر دی کلائیو لائیڈ یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اسے ہوم گراؤنڈ میں اتنی مدد نہیں مل سکتی تھی اس نے کہا میں حیران ہوں کہ یہاں لوگ اپنی ٹیم کے اتنے مخالف ہیں تو عرض یہ کروں گا کہ یہ ۴۲ سال کی تحریک کا تسلسل ہے۔ ہنگامی واقعہ نہیں۔

سوال... لیکن گزشتہ چند ماہ میں جو اچانک زور اس تحریک نے پکڑا ہے اس سے دنیا یہ باور کرتی ہے کہ اس کے پس پردہ کوئی اور شخصیت بھی تھی۔

جواب... کچھ لوگوں کو کریڈٹ حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے اور کچھ لوگ کام کرنا پسند کرتے ہیں یہی واقعہ یہاں پیش آیا جن لوگوں نے ۸۲ میں اس کا آغاز کیا ان سے ذمہ دار واقف ہیں۔ لوگ حقائق سے آگاہ ہیں لیکن یہ ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ دنیا کو بتاتے پھریں کہ ہمارا ایک اہم لیڈر ۸۲ میں پاکستان آیا اس نے یہاں کے ایک بڑے ذمہ دار کے ساتھ بات کی اور ان کے فوٹو گراف بھی یہاں کے اخبارات نے شائع کئے۔ ایک پلان کے تحت ہم نے اس طرح کام کرنا تھا کہ شہادت بھی کم ہو اور مختصر سے وقت میں ہم زیادہ بہتر نتائج بھی حاصل کر سکیں اب ہوا یہ کہ جذباتی لوگوں نے زیادہ ہوشیاری دکھائی اور وقت سے پہلے کچھ پٹاخہ چلا دیا جس کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سرحدوں میں سختی بہت بڑھ گئی ہے اور ابھی اتنی زیادہ تیاری نہیں ہے جتنی ہونی چاہیئے تھی اس کے باوجود جن لوگوں نے

کام کا آغاز کیا انہیں پس پشت ڈال کر مخصوص مفادات کے تحت ان لوگوں کو سامنے لایا جا رہا ہے جو مستقبل میں غیر ملکی مفادات کے لیے کام کر سکیں اور صحیح لوگوں کو پریس کے ذریعے پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔

سوال.... جس مرحلے میں یہ تحریک داخل ہو چکی ہے وہاں اب دیکھنے میں آتا ہے کہ خصوصاً مسلمان خواتین پر دشمن کا ظلم و ستم بہت بڑھ چکا ہے مقصد تو یہی ہے کہ اس طرح مجاہدین کو دبایا جا سکے انسانی فطرت کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی غیرت کے معاملے میں بلیک میلنگ کے سامنے جھک جاتا ہے اور جس دشمن سے آپ کا سامنا ہے اس کے متعلق آپ جانتے ہیں وہ یہ ہتھیار کتنی خوبی سے استعمال کر سکتا ہے مسلمان خواتین کی بے حرمتی کے مسلسل واقعات سے کیا ایسا نظر نہیں آتا کہ مجاہدین کا مورال گر جائے گا۔

جواب.... دشمن نے ہم پر ظلم و ستم کے سارے تیر آزما لیے ہیں یہ سلوک وہ ۴۲ سال سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ عزتوں اور عصمتوں سے کھیلنا آج کی بات نہیں ایسے واقعات ماضی میں بے شمار پیش آئے کہ جن کو سن کر نوجوانوں کا خون کھول اٹھتا تھا سینکڑوں نوجوان ان حرکتوں کے خلاف احتجاج کرتے شہید ہو چکے ہیں۔ لیکن اب یہ تحریک عوامی بن چکی ہے اس میں کشمیر کے بچے بوڑھے عورتیں مرد سب شامل ہیں۔ اور ہم نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے اس جہاد کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے اب ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اس ظلم سے ہمارا مورال گرتا نہیں بڑھتا ہے ہم میں جدوجہد کا جذبہ اور تیز ہوتا ہے

سوال.... یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ موجودہ تحریک صرف شہروں تک محدود ہے اور دوسری بات کہ جہاد صرف وادی میں ہو رہا ہے جموں میں نہیں۔

جواب.... ایسا نہیں ہے دراصل ریڈیو اور اخبارات کا تعلق چونکہ شہروں سے زیادہ رہتا ہے اس لیے عام لوگ یہی سمجھتے ہیں آپ لسٹ دیکھ لیں یہ کل ہی ہمارے پاس پہنچی ہے جس میں دیہاتی علاقے کی کارروائیاں درج ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا جہاں تک جموں کا تعلق ہے وہاں بھی جہاد کا آغاز ہو چکا ہے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وادی میں اس کی شدت زیادہ ہے لیکن جموں میں بھی ہمارے مجاہدین بہت سرگرم ہیں۔

سوال.... بھارتی حکومت کا یہ بھی کہنا ہے کہ موجودہ تحریک مقبوضہ کشمیر میں ماضی کی حکومتوں کی نااہلی کی وجہ سے زور پکڑ رہی ہے وہاں چونکہ بیروزگاری کا مسئلہ بہت زیادہ ہے اس لیے نوجوان فرسٹریشن کا شکار ہیں۔

جواب.... یہ بھارتی حکومت کا معمول کا پراپگنڈہ ہے ہماری تحریک میں زیادہ تعداد ان مجاہدین کی ہے جو برسر روزگار اور پڑھے لکھے ہیں اور انہیں معاشی طور پر بھی کوئی تکلیف نہیں تھی پھر انہیں کیا ضرورت تھی جہاد کرنے کی؟ دراصل دشمن بوکھلا گیا ہے اور وہ اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ۲۲ سال تک شیخ عبداللہ نے محاذ رائے شماری کے تحت حکومت سے استصواب رائے کا مطالبہ کیا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اسے بھی بیروزگاری کا سامنا تھا ایسی بات نہیں۔

سوال.... کیا مسلح جدوجہد کے علاوہ بھی آپ نے تحریک کے کسی پہلو کو سامنے رکھا ہے؟

جواب.... ہم نے وہاں جو تحریک برپا کی ہے اسی کے بالکل ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی چلا رکھی ہے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم بھارت پر اپنی جدوجہد کے ذریعے اتنا دباؤ ڈالیں کہ وہ میز پر بیٹھ کر ہمارے ساتھ مذاکرات کے لیے مجبور ہو جائے اور ہمیں ہمارا حق مل جائے ہماری مسلح جدوجہد دراصل ہماری سیاسی تحریک ہی کا حصہ ہے۔

پاک بھارت جنگ کب ہوگی؟

گذشتہ چند سالوں سے عموماً ہر سال کے دسویں یا گیارہویں مہینے میں پاکستان اور بھارت کے عوام دونوں ممالک کے درمیان متوقع جنگ کی پیشین گوئیاں شروع کر دیتے ہیں۔ نجومی حضرات کی طرف سے خصوصاً اس مرحلے پر عجیب عجیب انکشافات سننے میں آتے ہیں اور جب سال کا آخری مہینہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور چند ماہ بعد پھر یہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن اس مرتبہ واقعی یوں لگتا ہے کہ شیر آیا شیر آیا والی بات کہیں حقیقت کا روپ نہ دھار لے اور اصلی شیر آ ہی نہ جائے۔ شاید یہی وہ دھڑکا ہے جس کی بنیاد پر استدلال کی عمارت استوار کی جا رہی ہے۔ اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بھارت پاکستان پر حملہ نہ کر دے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر بھارت پاکستان پر حملہ کیوں کرے گا؟ جب کہ بھارت میں جنتا دل کی حکومت ہے جس کے متعلق ہمارے سیاسی دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر پیشین گوئیاں کی تھیں کہ اس حکومت کا رویہ پاکستان کے ساتھ گذشتہ حکومت کے برعکس جنگجویانہ نہیں بلکہ صلح پسندانہ ہوگا۔ اس ضمن میں بھارت میں سابقہ جنتا دل کی حکومت جس کے سربراہ مسٹر مرارجی ڈیسائی تھے کی مثال بھی دی جاتی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچانک آخر مسٹر وی پی سنگھ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ نہ صرف پاکستان کو جنگ کی دھمکیاں دے رہے ہیں بلکہ بھارتی فوج نے بھی عملاً جنگ کی سی حالت اختیار کر لی ہے اور دنیا کے بہت سے مہذب ممالک نے بھی بھارت کو باور کروانا شروع کر دیا ہے کہ اگر اس نے کسی ایٹمی وغیرہ کا پروگرام بنا رکھا ہے تو اسے ختم کر دے کیوں کہ

س مرتبہ جنگ بھارت کے اندازے سے زیادہ بھارت اور پاکستان کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ خیال رہے ایسا مشورہ دینے والوں میں بھارت کا نزدیکی دوست روس بھی شامل ہے لیکن بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ بھارت کسی دوست کے مشورے پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔

بھارت کی طرف سے پاکستان پر دو بڑے الزامات عائد کیے جاتے ہیں پہلا الزام تو یہی کہ پاکستان سکھوں کی علیحدگی پسند تحریک خالصتان کی پشت پناہی کر رہا ہے ور سکھوں کو اسلحہ اور تربیت فراہم کر رہا ہے۔ دوسرا بڑا الزام جس کی آج کل بھارتی حلقوں کی طرف سے تکرار ہو رہی ہے وہ کشمیر میں موجودہ تحریک آزادی میں پاکستان کا ملوث ہونا ہے۔ بھارت کی طرف سے پاکستان پر یہ الزامات کوئی نئی بات نہیں لیکن اس مرتبہ جس شدت سے ان الزامات کی تکرار کی جا رہی ہے اور جو موڈ بھارتی حکمرانوں نے بنا رکھا ہے اس سے بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ بھارت اپنے داخلی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے جنگ کا خطرہ مول لے گا۔

ابھی تک گو کہ بھارتی فوج نے کوئی ریڈ الرٹ جاری نہیں کیا نہ ہی فوجیوں کی چھٹیاں منسوخ کی گئی ہیں نہ ہی ریٹائرڈ فوجیوں کو واپس بلایا گیا ہے اس کے باوجود پرسکون سمندر کی تہہ میں طوفان مچل رہے ہیں پاکستان اور بھارت کی فوجیں ذہنی طور پر ایک مکمل جنگ کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ دونوں طرف سرحدوں پر فوجوں کی نقل و حرکت بڑھ رہی ہے۔ چھاؤنیوں سے رات کی تاریکی میں فوجی کنوائے ان دیکھی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں، دراصل ابھی تک پاکستان اور بھارت دونوں میں سے کسی جی ایچ کیو نے اپنی لیڈر شپ کی طرف جنگ شروع کرنے کا کوئی واضح سگنل نہیں مل سکا۔ بھارتی فوج کے ایک سینئر جرنیل نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان حالات میں دونوں فوجیں دفاعی اقدامات پر توجہ دے رہی ہیں۔

بھارتی ذرائع اطلاعات کے مطابق پاکستانی افواج راجستھان پنجاب اور گجرات ضلع کے سامنے مورچہ بند ہو چکی ہیں۔ انہی سرحدوں پر بھارتی فوج بھی دفاعی پوزیشن

میں مل گئی ہے۔ بھارتی فوج کو اس مرتبہ ماضی کے مقابلے میں زیادہ سہولت حاصل ہے اور اسے اپنی فوجیں دور دراز سے لاکر ان سرحدوں پر نہیں رکھنی پڑ رہیں بلکہ بھارت نے اپنی چھاؤنیاں ہر سرحدی شہر میں قائم کر رکھی ہیں۔ مثلاً امرتسر، فیروزپور، پٹھان کوٹ اور فاضلکا کی حفاظت کے لیے فوجیں ان شہروں کی سرحد کے بالکل نزدیک چھاؤنیوں میں یا پھر دیگر حفاظتی اقدامات میں پہلے سے موجود ہیں۔

بھارتی ائیرفورس کو درپیش اہم خطرات

۱۔ اگر سعودی عرب نے دو "ہائی ہاک" (فضائی نگران طیارے) طیارے پاکستان کو مستعار دے دیئے۔

۲۔ اگر سعودی عرب نے ہاک میزائل کی ۶ بیٹریاں پاکستان کے حوالے کر دیں۔

ان حالات میں بھارتی ائیرفورس کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔

اخباری بیانات یا افواہوں کے برعکس ابھی تک دونوں میں سے کسی ملک نے اپنی سٹرائیک فورسز کو آگے نہیں بڑھایا۔ اگر کوئی خاص نقل و حرکت فوجی لحاظ سے ہو رہی ہے تو وہ صرف کشمیر سرحد پر دیکھنے میں آتی ہے۔ پاکستانی فضائیہ نے اس علاقے میں اپنی معمول کی نگران پروازیں بڑھا دی ہیں۔ ادھر مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج نے دو محاذوں پر تیاری شروع کی ہے ایک تو پاکستان کی طرف سے حملے کی پیش بندی اور "حیران کن کارروائی" کی پلاننگ اور دوسری طرف پاکستان کی طرف سے (بھارت کے کہنے کے مطابق) داخل ہونے والے حریت پسندوں کی روک تھام کا بندوبست کیا ہے۔

بھارتی افواج کو ایمونیشن ذخیرہ کرنے اور فوجی گاڑیوں کے فاضل پرزہ جات جمع رکھنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔ بھارتی فوج کی ورکشاپوں میں اوقات کار بڑھا دیئے گئے ہیں اور وہاں دن رات قابل استعمال گاڑیوں کی مرمت کا سلسلہ زور شور

ے جاری ہے۔ ائیرفورس اور نیوی نے بھی اپنی سرگرمیاں بڑھا دی ہیں۔ بھارتی ائیرفورس الیکٹرونک وارفیئر" کی خصوصی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ائیرفورس کو ایک بڑا خطرہ یہ بھی لاحق ہے کہ اگر اسلامی دنیا نے پاکستان کی مدد کا ارادہ کر لیا تو پاکستان کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ اگر سعودی عرب نے اپنے دو "ہائی ہاک" نگران طیارے پاکستان کو مستعار دے دیئے یا ایف ... ۵ کے تین سکواڈرن یا ہاک میزائل کی چھ بیٹریاں پاکستان منتقل کر دیں تو بھارتی ائیرفورس کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔

بھارتی اعلیٰ فوجی قیادت کو جس بڑے خطرے کا سامنا ہے وہ یہ کہ بھارتی فوج نی سیاسی قیادت سے کسی بھی ہدایت کے بغیر روبہ عمل ہے یہ صورتحال بھارت میں نی بھی وقت سیاسی مشکلات پیدا کر سکتی ہے اس کے برعکس بھارتی فوجی قیادت کے خیال میں پاکستانی فوج کو کوئی ایسی مشکل کا سامنا نہیں ہے کیونکہ پاکستانی فوج اپنے انی کی روشنی میں اہم فیصلوں کے لیے سیاسی قیادت کی اتنی محتاج نہیں رہی۔ فوجی مبصرین کا خیال ہے کہ بھارتی فوجی قیادت صرف اخباری رپورٹروں یا پھر انٹیلی جنس رپورٹوں کی بنیاد پر ہی تیاریاں کر رہی ہے ابھی تک ان کی سیاسی قیادت نے انہیں کوئی خاص گنل نہیں دیا۔

جہاں تک بھارتی وزیراعظم مسٹر وی پی سنگھ کے حالیہ بیانات کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حیثیت بیان برائے بیان سے زیادہ کچھ نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ بھارت کی فوجی قیادت پاکستان کے ساتھ ماضی میں لڑائیوں کا طویل تجربہ رکھنے کی بنا پر ان بیانات کا نوٹس لیتی ہے اور بھارتی فوج کی تیاریوں کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ فوج اگرچہ ابھی تک جنگ کی واضح ہدایات نہیں ہیں لیکن اپنے طور پر وہ "حالت جنگ" میں آ چکی ہیں۔

مبصرین کے اندازوں کے مطابق اگر پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ جاتی ہے تو امریکہ اس میں کوئی خاص رول ادا نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ امریکی ٹو جیسی یورپ میں بہت کامیاب ہے اور یورپ پر اس کی گرفت مضبوط ہے دوسری

طرف اسلامی دنیا سے بھی اس کے تعلقات جتنے اچھے آج ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں رہے ان حالات میں امریکہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ جنوبی ایشیا میں ایک نیا "دردِ سر" مول لیتا پھرے۔ اس خطے میں اب اسے روسی کمیونزم کی طرف سے بھی کوئی ایسا خطرہ لاحق نہیں رہا۔ افغانستان کی جنگ سے وہ ممکنہ مفادات حاصل کر چکا ہے اور امریکی پالیسی اب یہ بن گئی ہے کہ افغانستان میں روس سے تعاون کر کے کسی بھی اسلامی حکومت کے قیام کو عمل میں آنے سے روک دے۔

امریکہ کی یہ پالیسی بہت کامیاب ہے اور اب تک نجیب کی حکومت کا افغانستان میں قائم رہنا روس کی آشیرباد سے زیادہ امریکہ کی مجاہدین سے بے اعتنائی کا شاخسانہ ہے۔ یہ خدشات بہت عرصے سے ظاہر کیے جا رہے ہیں کہ امریکہ اور روس دونوں ایک سطح پر اس بات پر بھی متفق ہو چکے ہیں کہ وہ ظاہر شاہ کے لیے راستہ ہموار ہونے تک کم از کم نجیب اللہ کی حکومت کو ہی برسرِ اقتدار رہنے دیں۔ اس صورتحال سے نتیجہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابھی امریکہ برصغیر میں کسی تازہ ایڈونچر کے موڈ میں نہیں ہے۔

جہاں تک روس کا تعلق ہے وہ اپنے گھریلو مسائل میں اس بری طرح الجھا ہوا ہے کہ ابھی کم از کم بھارت اور پاکستان کی ممکنہ جنگ میں کوئی رول ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ ایک کے بعد دوسری ریاست کی طرف سے آزادی کا مطالبہ ہو رہا ہے اور خود کمیونسٹ اقتدار کو روس میں خطرات لاحق ہیں۔ یکم مئی کی پریڈ کے بعد کوئی بھی ذی شعور بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ روس کے لیے اپنے گھریلو مسائل بیرونی مداخلت سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ روس انڈیا کی حمایت جاری رکھے گا لیکن ماضی کے برعکس اس کی انتہائی کوشش ہوگی کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ ٹلتی رہے کیونکہ اس صورت میں روس پر اتنا دباؤ بڑھ جائے گا کہ اسے کھل کر کسی ایک فریق کی حمایت کا اعلان کرنا پڑے گا جس کا فی الوقت وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ روس یہ نہیں چاہے گا کہ بھارت روس دوستی کسی کڑے امتحان سے گزرے۔

چین کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے غیر ملکی مبصرین کہتے ہیں کہ سنکیانگ میں احیائے اسلام کی تحریک نے چین کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ تبت میں حالات پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ اسلامی دنیا سنکیانگ میں احیائے اسلام کی تحریک پر توجہ دے چین کی یہ خواہش ہوگی کہ "جہاد" کا سارا زور کشمیر کی طرف منتقل ہو جائے۔

اسلامی بلاک کے متعلق بھارتی اور غیر ملکی مبصرین کی دو ٹوک رائے یہ ہے کہ اگر پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ جائے تو اسلامی بلاک انتہائی محتاط انداز سے کے مطابق دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ ایک حصہ تو وہ ہوگا جو عملاً پاکستان کی مدد کرے گا اور کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر پاکستان کا ساتھ دے گا اور ان ممالک کی تعداد بہت زیادہ ہوگی۔

دوسرے بلاک میں شاید ہی کوئی ایسا ملک شامل ہو جو اس جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ گویا کسی بلاک کی مدد بھارت کو حاصل نہیں ہوگی۔ کچھ ماہرین اس بلاک کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی اسلامی مملکت کے ساتھ بھارت کو دوستی کا دعویٰ بھی ہے تو وہ برادر اسلامی ممالک کے دباؤ کے تحت ایسا نہیں کرے گا اور عملاً نہیں تو زبانی ہی سے پاکستان کی حمایت کرنا پڑے گی۔

ان حالات سے بظاہر تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کی صورت میں پاکستان کی اخلاقی اور بین الاقوامی پوزیشن بھی خاصی مضبوط ہے۔ اس کے باوجود آخر پاکستان بھارت پر حملہ کیوں نہیں کر دیتا؟ یہی ہے وہ سوال جو بھارتی حلقوں کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ جب کہ پاکستان کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس معاملہ کا کوئی پرامن حل تلاش کیا جائے اور اس مقصد کے لیے پاکستانی وزیر اعظم ہنگامی غیر ملکی دورے پر بھی نکلی ہوئی ہیں۔ ماہرین سیاسیات اس امر پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کشمیر کے مسئلے پر دوعملی کا شکار کیوں ہے پاکستانی وزیر اعظم نے اپنے حالیہ دورے میں بھی دنیا کو یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ

بھارت پاکستان سے جنگ کرنا چاہتا ہے جب کہ ہم ایسا نہیں چاہتے۔ اس کے برعکس اگر پاکستان اپنی سفارتی جدوجہد کا رُخ موڑتے ہوئے بیرونی دنیا خصوصاً عالم اسلام کو اس مسئلے کی سنگینی کا احساس دلا کر بھارت پر اخلاقی دباؤ ڈلوائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان نے ایک مثبت خارجہ پالیسی اختیار کی ہے۔ محض اپنی صفائی پیش کرتے رہنا مسائل کا حل کیسے ہو سکتا ہے۔

ہماری ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ بھارت نے جب بھی پاکستان پر جارحیت کا ارادہ کیا۔ اس نے عالمی سطح پر پاکستان پر جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کی بوچھاڑ کر دی اور ہم الزامات کے جوابات میں اپنی صفائیاں پیش کرنے میں اتنے مصروف ہو گئے کہ اصل مسائل سے ہماری توجہ ہٹ گئی۔ اب بھی بھارت نے یہی پالیسی اختیار کی ہے اور کبھی پاکستان پر سکھوں کی حمایت کا الزام لگاتا ہے تو کبھی کشمیریوں کو مسلح کرنے کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ ان اقدامات کا مقصد یہی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ایک مرتبہ پھر پاکستان کو اپنی صفائی دینے میں الجھائے رکھے اس طرح پاکستان پر خواہ مخواہ سے ایک دباؤ ڈال کر اسے یہ بھی باور کروایا جا رہا ہے کہ وہ یہ مسئلہ کسی بین الاقوامی فورم میں نہ لے کر جائے۔

دیکھا جائے تو بھارت کی یہی پالیسی ہمیشہ کی طرح بہت کامیاب ہے۔ پاکستان کی سطح پر کشمیر کی حمایت کے لیے بیانات، جلسے، جلوسوں کا سلسلہ ایک دوسرے پر سیاسی دباؤ کے لیے تو ممکن ہے کوئی اہمیت رکھتا ہو لیکن بین الاقوامی سطح پر اس کو تب تک پذیرائی نہیں مل سکتی جب تک ہم دنیا کو یہ باور کروانے کی کوشش نہ کریں کہ بھارت نے دنیا کو دھوکے میں رکھا اور بین الاقوامی سطح پر ایک معاہدے کا اقرار کر کے اس سے منحرف بھی ہو گیا۔ کشمیر میں استصواب رائے کی ضمانت دنیا بھر کے ممالک کی نمائندہ تنظیم نے دی تھی لیکن بھارت اب بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس معاہدے کی اہمیت ہی سے منحرف ہے اور بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ وہ تو وقتی بات تھی جس کی اب ضرورت نہیں رہی۔

ہم بین الاقوامی دنیا کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بھارت آج ہونے والے چالیس سال پرانے دوسرے معاہدوں کے ساتھ دنیا کے دیگر ممالک نے بھی یہی سلوک کر دیا

تو دنیا میں امن کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ آج اگر بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ایک معاہدے سے بھارت انحراف کر رہا ہے تو کل دنیا کے دوسرے ممالک بھی یہی طرزِ عمل اختیار کریں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب مصلحت کوشی کو نظر انداز کر کے پاکستان دو ٹوک پالیسی اختیار کرے۔

بھارتی دانشوروں کے خیال میں

ان وجوہات کی بنا پر پاکستان پر حملہ نہیں کرنا چاہیئے

کوئی بھی ذی شعور جو جنوبی ایشیاء کی گذشتہ ۲۰ سالہ جنگی تاریخ پر نظر رکھتا ہو اگر اس سے یہ کہا جائے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ ہونی چاہیئے یا نہیں تو اس کا جواب نہیں میں ہوگا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان میں موجود تخریب کاروں کے تربیتی کیمپوں پر حملہ کرکے ہم اپنے مقاصد حاصل کرلیں گے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ ایسے کسی بھی اقدام کا مطلب ہوگا کھلی جنگ۔ جیسے ہی ہم پاکستان کی سرحدوں کے اندر تعاقب کرکے تخریب کاروں پر ضرب لگانے کی کوشش کریں گے پاکستان بھارت پر جوابی حملہ کردے گا۔

بھارتی عوام پوچھتے ہیں کہ پھر اس مسئلے کا آخر حل کیا ہے؟ کیوں نہ ہم ایک مرتبہ کے لیے اس جھگڑے کو ختم کردیں لیکن یہ سوچ صحیح نہیں۔ بھارتی عوام کو جان لینا چاہیئے کہ یہ ۱۹۷۱ء کی جنگ نہیں ہے۔ پانچ ایسی یقینی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بھارت کو پاکستان کے خلاف جنگ سے بہرصورت پہلو بچانا ہے۔

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارتی فوجی قوت پاکستان سے بہت زیادہ اور مضبوط ہے لیکن یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ فوجی قوت منتشر ہے۔ اس مرتبہ بھارت کو چین کو کھڑے ہونے کا موقعہ نہیں دینا چاہیئے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ بھارت کے ۲۵ ڈویژنوں میں سے کم از کم ۷ ڈویژن لازماً شمالی سرحد پر مورچہ بند ہونے چاہئیں۔ ۵ تا ۶ ڈویژن لازماً پنجاب اور پٹھان کوٹ جموں کے حساس ترین بارڈر پر صورتحال کو سنبھالے رکھنے کے لیے درکار ہوں گے۔ اس کے بعد جو فوج باقی بچے گی اس سے بھارت کو باقاعدہ جنگ لڑنی ہے۔

اس کے برعکس اگر بھارت حملہ کرتا ہے تو اسے اپنی افواج کو ڈیفنس سے نکال کر حملے کی صورت میں لانے کے لیے نفری بڑھانے کی ضرورت ہوگی۔ یہ تب ہی ممکن ہے اگر وہ چین کی طرف سے ممکنہ مداخلت اور پنجاب میں سکھوں کی ممکنہ مدافعت اور بھارتی ٹروپس پر حملوں کے خطرے سے بالکل بے نیاز ہو جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ نیم فوجی دستے اس صورتحال کو کنٹرول کرلیں گے اور آرمی کے رسل و رسائل کے راستے محفوظ رہیں گے۔ ایسا ظاہر ہے ممکن نہیں کیونکہ بھارتی فوج اپنی جسامت کے لحاظ سے دو محاذوں پر لڑ سکتی ہے۔ تین پر نہیں۔

بھارتی فوج کی جنگی حکمت عملی کی بنیاد طویل لڑائی پر استوار ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جنگ طول پکڑے گی اس حساب سے جنگی حکمت عملی کے بنیادی اصول طے کئے گئے ہیں لیکن ایسا عموماً ہوتا نہیں۔ بھارت کی سیاسی لیڈرشپ اتنی استعداد نہیں رکھتی کہ عالمی دباؤ کا سامنا زیادہ دیر تک کر سکے اور وہ جنگ کا جلد از جلد خاتمہ چاہتی ہے۔ فوج میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ ۴۸ء، ۶۵ء، ۷۱ء اور ۸۴ء کی طرح (بھارتی فوج کے خیال میں) اگر وہ جیت بھی رہے ہوں تو بھی حکومت جنگ بند کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اگر انہیں ۶۲ء کی طرح چین یا ۸۹ء کی طرح سری لنکا میں مار بھی کھانی پڑے تب بھی صورت حال یہی ہوتی ہے اور بھارتی فوج حکومتی پشت پناہی سے محروم رہتی ہے۔ اس لیے جنگ سے بچنا ہی بہتر لائحہ عمل ہے۔ اس مرتبہ ۶۵ء اور ۷۱ء کی طرح نہ تو پاکستان کو امریکہ کی اخلاقی مدد حاصل ہوگی نہ ہی بھارت کو روس کی مادی مدد مل سکے گی۔ اس کے برعکس ساری مسلم دنیا پاکستان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی۔

۲۔ بھارت ۹۰ء میں اپنی سالمیت کو زخم خوردہ کر دینے والی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۷۱ء میں بھارت کو ۱۴ روزہ جنگ کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپے کا خرچ برداشت کرنا پڑا۔ ۱۹۹۰ء میں فوج ۷۱ء سے دوگنا ہو چکی ہے۔ سامان حرب و ضرب کا خرچ ۱۰ گنا بڑھ چکا ہے اور جنگ اگر چھڑ جاتی ہے تو ۷۱ء سے ۴ گنا زیادہ طویل ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھارت کو اس مرتبہ جنگ پر ۲۰۰۰ کروڑ روپے خرچ کرنا ہوں گے

جو بھارت کے موجودہ کل فوجی بجٹ سے بھی دوگنا ہیں جبکہ ۱۹۷۱ء میں کل فوجی بجٹ کا ۲/۱ حصہ خرچ آیا تھا۔ اس کے باوجود اگر اتنی رقم خرچ کر کے پاکستان کے ساتھ مستقبل میں جنگ کا خطرہ ختم ہو سکتا ہے تو بھی یہ مہنگا سودا نہیں لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ۲۰۰۱ء ۲۰۱۱ء اور پھر ۲۰۲۱ء میں بھی بھارتی عوام کو ایک مرتبہ پھر ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا اور پھر ایک نئی جنگ کی تیاری ہو رہی ہو گی۔

۴۔ یہاں بھارتی دانشور بھارتی فوج کے سابق کمانڈر انچیف جنرل سندرجی کی کہی ہوئی بات کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ مرنے والے چند جوان اور افسر ہوتے ہیں۔ جو دراصل کسی بھی فوج کی پہچان بن جاتے ہیں۔ یہاں روسی ریکھی جنرل سندرجی کو مخاطب کر کے کہتا ہے جناب آپ کا کہنا بجا لیکن ہم آج وہاں نہیں کھڑے جہاں ۱۹۴۷ء میں فرانس کھڑا تھا لیکن ہم اس پوزیشن کے نزدیک ضرور ہو رہے ہیں۔ زیادہ عرصے تک کوئی بھی فوج آنکھیں بند کر کے اپنے افسران بالا کے حکم پر قربانی کے بکرے نہیں بنا کرتی۔ ۱۲ کماؤں اور فسٹ سکھ یا پھر انڈین نیوی جس نے کراچی کو ۱۹۷۱ء میں بے بس کر دیا تھا کی کہانیاں اب پرانی ہو چکی ہیں۔ آج صورتحال بہت مختلف ہے۔

۵۔ جنگ کے آغاز کا فیصلہ بڑی جرأت مندانہ اخلاقی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ بھارت کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں لڑنے والے کہا جا سکتا ہے جنگ کے بعد عوام کو سوائے ٹیکسوں کی زیادتی کے اور کچھ نہیں ملا کرتا۔ جنگ کرنے کے غیر اخلاقی فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ دراصل ہم اپنی اندرونی شورش پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں اور اب اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت پاکستان پر پنجاب اور کشمیر میں گڑبڑ کروانے کے الزامات لگاتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر راجستھان اور گجرات کی سرحدیں بھی تو پاکستان سے ملتی ہیں کیا وہاں پاکستان بغاوت کے بیج نہیں بو سکتا۔ ٹھیک ہے فوجی ریاست کا خادم ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسے خواہ مخواہ مر جانے پر مجبور کیا جائے۔ محض اس لیے کہ وہ ریاست سے ماہوار تنخواہ لیتا ہے۔ یہ فوج کا دردِ سر نہیں جن مسائل سے آج بھارت دوچار ہے وہ حکمرانوں اور سیاستدانوں کے پیدا کردہ مسائل ہیں اور ان کا حل بھی انہی کو سوچنا ہو گا۔